ننھے چشمہ کا سفر

(فارسی افسانوں کا اردو ترجمہ)

مترجم

پروفیسر سیّدہ بلقیس فاطمہ حسینی

ناشر: اسلامی گھر، دہلی وتوسعۂ کتاب ایران

فریدون عموزادہ خلیلی: ان کے الفاظ میں حقیقتوں کا ایک جہان ملتا ہے۔ انقلاب اسلامی کے چشم دید اس راز سے آشنا ہیں کہ یہ جملے خیالی نہیں ہیں بلکہ واقعیت کے ترجمان ہیں۔ اس وقت روحانیت کی جلوہ گری کچھ ایسی ہی تھی۔

فریدون عموزادہ خلیلی انقلاب اسلامی کے بعد کے مصنفین کے درمیان محتاج تعارف نہیں ہیں، لیکن اردو ادب کی دنیا میں ایک نیا چہرہ ضرور ہے۔

خلیلی ۱۳۳۸ ہجری شمسی/۱۹۵۹ یا ۱۹۶۰ عیسوی میں سمنان میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی اور سکنڈری تعلیم اپنے ہی قصبہ میں حاصل کی اس کے بعد تہران آ گئے۔ اصلاً یہ ریاضی اور فزیکس کے طالب علم تھے لیکن ایرانیوں کی ایک بہت بڑی صفت یہ ہے سائنس والوں کو ادبیات سے بیر نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادب و سائنس دونوں علم شانہ بشانہ پروان چڑھ رہے ہیں۔

عموزادہ خلیلی کو کم عمری سے لکھنے پڑھنے کا شوق ہوگیا تھا اور ان کی پہلی رومانی داستان ۲۳ سال کی عمر میں سن ۱۳۶۰ھ ش/۱۹۸۱ عیسویں میں شائع ہوئی اور اب تک ان کی ۲۰ سے زائد کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں اور انھیں انکی پانچ کتابوں کے لیے جائزہ بھی حاصل ہوا ہے۔

Z

ننّھے چشمہ کا سفر

﴿سفر چشمۂ کوچک﴾

تصنیف

فریدون عموزادہ خلیلی

مترجمین

سیّدہ بلقیس فاطمہ حسینی و سیّد سجّاد مہدی حسینی

ننّھے چشمہ کا سفر

(فارسی افسانوں کا اردو ترجمہ)

نام کتاب : [illegible]

تصنیف : فریدون عموزادہ خلیلی

مترجمین : سیّدہ بلقیس فاطمہ حسینی و سیّد سجاد مہدی حسینی

ناشر : اسلامی کتاب گھر، دہلی و تکاتوسعۂ کتاب ایران

زیر نظر : مرکز تحقیقات فارسی رایزنی فرہنگی جمہوری اسلامی ایران، نئی دہلی

سن اشاعت : ۱۴۳۱ھ/۱۳۸۸ھ ش/۲۰۱۰ عیسوی

کمپوزنگ : راحت آفسیٹ پرنٹر، 11، شاہی مسجد، رشید مارکیٹ، دہلی

موبائل: 9313007853

صفحہ آرائی : عبدالرحمٰن قریشی

ٹائٹل : حارث منصور

مطبع : الفا آرٹ، نوئیڈا (یو.پی.)

فہرست

- گفتنی ۷
- ننھے چشمہ کا سفر ۱۳
- مسافر ۳۷
- اس رات بی بی ہماری مہمان تھیں ۵۹
- آقا جان کی سائیکل ۷۸
- شہر سلیمان کا سفر ۱۰۵
- شناخت نامہ کے بغیر ۱۱۷
- دو کچے خربے ۱۶۱
- صنوبر کے اُس پار ۱۷۹
- میرے بابا اور سنیما کے شعبدے ۲۲۷

گفتنی

"ہر ایم جلوہ ای دیگر داشت، ہمہ چیز انگار خدایی بود، ہمہ چیز عارفانہ بود و الٰہی" (پرستوہا)

"ہر چیز میرے لیے نئے انداز سے رونما ہو رہی تھے، الٰہی اور عارفانہ، گویا سبھی میں خدا جلوہ گر تھا"۔ (ابابیلیں)

فریدون عموزادہ خلیلی کے ان الفاظ میں حقیقتوں کا ایک جہان ملتا ہے۔ انقلاب اسلامی کے چشم دید اس راز سے آشنا ہیں کہ یہ جملے خیالی نہیں ہیں بلکہ واقعیت کے ترجمان ہیں۔ اس وقت روحانیت کی جلوہ گری کچھ ایسی ہی تھی۔

فریدون عموزادہ خلیلی انقلاب اسلامی کے بعد کے مصنفین کے درمیان محتاج تعارف نہیں ہیں، لیکن اردو ادب کی دنیا میں ایک نیا چہرہ ضرور ہے۔

خلیلی ۱۳۳۸ ہجری شمسی/۱۹۵۹ یا ۱۹۶۰ عیسوی میں سمنان میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی اور سکنڈری تعلیم اپنے ہی قصبہ میں حاصل کی اس کے بعد تہران آ گئے۔ اصلاً یہ ریاضی اور فزیکس کے طالب علم تھے لیکن ایرانیوں کی ایک بہت بڑی صفت یہ ہے سائنس والوں کو ادبیات سے بیر نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادب و سائنس دونوں علم شانہ بشانہ پروان چڑھ رہے ہیں۔

تہران میں قیام کے دوران انہوں نے تألیف و تصنیف کا کام شروع کیا۔ ان کی پہلی تصنیف ۱۳۶۰ھ ش/۱۹۸۱ عیسوی شائع ہوئی۔ ۱۳۶۲ سے ۱۳۶۶ ھ ش/۱۹۸۳ تا ۱۹۸۷ عیسوی کے دوران انہوں نے مختلف ذمہ داریاں نبھائیں۔ شورای ادبیات کے سیکریٹری رہے، بچوں اور نوجوانوں سے متعلق قصہ نویسی کے سیکشن کے ذمہ دار رہے اور ساتھ ہی ساتھ 'جنگ سورہ بچہ ہای مسجد' کی ذمہ داری سنبھالی۔ یہ سب وزارت تبلیغات اسلامی کے تحت ادارے ہیں۔ یہ ۱۳۶۵ھ ش/۱۹۸۶ عیسوی میں 'ہنر و ادب کودک و نوجوان' کے بنیا در کھنے والوں کی شورای عظمی کے ممبر بھی تھے۔

عموزادہ خلیلی نے ۱۹۶۷ھ ش/۱۹۸۸ عیسوی میں ماہنامہ سروش نوجوان کو جاری کرنے والوں میں شامل رہے۔ یہ دس سال تک اس رسالہ کی مینجنگ کمیٹی کے ممبر تھے اور ایران کی مطبوعات کی تاریخ میں آفتاب گردان کا اجراء عموزادہ خلیلی کے قابل فخر کارناموں میں شمار ہوتا ہے۔

انقلاب اسلامی نے ایران میں ایک فکری اور تہذیبی انقلاب برپا کیا۔ داستان نویسی ایران میں تاریخی نقطۂ نظر سے کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ بہترین کہانیاں، داستانیں اور مختصر کہانیاں بھی کلاسیکی ادب میں موجود تھیں، لیکن عہد مشروطہ یعنی بیسویں صدی کا ادب، یورپ کے ادب سے متأثر تھا، موجودہ چارچوب اور تکنیک سب انہیں کے مرہون منت ہیں، جس میں اسلامی، غیر اسلامی اور قومی افکار پر قلم فرسائی ہو رہی تھی۔ جمالزادہ، بزرگ علوی، جلال آل احمد، صادق ہدایت، صادق چوبک، کوہر مراد وغیرہ نیز دیگر نامور ادیب و فنکار ادب کی خدمت میں مشغول تھے مگر انقلاب نے فکر میں بھی ایک نیا تلاطم برپا کر دیا اور فکر، اسلامی فلسفہ کی طرف گامزن ہوگئی۔ حکومت نے بھی ایسے مصنفین کی سرپرستی کی اور ایک کثیر تعداد میں افسانہ نگار، ناقدین اور محققین کی جماعت سامنے آ گئی۔

فریدون عموزادہ خلیلی انہیں میں سے ایک ہیں۔جنھوں نے مختلف عمر کے لوگوں کے لیے کہانیاں لکھی ہیں۔ان کی کہانیوں کے موضوعات مختلف اور سماج کے ہر طبقہ کی نمایندگی کرتے ہیں۔اب تک ان کی بیس سے زائد کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ تکنیکی نشیب وفراز سے گذرتے ہوئے حق گوئی اور واقعیت کو خیال انگیزی کے لطیف پردہ میں چھپا کر اس طرح پیش کیا ہے کہ داستان گوئی کے ہنر پر بار نہیں ہے۔کبھی کبھی تو ایسا لگتا ہے کہ ان کی تحریر معاشرہ اور حکومت کے لیے انتباہ ہے۔اس مجموعہ میں نو داستانیں ہیں۔ان میں سے زیادہ تر انعام یافتہ ہیں۔

'چشمۂ کوچک' جغرافیائی نطقۂ نظر سے اہم ہے۔کائنات کی تخلیق، خالق کا وجود، ہادی کی ضرورت ایسے مسائل کو خیال بافی کے پیکر میں کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ مصنف کے تحت الشعور میں ضرور اس پیغام ربانی کی کارفرمائی ہے کہ ''ہم نے کسی چیز کو عبث نہیں پیدا کیا''۔

فریدون کے یہاں ایرانی نوجوانوں کے لیے ایک تڑپ ملتی ہے۔اس کے تحت وہ اپنی کہانیوں میں کردار کی زبان سے ایسے حقائق بیان کرتے ہیں جو ملک و ملت کی تعمیر میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔ان کا اسلوب کبھی کبھی ایسا دلفریب ہوتا ہے کہ غیر ارادی طور پر اسلامی فکر قاری کے دل پر اپنا نقش چھوڑ دیتی ہے اور بعض اوقات ان کا یہ پیام مقصدیت کو ظاہر کر دیتا ہے۔

دوسرا افسانہ بہ عنوانِ ''مسافر'' ایک غریب لکڑہارے کی کہانی ہے، برف سے ڈھکا ہوا دشت، تنہا چنار کا ایک درخت، لکڑی کی تلاش، زخمی بگلا، مسافر کی نمایندگی، احساسات کا تلاطم، دوراندیشی، توکّل اور دوسروں کی مدد کا جذبہ، یہ وہ داستانی عناصر ہیں، جن کی بنیاد پر خیال انگیزی کا یہ قلعہ تعمیر ہوا ہے جس میں ضروریات زندگی کے ساتھ ساتھ جمالیات کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔

''اس رات بی بی ہماری ہماری مہمان تھیں'' عراقی تشدد، جنگ کے بحرانی مسائل اور عوامی زندگی کی پریشانیوں پر مبنی ہے۔ایک نوخیز لڑکے کے احساسات، شخصی زندگی میں اظہار محبت کی اہمیت اور اس کے نتائج، یہی اس داستان کا ماحصل ہے جسے مصنف نے چابکدستی سے پیش کیا ہے۔'بابا جان کی سائیکل' ایک مفلس اور نچلے طبقہ کے بچّے کی کہانی ہے جس کی آرزوؤں کا ہر لمحہ گلا گھٹتا رہتا ہے۔

''سفر بہ شہر سلیمان'' (شہر سلیمان کا سفر) میں قالین بافی اور مزدور بچوں جیسے اہم بین المللی مسائل، سرمایہ داری، تشدد، دردِ یتیمی اور بلائے بے درمان پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ایسا لگتا ہے جیسے عموزادہ خلیلی کے سینہ میں لاکھوں بے سہارا یتیم بچّوں اور بوڑھوں کا درد سمٹ گیا ہوا۔

''دو کچے خرمے'' ترقّی کی اس دور میں جب دنیا گلوبلائیزیشن کی باتیں کر رہی ہو اور کائنات سمٹ کر ایک نقطہ میں تبدیل ہو چکی ہو بلوچی معاشرہ کی زبوں حالی، افکار کی پستی، بچوں کی خرید و فروخت اس ترقی یافتہ دور پر قوی طنز ہے۔''شناخت نامے کے بغیر'' ایک انسانیت سوز داستان ہے۔کتنا درد ہے خلیلی کی حقیقت نگاری میں سماج کا وہ طبقہ جس کے پاس نہ رہنے کو جھونپڑا نہ کھانے کو غذا، نہ بستی میں مدرسہ، نہ اسپتال، نہ قبرستان فقط جہل کا طغیان، ایسے میں ستم ظریفی کہ ان سے شناختی کارڈ کا تقاضا کیا جائے۔انتظامیہ اور صاحبان حل وعقد کی بصیرت کے لیے فکر انگیز لمحہ ہے اور اگر ایسے محرومین کے سینہ میں تعلیم کی چنگاری روشن ہو جائے اور دفعتہً انہیں مرقد کی ضرورت آن پڑے تو ان کی بے بسی کا عالم کیا ہوگا اس کا صحیح مرقع اس کہانی میں نظر آئے گا۔ خلیلی کی دوررس نگاہیں وہ سب دیکھ لیتی ہیں جسے صاحبان دول محسوس ہی نہیں کرتے۔

''صنوبر کے اس پار'' اسکیموئی زندگی، ان کے مسائل رسم و رواج، افکار اور جغرافیائی موقعیت پر سیر حاصل روشنی ڈالتی ہے۔دبے دبے احساس، جوانی کا غرور،

شکار کی لذت، محبت کی خوشبو، خذبات کے طوفان، برف باری، ظلمت، نارنجی شعلہ اور روشنی کو نئے زاویہ سے پیش کیا ہے نیز بری رسموں کے انسداد کی طرف بھی متوجہ کیا ہے۔

''میرے بابا اور سنیما کے شعبدے'' مزاحیہ فیچر ہے۔ قاری کی تفریح کا اچھا سامان مہیا کیا ہے۔ اس کہانی سے یہ صاف ظاہر ہے کہ مصنف کی نگاہ صرف قنوطی مسائل پر ہی مرکوز نہیں ہے بلکہ سماج کے ہر پہلو پر ان کی نظر ہے اور وہ ایک زندہ دل انسان ہیں۔ ان کی کہانیاں اگر چہ طویل ہیں لیکن ادبی نقطۂ نظر سے غنی ہیں۔

ترجمہ ایک مشکل امر ہے۔ امانتداری کا سودا ہے۔ بہ طریق احسن موضوع و معانی کی ادائیگی اور زبان کے نازک پل صراط سے بادصرصر کی طرح گذر جانے کے لیے مشاق قلم کی ضرورت ہوتی ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ ہم لوگ اس کاوش میں کس حد تک کامیاب ہیں۔ انتقال معانی کے لیے کہیں کہیں لفظی ترجمہ سے ہٹ کر تلخیص پر عمل پیرا ہوئے ہیں اور کہیں کہیں معمولی چیزوں میں تبدیلی بھی کرنی پڑی ہے، جیسے کہ بی بی کی مہمانی کے دوران واقعہ، سحر سے قبل شب میں رونما ہوتا ہے۔ مصنف نے اسے صبح تحریر کیا ہے، مگر ترجمہ میں اسے رات لکھا گیا ہے۔

وہ فارسی جو کبھی ہندوستان کی زبان تھی، گلی کوچہ میں جس کے نغمہ گونج رہے تھے، ماؤں کی نصیحتوں میں گلستان کے اشعار اور محاورے شامل تھے، خاص و عام سبھی کی زبان پر حافظ و خسرو کی غزلیں تھیں مگر افسوس بقول غالب:

سب کہاں کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہوگئیں

اب صرف قصۂ پارینہ اور وراثت کا حصّہ ہیں، ایسے میں ترجمہ، افکار و معانی کی ترجمانی کے لیے ایک مثبت قدم ہے۔ خانۂ فرہنگ جمہوری اسلامی کے فعّال اور ذمہ دار مدیر و مشاور نے اس ضمن میں اپنی کوششوں سے بہترین مواقع فراہم کیے ہیں۔ مختلف کتابوں، داستانیں اور اشعار کے تراجم معرض ظہور میں آئے۔

حق ناشناسی ہوگی اگر میں ڈاکٹر محسن پرویز صاحب معاون فرہنگی وزارت ارشاد جمہوری اسلامی ایران و جناب ڈاکٹر کریم نجفی صاحب خانۂ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران نئی دہلی کے کاؤنسلر اور ڈاکٹر جناب علی رضا قزوہ صاحب مدیر مرکز تحقیقات فارسی کا شکریہ ادا نہ کروں۔ یہ ان کی سعی بلیغ کا نتیجہ ہے کہ فارسی عصری ادب کے مختلف ترجمہ ظہور پذیر ہو رہے ہیں۔ ہم دونوں مترجمین صمیم قلب سے ان کی ان خدمات کے شکرگزار ہیں اور انہیں مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

سیّدہ بلقیس فاطمہ حسینی
پروفیسر شعبۂ فارسی
دہلی یونیورسٹی، دہلی

ننّھے چشمہ کا سفر

ایک پہاڑ کی وادی جہاں نہ پانی تھا نہ آبادی، نہ درخت تھے نہ سبزے، نہ گل نہ گیاہ، خدا نے ایک ننّھا سا چشمہ پیدا کیا، زمین کے تاریک دل اور سخت پتھروں کے بیچ سے چھوٹے چشمہ کو باہر نکالا تا کہ پہاڑوں کے درمیان زندگی کا آغاز ہو۔

خدا ہی جانے کہ یہ چھوٹا سا چشمہ کب وجود میں آیا۔ لوگوں کو بس اتنا ہی معلوم تھا کہ پہاڑ کے سینہ سے خاموش اور بے صدا انھیں پتھروں کے نیچے وہیں کہیں چھپا ہوا تھا۔ چشمہ کو خود پتہ نہیں تھا کہ اسے کہاں جانا ہے، وہ تو بس وہیں ٹھہرا رہا اور اب تو اس نے اس کی عادت سی ڈال لی تھی۔

برسوں سے اسے کسی اور جگہ کی بھی خبر نہ تھی۔ سب کہتے تھے کہ یہ بے کار اور بے فیض چشمہ ہے۔ چشمہ کے پانی میں بدبو آ گئی تھی۔ کیچڑ نے چشمہ کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا اور اس کیچڑ میں کیڑے مکوڑے چشمہ کے چاروں طرف کلبلا رہے تھے اور چشمہ کے جسم کو چھلنی کر رہے تھے۔ خدا کے سوا کسی کو نہیں پتہ کہ ان کیڑوں نے چشمہ میں کب سے اپنا گھر بنالیا۔ خدا تو ہمیشہ سے ہے، ہر جگہ پر تھا اور ہر چیز کو دیکھ رہا تھا، مگر وہ اس چھوٹے سے چشمہ سے راضی نہ تھا۔ ایک سنہری صبح ایک فرشتہ کو حکم ہوا کہ چشمہ کے سراغ میں جاؤ اور وہ اس امر پر مامور ہوا کہ وہ سب کے ساتھ اس چھوٹے چشمہ کی مدد کرے۔ فرشتہ ایک سفید بادل کی شکل میں آیا، سمندر سے گذرا،

دشتِ کویر[1] سے گذرا، مرداب[2] سے گذرا اور پھر کہسار میں پہنچا۔ فرشتہ یہ چاہتا تھا کہ وہ چھوٹے چشمہ کو یاد دِلائے کہ وہ بے کار نہیں پیدا کیا گیا ہے۔ اسے ایک چشمہ بنا کر بھیجا گیا ہے تا کہ وہ زندگی کو جاری رکھے۔

○

چھوٹا چشمہ ابھی بھی خواب سے بیدار نہیں ہوا تھا کہ کسی کے رونے کی آواز آئی۔ آنکھوں کو کھولا۔ اس نے دیکھا کہ سفید خوبصورت بادل رو رہا ہے اور بارش سی ہو رہی ہے۔

چھوٹے چشمہ نے کبھی نہیں دیکھا تھا کہ سفید بادل بھی روتا ہے۔

چشمہ نے پوچھا: ''اے ابرِ سفید! تم کیوں رو رہے ہو؟''

ابرِ سفید بولا: ''میں بہت دُور سے آیا ہوں پہاڑوں، میدانوں سے گذرتا ہوا تا کہ ننّھے چشمہ کو بتادوں کہ خدا اس سے راضی نہیں ہے۔ آیا ہوں ننّھے چشمہ کو یہ بتانے کے لیے کہ سمندر پریشان ہے''۔

چشمہ نے پوچھا: ''کیوں؟''

ابرِ سفید نے کہا: ''خدا نے اس ننّھے چشمہ کو اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ سمندر کی طرف اپنے سفر کے دوران جہاں جہاں سے گذرے وہاں زندگی دیتا جائے اور اپنے ٹھنڈے پانی سے تپتے ہوئے کویر کو سیراب کرے، پیاسے ہرنوں کی پیاس بجھائے، سبزوں کو ہریالی دے اور سمندری چڑیوں کو آبِ شیریں''۔

چشمہ نہ تو سمندر کو پہچانتا تھا نہ تو کویر کو؛ نہ ہرن کو دیکھا تھا نہ پرندوں کو؛ نہ پھولوں کو سونگھا تھا نہ سبزے کو؛ پوچھا: ''کویر کیا ہے؟''

ایک بنجر سوکھی زمین۔

''ہرن کیا ہے؟ پرندے؛ پھول؛ سبزے...؟''

''یہ سب خدا کی مخلوق ہیں!''

''سمندر کہاں ہے؟ وہیں جہاں میٹھے پانی کے چشمے گرتے ہیں''۔

''چشمے وہاں کیوں گرتے ہیں؟'' ننھے چشمہ نے پوچھا۔

ننھا چشمہ! چشمے سمندر کی طرف اس لیے جاتے ہیں کہ ان کے پانی میٹھے ہوجائیں۔ سبھی چشمے جانتے ہیں کہ سمندر بہت رحم دل ہے۔ وہ اپنی زندگی کا کچھ حصّہ ان چشموں کو دے دیتا ہے۔ چشموں کے پانی اسی سمندر سے ہیں جو اُس تک پہنچتے ہیں۔ چشمے سمندر میں گرتے ہیں تا کہ سمندر پھر انھیں پلٹا دے۔

ننھا چشمہ سوچ میں پڑ گیا۔ سوچنا چاہیے۔

کیچڑ میں رہنے والے کیڑوں نے سفید بادل کو دیکھا۔ اُس کی باتیں سنیں۔ چشمہ کی باتیں سنیں اور یہ دیکھا کہ چشمہ کس طرح سوچ میں پڑ گیا۔ حشرات ڈر گئے اور اپنے آپ سے بولے: ''اگر یہ ننھا چشمہ سمندر کی فکر میں پڑ گیا تو کیا ہوگا؟ اگر اس ننھے چشمہ کے دل میں آ گیا کہ وہ سمندر کی طرف چل پڑے تو پھر کیا ہوگا؟''

حشرات بولے: ''نئی بات۔ چشمہ ہی کیوں۔ صرف وہی زندگی کو کیوں جاری رکھے؟ زندگی سے ہم زیادہ مستفیض ہیں، کیوں نہ ہم خود یہ کام کریں''۔

اگر چشمہ چل پڑا تو اپنے ساتھ پانی بھی لے جائے گا، دوسرے جانور اس کے پانی کو پئیں گے اور اس کی زندگی کی دعائیں مانگیں گے۔ کویر[1] اس کے پانی کو پیے گا اور اپنے سینہ پر گل و سبزہ اُگائے گا۔ سمندر اس کے پانی کو آغوش میں لے گا اور اس کے لیے محبت کے نغمے گنگنائے گا۔ نہ، نہ! ایسا نہیں ہونے دیں گے کہ سب چشمہ کے لیے چشم بہ انتظار ہوں! ایسا نہیں ہونے دیں گے کہ جہاں جہاں زندگی ہو وہاں وہاں چشمہ کا چرچہ ہو۔

حشرات بولے: ''چشمہ چلا گیا تو یہ کیچڑ خشک ہوجائیں گے۔ چشمہ کا پانی میٹھا ہوجائے گا۔ پھر تو ہم بس یہی کرسکیں گے کہ چشمہ کے آس پاس کے کیچڑوں میں ہی

اپنی زندگی گذاریں۔ ایسے میں کریں گے ہی کیا؟''

آخر میں حشرات بولے: ''تو پھر ہمیں ایسا کرنا چاہیے کہ چشمہ کو سمندر کی یاد ہی نہ آئے۔ ایسا ہونے ہی نہ دیں کہ چشمہ سمندر تک پہنچے''۔

ننھا چشمہ ابھی بھی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

حشرات بولے: ''ننھے چشمہ کس فکر میں ہو؟''

ننھا چشمہ: ''ابرِ سفید کی باتوں میں، سمندر کے بارے میں''۔

حشرات بولے: ''ہاں ہاں، ہم لوگوں نے بھی اس کی باتیں سنیں، ابرِ سفید سچ کہتا ہے۔ سبھی چشمے تو سمندر ہی میں گرتے ہیں۔ سمندر میں اتنا پانی ہے کہ اب اُسے چشمہ کے پانی کی ضرورت ہی نہیں۔ ننھے چشمہ! بے کار اپنے آپ کو ہلکان مت کرو''۔

ننھا چشمہ: ''اے میرے ہمسایو! اگر تم سچ کہتے ہو تو پھر ہمارا خدا ہم سے راضی کیوں نہیں ہے؟''

''ننھے چشمے! خدا تم سے راضی کیوں نہ ہوگا۔ آج پورے کہسار میں سمندری خوشبو چھپی ہوئی ہے۔ آج تمھارے کیچڑ کی مہک نے پورے علاقہ کو بھر دیا ہے۔ پھر تم پریشان کیوں ہو؟'' حشرات بولے۔

حشرات مزید بولے: ''ننھے چشمہ! اپنے آپ کو سونگھو، اپنے کو پہچانو! واہ واہ! کتنی اچھی اور سوندھی خوشبو ہے۔ خدا اسی طرح ہمیشہ تمھاری خوشبو کو باقی رکھے''۔

چشمہ نے اپنے آپ کو سونگھا، اپنی ہی بُو اپنے چاروں طرف محسوس کرنے کی کوشش کی، لیکن اسے کچھ احساس ہی نہ ہوا۔ نہ اچھی مہک نہ بری۔ اس لیے کہ اُسے تو اپنی ہی مہک کی عادت تھی۔

---

۱ کویر: ایران میں واقع ریگستان ۲ مرداب: تالاب/جھیل۔

ننّھا چشمہ بولا: ''ابرِ سفید سے پوچھنا چاہیے''۔ابرِ سفید ابھی آسمان پر اُڑ رہا تھا۔ چشمہ نے اس سے پوچھا: ''ابرِ سفید کیا ہماری خوشبو خدا تک نہیں پہنچتی؟ کیا ہماری خوشبو ہر جگہ پھیلی ہوئی نہیں ہے؟''

ابرِ سفید نے تلخ ہنسی کے ساتھ کہا: ''چشمہ! کبھی تُو نے اپنے آپ کو سونگھا ہے؟ چشمہ! تجھ سے کیچڑ کی مہک آتی ہے۔تم سے سڑاند آتی ہے۔تم جانتے کیوں نہیں؟ سونگھو، سونگھو! اپنے آپ کو سونگھو۔ اپنے کیچڑ کو سونگھو۔خدا اگر راضی نہیں ہے تو صرف اسی لیے راضی نہیں ہے۔ ننّھے چشمہ چل پڑو۔سمندر کی طرف چل پڑو۔خدا کو راضی کرلو اور سمندر کی پریشانی کو دُور کرو''۔

چشمہ بولا: کیسے؟ کیوں؟ سمندر پریشان کیوں ہے؟''

ابرِ سفید بولا: ''پرندے، ہرن، بھیڑوں وغیرہ نے کتنے دِنوں سے میٹھا پانی نہیں پیا ہے؟ وہ اُڑ نہیں سکتے، دوڑ نہیں سکتے، چرواہوں کے ساتھ صحرا میں چر نہیں سکتے، بس یہ سمجھو کہ اب وہ زندہ نہیں رہ سکتے''۔

حشرات نے پھر ابرِ سفید کی باتیں سنیں۔ چشمہ کے اطراف کے کیچڑوں کو اوپر نیچے کیا اور بولے:

''ننّھے چشمہ! پوچھو کہ وہ دوسرے پانی کیوں نہیں پیتے؟''

ننّھے چشمہ نے پوچھا: ''ابرِ سفید! یہ دوسرے پانی کیوں نہیں پیتے؟''

ابرِ سفید بولا: ''بہت سے میٹھے چشمے حشرات کے دھوکے میں آ گئے اور بھول گئے کہ خدا نے انھیں اِس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ سمندر کی طرف جائیں۔ زندگیوں کو سیراب کریں اور ان کا پانی ہاضم اور میٹھا رہے۔ ننّھے چشمہ! اگر تم سمندر کی طرف جاؤ گے تو تم میٹھے اور ہاضم بنے رہو گے، آئینہ کی طرح شفاف اور روشن رہو گے۔ ننّھے چشمہ! نمک زاروں نے سمندر کے پانی کو کھارا کر دیا ہے''۔

حشرات چیخ اُٹھے: ''ننّھے چشمہ! ابرِ سفید سچ کہہ رہا ہے۔سمندر اس وقت کھارا ہے اور تمھارا پانی میٹھا۔قدیم زمانے سے یہ بات کہی گئی ہے کہ میٹھے پانی کا کھارے پانی میں گر جانا صحیح انجام نہیں ہے۔ایسا تو سوچنا بھی نہیں چاہیے''۔

ابرِ سفید بولا: ''ننّھے چشمہ! قدیم زمانہ سے جب سے خدا نے چشموں کو پیدا کیا اور جس دن سے سمندر کو تبھی سے میٹھے چشمے سمندر میں گرتے ہیں تا کہ اپنے سفر سے زندگیوں کو سیراب کریں''۔

ننّھا چشمہ: ''آج پرندے حالتِ مرگ میں ہیں۔ جانور مر رہے ہیں۔سمندر بہت پریشان ہے۔سمندر کا سکون جانوروں اور پرندوں کے لیے درہم برہم ہے''۔

ابرِ سفید رویا، برسا اور اُوپر چلا گیا۔ننّھا چشمہ پھر سوچ میں پڑ گیا۔حشرات خاموش تھے، وہ جانتے تھے کہ ننّھا چشمہ پھر سمندر کی سوچ میں پڑ گیا ہے۔ کیڑے مکوڑے اپنے مسکن کو لوٹ گئے تا کہ وہ اس مسئلہ پر مزید غور و فکر کر سکیں، اور مسئلہ کا معقول حل دقت نظری کے ساتھ بہت جلد ڈھونڈ نکالیں۔ایسا نہ ہو کہ ننّھا چشمہ سچ مچ چل پڑے۔اس مسئلہ پر سوچنا چاہیے۔حشرات سوچنے لگے۔آخر کار وہ سب اس مہم پر جُٹ گئے اور انھوں نے بہت جلد اس کا یہ حل ڈھونڈ ہی نکالا کہ چشمہ کا سمندر تک جانے کا راستہ مرداب سے ہو کر جاتا ہے کیوں نہ مرداب کو اس کی خبر دی جائے اور اس سے یہ گذارش کی جائے کہ وہ ننّھے چشمہ کے پانی کو آگے بڑھنے نہ دے اور خود میں جذب کر لے۔اور پھر کیا تھا اس خیال کے آتے ہی چند کیڑے رینگتے ہوئے مرداب کی طرف چل پڑے۔

ننّھے چشمہ نے آنکھیں کھولیں اور اپنے آپ کو دیکھا۔پہلی بار اپنی آنکھوں سے خود کو دیکھا تھا۔جب سے وہ زمین کے نیچے سے پھوٹ کر اُوپر آیا تھا نہ تو اس نے کبھی

خود کو دیکھا تھا اور نہ خود کو پہچانا تھا۔ حشرات سمجھ گئے کہ ضرور کوئی بات ہے۔ پوچھا: ''ننھے چشمہ کیا کر رہے ہو؟''

''کچھ نہیں، اپنے آپ کو دیکھ رہا ہوں۔ چاہتا ہوں کہ خود کو پہچانوں''۔ اور وہ اپنے وجود میں گم ہوگیا۔ اس کا پانی گویا میٹھا نہیں تھا، سبز تھا، سیاہ تھا، گدلا تھا۔

حشرات نفرت آمیز ہنسی کے ساتھ بولے: ''ہاں اپنے آپ کو دیکھ لو۔ ننھے چشمہ! دیکھ لو تم کتنے خوبصورت ہو۔ واہ واہ! کتنے خوبصورت رنگ ہیں درختوں کی طرح سبز، پتھر کی طرح خاکستری اور شبِ تاریک کی طرح سیاہ، کتنے اچھے رنگ ہیں۔ بے رنگی بھی کیا بری شے ہے۔ ننھے چشمہ! کیا سچ مچ تم کو پتہ تھا کہ تم اتنے خوبصورت ہو''۔

ننھا چشمہ چکرا گیا۔ وہ خود نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ اس کا کیا جواب دے۔ وہ بُدبُدایا: ''کیا ہمارا پانی آئینہ کی طرح شفاف نہیں ہونا چاہیے۔ یہ رنگ برنگا کیوں ہے؟ ابرِسفید سے پوچھنا چاہیے۔ اُسے ضرور پتہ ہوگا''۔ نظر اُوپر اُٹھائی، ابرِسفید کو دیکھا۔ ابرِسفید اوپر چلا جا رہا تھا اوپر۔ ننھا چشمہ چلّایا: ''ابرِسفید! اے ابرِسفید! رنگ اچھا ہوتا ہے یا بے رنگی؟''

ابرِسفید بھی چیخ کر بولا: ''چشمہ! آئینہ کی طرح شفاف رہو''۔ اور پھر وہ اور بھی اُوپر چلا گیا۔ چشمہ نے دوبارہ پوچھا: ''ابرِسفید کہاں جا رہے ہو؟''

''سمندر کی طرف... کیا تم بھی سمندر کی طرف جا رہے ہو؟ جو پانی کا بنا ہوا ہے وہ سمندر ہی کی طرف جاتا ہے''۔

''سمندر کا راستہ کس طرف کو جاتا ہے؟''

''جس دم تم ارادہ کر لینا فوراً سمندر کی طرف چل پڑنا اور مجھے آواز دینا، تنہا نہ جانا ننھے چشمہ! بغیر کسی راہبر کے نہ جانا۔ سمندر کا راستہ بہت دُور، بہت سخت اور بہت خطرناک ہے''۔

چشمہ نے چاہا کہ اس سے یہ کہے کہ اے ابرِسفید! تم نہ جاؤ، میرے ہی پاس رُک جاؤ اور مجھے تنہا نہ چھوڑو، لیکن ابرِسفید بہت دُور جا چکا تھا۔ چشمہ تنہا رہ گیا۔ دل گرفتہ اور غمگین ہوگیا۔

ننھا چشمہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ (ابرِسفید) سمندر میں گرتا کہاں ہے؟ وہ چاروں طرف گھوما۔ کیچڑوں کے نیچے، گیلی مٹی کے نیچے، پتھروں کے ٹکڑوں کے نیچے، لیکن چشمہ کہیں بھی نہیں پہنچ سکا۔ اتنے برسوں تک وہ پہاڑ کے سینہ سے باہر تو نکلا رہا لیکن اسے کوئی فائدہ حاصل نہ ہوسکا۔ کیا اس کا بس یہی اتنا فائدہ تھا کہ چند قدم آگے بڑھے، اپنے چاروں طرف کی زمین کو دلدلی بنائے اور پھر زمین کے سینہ میں جذب ہوجائے۔

ننھے چشمہ کو ابرِسفید کی باتیں یاد آگئیں۔ دھیرے دھیرے کیچڑ کی مہک محسوس کرنے لگا، اور اپنی بدبو کو سمجھنے لگا۔ اپنے سیاہ رنگ کو بھی پہچاننے لگا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ چیخ کر اس دلدل اور کثافت سے باہر نکل جائے۔

حشرات نے دیکھا کہ چشمہ کے پانی پر چھوٹی چھوٹی کانپتی ہوئی لہریں ہل رہی ہیں اور یہ دیکھتے ہی حشرات وحشت زدہ کیچڑ میں کلبلانے لگے۔

ننھا چشمہ پریشان تھا۔ وہ کانپ رہا تھا۔ لہریں اُٹھ رہی تھیں۔

حشرات: ''اے میرے ہمسایو! میں پریشان ہوں! سمندر کہاں ہے؟ چشمے وہاں کیوں جاتے ہیں؟''

حشرات دلدلی زمین میں رینگ رہے تھے، بولے: ''سمندر! جیسے اور گڈھے پانی سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں اُسی طرح کا ایک پانی سے بھرا بڑا گڈھا یا ایک بڑا تالاب''۔

''اس کا راستہ کدھر سے ہے؟'' ننھے چشمہ نے پوچھا۔

''اُس کا راستہ... اُس کا راستہ بہت دُور ہے، اور سخت ہے! میں جانتا ہوں، مجھے پتہ ہے۔ ابرِسفید نے مجھے یہ باتیں بتائی ہیں۔ مگر وہ ہے کدھر؟''

حشرات نے ایک دوسرے کو دیکھا، بولے: ''کدھر سے...؟''

ٹھنڈی ہوا چلی۔ اس ہوا کو ابرِ سفید نے بھیجا تھا تا کہ چشمہ کے کان میں سمندر کی آواز پہنچادے۔

چشمہ نے ایک اجنبی آواز سنی اور ٹھٹک گیا۔

سمندر کی پریشان لہروں کی آواز۔

آواز، چڑیوں کے نالہ وشیون کی آواز!

آواز، غم زدہ آبی جانوروں کی کراہ!

چشمہ کانپ اُٹھا۔ اپنے آپ سے پوچھا: 'یہ آوازیں کیسی ہیں؟' پھر اس نے کان لگایا۔ حشرات ساکت تھے۔ چیخیں بڑھتی جارہی تھیں۔ چشمہ اپنے آپ سے بولا: 'خدا نہ کرے...' اور تھرتھرانے لگا۔ نسیم کے جھونکوں نے اس کی مدد کی۔ چشمہ کے پانی میں لہریں اُٹھنے لگیں۔ چشمہ سے آواز آنے لگی۔ نسیم نے ملائمیت سے اس کے کان میں کہا: ''ننھے چشمہ! کیا تم ان آوازوں کو سن رہے ہو؟ یہ پریشان سمندر کی آواز ہے! یہ پیاسے پرندوں کی آواز ہے! آبی جانوروں کی آواز ہے، جو اَب مرنے ہی والے ہیں۔ للہ ننھے چشمہ! یہ وقت کوچ کا ہے''۔

ایک بڑی سی لہر چشمہ کے اندر سے اُٹھی۔ اُوپر آئی... اور اُوپر آئی۔ ایسا لگتا تھا کہ گویا چشمہ اَب اپنے آپے میں نہیں ہے۔ یکبارگی پانی چشمہ کے کناروں کو توڑتا ہوا آگے بہہ نکلا۔ نسیم نے تیزی سے سب کو خبر دی کہ ننھا چشمہ چل پڑا ہے۔

حشرات بولے: ''ننھے چشمہ کہاں؟''

چشمہ نے کہا: ''میں سمندر کی طرف جارہا ہوں ہمسایو! خدا حافظ!... شاید تمھیں یاد نہیں ہے کہ ابرِ سفید نے کیا کہا تھا۔ سمندر کا راستہ بہت خطرناک ہے، بہت سخت ہے، بغیر رہنما کے نہ جاؤ''۔

''آہ! سچ۔ ابرِ سفید کہاں ہے؟ میں چاہتا ہوں کہ جتنی جلدی ہو سمندر تک پہنچ جاؤں''۔

''...ہوگا۔ اب تم کو جلدی ہے۔ بس چل پڑو۔ ننھے چشمہ ہمارے پیچھے پیچھے آؤ۔ ہم بھی سمندر تک جائیں گے''۔

حشرات مٹی میں رینگ رہے تھے اور ننھا چشمہ بھی کف اور پھین چھوڑتا ہوا ان کے پیچھے پیچھے بڑھنے لگا۔

مرداب گھات میں بیٹھا ہوا تھا۔ چشمہ دُور سے آتا ہوا دِکھائی دیا۔ سورج کی کرنوں میں لوٹتا ہوا آگے کو بڑھا آرہا تھا۔ حشرات مرداب کے کان میں پھسپھسائے کہ مرداب تیار ہوجاؤ۔ چشمہ پہنچنے ہی والا ہے۔

حشرات خوشی میں ایک دوسرے سے لپٹ گئے اور چیخ کر بولے: ''پہنچ گئے، ہم پہنچ گئے۔ ننھے چشمہ تیار ہوجاؤ۔ کیا تم سمندر کی مہک محسوس کر رہے ہو؟''

چشمہ بے یقینی سے بولا: ''ہاں ہاں! محسوس کر رہا ہوں۔ لہروں کی آواز سن رہے ہو؟''

چشمہ نے شوق سے اپنی لہروں کو اُٹھایا اور خوشی کے نغمہ گنگنانے لگا۔ جلدی جلدی خود کو آگے کھینچتا رہا۔ حشرات ناچتے ہوئے مرداب میں داخل ہوگئے اور حشرات کے پیچھے پیچھے چشمہ بھی اسی راستہ سے پہنچ گیا؛ بڑے شوق اور اشتیاق کے ساتھ۔ جب تک وہ یہ سمجھے کہ دُنیا میں کیا ہورہا ہے اور جب تک وہ آنکھیں کھولے مرداب نے اسے اُچک لیا۔

چشمہ کیچڑ سے بھرے ہوئے گندے مرداب میں ڈوب گیا۔ وہ یہ سمجھ بھی نہ پایا کہ اس کے سر پر کیا بلا آگئی۔ مرداب دُور سے قہقہہ لگا رہا تھا۔ ہا... ہا... ہا...

اس کی آواز بیابان میں پھیل گئی۔ نسیم نے مرداب کی آواز کو ابرِ سفید تک پہنچانے کے لیے اپنے ساتھ لیا۔

حشرات دلدل میں خوشیاں منا رہے تھے۔ مرداب کے کنارے وہ خوشی سے کچ بچ کر رہے تھے۔ چشمہ سمجھ گیا کہ حشرات نے اُسے دھوکا دیا ہے۔

لیکن ان سب کے باوجود وہ مرداب میں غرق ہونا نہیں چاہتا تھا۔ چشمہ چاہتا تھا کہ زندہ رہے، وہ جانتا تھا کہ جانوروں اور پھولوں کو اپنے پانی سے سیراب کرے اور آخر میں وہ شفاف، پاک اور روشن ہو کر سمندر میں گر جائے۔

چشمہ چاہتا تھا کہ مرداب میں زندہ رہے۔ ہوا نے ابرِ سفید کو خبر دے دی اور ابرِ سفید رونے لگا اور بارش شروع ہوگئی۔ غرض سب کو معلوم ہوگیا کہ اب چشمہ مرداب کے جال میں پھنس گیا ہے۔ صحرا کے سبزے غم سے رونے لگے۔ جانوروں نے پیاس اور بے چارگی کی حالت میں چیخنا شروع کر دیا۔ تپتا ہوا کویر بھی آہیں بھرنے لگا۔ پریشان سمندر طیش میں آیا اور بے قراری کی حالت میں ساحل پر موجوں کے تازیانے برسانے لگا۔

سب نے پوچھا کہ کرنا کیا چاہیے؟ ننھا چشمہ تو نا اُمید ہو چکا تھا۔ مرداب کے گندے پانی نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ ننھے چشمہ نے باہر نکلنے کے لیے مرداب میں اس قدر ہاتھ پیر مارا کہ اب اس میں جان نہیں بچی تھی۔ گویا کہ وہیں غرق ہوگیا تھا۔ ننھا چشمہ اپنے آپ سے بولا: 'میں کتنا تنہا ہوں۔ سبھی مجھ کو بھول گئے۔ ابرِ سفید، سمندر، حیوان'...

ابرِ سفید چلتا رہا، چلتا رہا۔

ہرن اور بارہ سنگھوں کو معلوم ہی نہ ہوا کہ میں چل پڑا ہوں یہاں تک کہ پھولوں اور سبزوں کو تو میری رطوبت تک کا احساس نہ ہو سکا۔ حتیٰ کہ سمندر لاعلم تھا کہ میں بھی اس کی طرف چل پڑا ہوں۔ افسوس... افسوس...! زندگی بھی بے فائدہ۔ موت بھی بے فائدہ... افسوس... افسوس...!

حشرات بولے: ''ننھے چشمے تمھیں افسوس کس بات کا ہے؟ کیا تم نہیں چاہتے تھے کہ سمندر تک پہنچو؟''

ننھے چشمہ نے اشک بار آنکھوں سے کہا: ''نہیں... میں چاہتا تھا!''

حشرات بولے: ''کیا یہ سمندر نہیں ہے؟''

ننھے چشمہ نے تعجب سے کہا: ''یہاں!''

''مجھے نہیں معلوم۔ یہاں کہاں سے؟''

''ٹھہرو! ہم لوگ تمھیں بتاتے ہیں''۔ حشرات بولے۔ ''یہ وہی بڑا سمندر ہے ننھے چشمہ! وہی سمندر ہے جس کے تم منتظر تھے۔ اب صرف تمھیں اپنا میٹھا پانی اس کے سپرد کر دینا چاہیے اور پھر راحت کی سانس لو۔ ننھے چشمہ! اپنا پانی سمندر کے حوالے کر دو''۔

سمندر: ''مگر...!''

''یہ اگر مگر کیا ہے؟ ننھے چشمہ!''

''خدا کے واسطے اپنا پانی سمندر کے حوالے کر دو!''

''کیا سمندر بہت گہرا اور اتھاہ نہیں ہے؟--- مہربان اور سکون بخش نہیں ہے؟--- خوشبودار اور میٹھا نہیں ہے؟''

''ہاں یہ سب تو ہے، مگر سمندر نہیں ہے!''

''کیوں؟ کیوں؟... ننھا چشمہ! ہے''۔

''یہ تبھی بڑا ہے اور گہرا ہے۔ یہ بھی خوش رنگ ہے اور خوشبودار ہے''۔

''دیکھو! دیکھو! سونگھو! کیا اچھی خوشبو ہے؟--- کتنا اچھا رنگ ہے؟ ننھے چشمہ! کیا یہ سب تم نہیں دیکھ رہے ہو؟''

چشمہ نے مرداب کو سونگھا۔ اس کی طرف دیکھا۔ ایسا لگا جیسے مرداب کی مہک زیادہ بری نہیں تھی۔ اس کا رنگ بھی اسے برا نہیں دکھائی دیا۔ من ہی من بولا: 'سچ ہے

سمندر یہی ہوگا!''

حشرات مستانہ وار لوٹ پوٹ رہے تھے اور سیاہ مرداب کے کیچڑ میں اُتھل پتھل مچا رکھی تھی۔

ابرِسفید اور ہوا، پرندے اور ہرن، کبوتر اور سمندر، سب کے سب ننھے چشمہ کے لیے پریشان تھے۔

ابرِسفید بولا: ''خدا کہتا ہے کہ ہم سب کو ننھے چشمہ کی مدد کرنی چاہیے تا کہ وہ سمندر تک پہنچ جائے''۔

سب مل کر بولے: ''کیسے؟''

ابرِسفید نے کہا: ''مرداب کی تلاش میں چلتے ہیں، ہمیں چاہیے کہ اُس کی مدد کریں اور اُسے آزاد کرائیں۔ ہم میں جتنا جس کے بس میں ہے اس کی مدد کرے۔ ننھا چشمہ ہم سب کی آنکھ کا تارا ہے''۔

پرندے بولے: ''ایسا لگتا ہے کہ ہم نے اس چشمہ سے کبھی آبِ حیات پیا ہے''۔

بارہ سنگھے بولے کہ: ''گویا ہم نے بارہا اس شفاف چشمہ میں اپنی صورت دیکھی ہے''۔

اور سمندر بولا کہ ''میں ایک نہ ایک دن اس میٹھے چشمہ کو اپنی آغوش میں لے ہی لوں گا۔ چلو چلیں۔ چلو دوستو چلیں۔ میں بھی دن رات یہی دعا کر رہا ہوں۔ شب و روز اس کے اشتیاق میں نغمے گنگنا رہا ہوں تا کہ چشمہ کو پتہ چلے کہ وہ ہم سب کے لیے عزیز ہے''۔

ابرِسفید، پرندے، بارہ سنگھے سبھی چل پڑے۔ سمندر اپنی کف آلود موجوں کے ساتھ ننھے چشمہ کے لیے دعا گو تھا۔

اگرچہ ننھا چشمہ مرداب کی آغوش میں سما چکا تھا۔ اب نہ کوئی آواز تھی نہ کوئی صدا، جو کچھ تھا مرداب ہی تھا، وہی حشرات اور وہی کیڑے مکوڑے۔

ایک تپتی ہوئی دوپہر کو جب سورج ڈھل رہا تھا اور مرداب کے گندے پانی سے ابخرات اُٹھ رہے تھے اور ہواؤں میں بکھر رہے تھے۔ اُس وقت ننھے چشمہ نے پوچھا: ''اے میرے پڑوسی کیڑو! کیا بات ہے؟ نہ مرغابی، نہ حیوان، نہ بارہ سنگھے، نہ ہرن--- کسی کو کوئی خبر ہی نہیں ہے''۔

حشرات بولے: ''کیوں، خبر کیوں نہیں ہے؟ شاید تم پیاسی بھیڑوں کے گلّے کو نہیں دیکھ رہے ہو جو نزدیک آ رہا ہے۔ کیا تم ان کے گھنگھروؤں کی آواز نہیں سن رہے ہو؟''

چشمہ نے کان لگایا۔ گھنگھروؤں کی آوازیں دھیرے دھیرے تیز ہوتی جا رہی تھیں۔ بھیڑیں آ گئیں اور مرداب کے گرد حلقہ بنا کر جمع ہو گئیں۔

ننھا چشمہ دل ہی دل بولا: ''آہ! خدایا، شکر ہے۔ سچ ہے کہ سمندر اسی جگہ ہے''۔

چرواہا مرداب کے کنارے پہنچا، ٹھہرا، پانی کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھا اور پھر چیخا: ''اے بھیڑو! اس گندے پانی کو نہ پیا۔ یہ تم سب کو مار ڈالے گا۔ چلو واپس ہو جائیں۔ ہم سب کو واپس ہو جانا چاہیے۔ شاید اللہ کی مدد سے اس خشک زمین میں کوئی میٹھا چشمہ مل جائے''۔ بھیڑیں نا اُمید ہو کر بیں بیں کرنے لگیں اور چرواہا بھیڑوں کو ہک ہک کرنے لگا۔

ننھا چشمہ پھر سوچ میں پڑ گیا۔ دُور سے چرواہے کے بانسری کی دل سوز آواز اس کے کان میں پہنچ رہی تھی۔ پیاسی بھیڑوں کے گلہ کی مایوسانہ آواز سن رہا تھا۔ سمندر سے آتی ہوئی ٹھنڈی ہوائیں، چرواہے کی بانسری کی آواز اور بھیڑوں کی چیخ پکار بھی سنائی دے رہی تھی۔

ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے اپنے ساتھ سمندر کے نغمے اور اس کی دُعاؤں کو بھی لیے ہوئے تھے۔

ننھے چشمہ نے سمندر کے پُرشوق نغمے سنے۔ بے اختیار جذباتی ہوگیا اور من ہی من سوچنے لگا: الٰہی! یہ کیسا نغمہ ہے؟" آسمان کی طرف نظر اُٹھائی۔ دیکھا کہ خوبصورت ابرِسفید سر کے اُوپر چمک رہا ہے۔ اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ رنگ برنگی چڑیاں مرداب کے اُوپر منڈلا رہی تھیں۔ بارہ سنگھے اور ہرن مرداب کے اِردگرد اُچھل کود مچا رہے تھے۔ چشمہ بولا: "یاخدا! یہ سب کیا ہورہا ہے؟"

ابرِسفید نے کہا: "ہم تمھاری رہائی کے لیے آئے ہیں"۔

چشمہ نے حیرت سے پوچھا: "میری رہائی!... کیا مطلب؟" اُس کی جان میں جان آئی۔ مرداب میں تلاطم آ گیا۔ کیڑے بوکھلا گئے۔ بولے: "نہیں، نہیں۔ ہمیں چھوڑنا نہیں چاہیے کہ یہ چشمہ سمندر تک پہنچ جائے"۔

ابرِسفید نے کہا: "ہمیں اس ننھے چشمہ کی مدد کرنی چاہیے۔ اپنی زندگی کا ایک چھوٹا سا حصہ اگر اسے دے دیں تو یہ ننھا چشمہ آزاد ہوجائے گا۔ یہ حکمِ خدا ہے۔ میں اپنی لطافت اسے دے رہا ہوں"۔

ہرن بولے: "ہم اپنی معصومیت اسے دے رہے ہیں تاکہ یہ آزاد ہوجائے"۔

پرندے بولے: "ہم اپنی اُڑان اُسے دے دیتے ہیں تاکہ چشمہ آزاد ہوجائے"۔

پھول اور سبزے بولے: "ہم اپنی تراوٹ اسے دے دیں گے تاکہ ننھا چشمہ آزاد ہوجائے"۔

زمین بولی: "ہم بھی اپنا سینہ چاک کردیں گے تاکہ ننھے چشمہ کو کھلا راستہ مل جائے"۔

سب نے ایک ساتھ مل کر پھر کام شروع کیا اور ایک باریک سی نہر صحرائی زمین میں کھودی۔

کیڑے پھر بولے: "ہمیں کسی طرح بھی ننھے چشمہ کو چھوڑنا نہیں چاہیے۔ اس کے پانی کو نہر میں گرنے نہیں دینا ہے"۔

سارے کیڑے مل کر گھسٹتے اور رینگتے ہوئے نہر کی طرف پہنچے۔ نہر کے بدن کو چھلنی کردیا تاکہ ننھے چشمہ کا پانی زمین میں جذب ہوجائے۔

ابرِسفید اپنے آپ سے بولا: "پرندے تو نہر کی طرف چلے گئے"۔

کیڑے فوراً مرداب کی طرف چل پڑے اور وہ جو بھاگ نہ سکے پرندوں کے پنجوں کے نیچے آ کر جان کھو بیٹھے۔

ننھے چشمہ نے اپنے آپ کو صحرا کی نہر تک پہنچایا۔ مردہ کیڑوں کی لاشوں کو سمیٹا اور سمندر کی طرف چل پڑا۔

آدھا مرداب تو چشمہ کے ساتھ ہی ہولیا تاکہ چشمہ کا پانی اپنا رنگ نہ بدلنے پائے۔

ابرِسفید آسمان پر چمک رہا تھا اور ہنسا۔ چڑیاں پھڑپھڑا کر آسمان میں اُڑ گئیں۔ ہرن اور بارہ سنگھے صحرا کی طرف دوڑ پڑے۔ ٹھنڈی ہوا بھی سب کو خبر دینے کے لیے چل دی کہ ننھا چشمہ مرداب کی قید سے آزاد ہوگیا۔

مرداب نے غصّے میں اپنے کیچڑ کو ہلورڈالا۔ اور مرداب کے کیڑے بے چین ہوکر ہچکولے کھانے لگے اور حشرات سے بولے: "اب ہم اس سے زیادہ آگے نہیں جاسکتے"۔

"چشمہ تو ہمارے چنگل سے نکل گیا۔ اب یہ تمھارا کام ہے کہ اس دیوانے چشمہ کو نگل جاؤ اور شورزار سے یہ کہہ دو کہ اس چشمہ کے میٹھے پانی کو نمکین بنادے"۔

مرداب کے پتنگے بھن بھن کرتے ہوئے کویر کی طرف اُڑ گئے۔ پتنگے دُور سے کالے بادل کے ٹکڑے کی طرح نظر آرہے تھے۔

ہرن نے دل ہی دل میں خود سے سوال کیا "اس چشمہ کا انجام کیا ہوگا؟"

ننھا چشمہ سمندر کی طرف جارہا تھا۔

اب وہ تنہا نہیں تھا۔ ابرِسفید اسے راستہ دِکھا رہا تھا اور وہ بہت شوق سے سمندر کی طرف دوڑ رہا تھا۔ اب سبھی یہ جان گئے تھے کہ ننھا چشمہ سمندر کی طرف پھسلتا جارہا ہے۔

کبھی ہوا کے بگولے، کبھی بڑے بڑے پتھروں کے ٹکڑے چشمہ کے راستہ میں گرے پڑ رہے تھے تا کہ اس کا راستہ روک دیں، لیکن چشمہ بھی مرداب کی سیاہی کو پتھروں کے بیچ میں چھوڑتا ہوا آگے بڑھتا رہا، اور چشمہ کا پانی پتھروں سے گذرتا ہوا صاف اور شفاّف ہوتا گیا۔

ننّھا چشمہ رات دن چلتا رہا۔ اس کی خواہش تھی کہ جتنا جلدی ہو سکے وہ سمندر سے مل جائے۔ وہ جانتا تھا کہ سبھی اس کے ساتھ ہیں اور سبھی اس کی مدد کرنا چاہتے ہیں اور اب تو اس کا رنگ بھی بدل رہا تھا اور چشمہ کے دل کی سیاہی بھی دُور ہو رہی تھی۔ اب تو چشمہ کی کائی بھی چمک دار ہوتی جا رہی تھی۔ سیاہی کے بجائے اس کا رنگ سبز اور روشن ہوتا جا رہا تھا۔

چشمہ چلتا رہا... چلتا رہا... چلتا رہا... اور کوہسار میں پہنچا۔ پتھروں سے بھرے کوہستان میں۔

چشمہ کا راستہ پتھروں نے بند کر دیا تھا۔ ننّھے چشمہ نے پتھروں کو اتنا ڈھکیلا کہ تھک گیا اور وہیں زمین پر پھیل گیا۔ ابرِسفید نے کہا: ''ننّھے چشمہ! کیا تم نہیں چاہتے کہ سمندر تک پہنچو؟''

چشمہ نے کہا: ''اے ابرِسفید! اب میں تھک گیا۔ اب میں کچھ نہیں کر سکتا۔ یہ پتھر بہت سخت ہیں۔ کیا سمندر تک جانے کا کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے؟''

ابرِسفید نے کہا: ''سمندر تک پہنچنے کا راستہ ہی سخت ہے۔ پہاڑوں اور سنگلاخوں سے بھرا ہوا ہے۔ اگر تم سمندر تک جانا چاہتے ہو تو یا تو پہاڑ میں سوراخ کر دو یا پھر اس کے چاروں طرف گھوم کر پھیل جاؤ''۔

''پہاڑوں کے چاروں طرف گھوموں! یہ تو بہت لمبا راستہ ہو جائے گا''۔ چشمہ نے تعجب سے کہا: ''پہاڑ میں سوراخ کروں! آخر کیسے؟''

''نہیں تو پھر اس کے چاروں طرف گھومو!''

''پہاڑ کے چاروں طرف چکر لگاؤں! یہ تو راستہ بہت لمبا ہے! تم کو پتہ ہے کہ اس طرح یہ راستہ کتنا لمبا ہو جائے گا؟''

''شاید ننّھے چشمہ تم نہیں چاہتے کہ سمندر تک پہنچو۔ بس جلدی کرو''۔

ایک ٹھنڈی سہانی صبح تھی کہ چشمہ نے پہاڑ کا چکر لگایا ہی لیا اور کہسار کو پیچھے چھوڑ دیا۔

کہسار کی طرف سے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں اور چشمہ کانپ رہا تھا۔ چشمہ ٹھنڈک سے سن ہو رہا تھا۔ اُسے بہت سردی لگ رہی تھی۔

ننّھا چشمہ دھیرے دھیرے بنجر، خشک اور وسیع زمین پر پہنچا۔ وہاں کویر تھا، مگر چشمہ نے کویر کو نہیں پہچانا۔ چشمہ اپنے آپ سے بولا: 'اُف! اس سردی میں اس خشک زمین سے گذر؟'

کویر نے کہا: ''ننّھے چشمہ سلام جگ جگ جیو، سلامت رہو، آخر تم پہنچ ہی گئے''۔

چشمہ نے کہا: ''سلام! آپ کو کیسے پتہ کہ میں کہاں سے آ رہا ہوں''۔

کویر ہنسا اور بولا: ''میں کویر؛ ابرِسفید نے مجھے تمھارے آنے کی خبر دی ہے''۔

ابرِسفید بولا: ''ننّھے چشمہ! بڑھتے رہو۔ ڈرو نہیں۔ کویر ہمارا دوست ہے۔ ہاں شورہ زار سے ہوشیار رہنا۔ شورہ زار تمھارا دشمن ہے''۔

ننّھا چشمہ کویر میں داخل ہو گیا۔ کویر نے چشمہ کو گرمی عطا کی۔ وہ گرم ہوا۔ وہ چاہتا تھا کہ کویر کا شکریہ ادا کرے مگر وہ ڈر رہا تھا۔ اُسے خوف تھا کہ کہیں کویر اس کا سارا پانی نگل نہ جائے اور پھر سمندر، جانوروں اور پرندوں کے لیے پانی ہی نہ بچے۔

ڈرتے ڈرتے ننّھے چشمہ نے پوچھا: ''تم میرا پانی نہیں پیو گے؟''

کویر نے کہا: ''نہیں!''

ننّھے چشمہ نے کہا: ''کیوں؟ کیا تمھیں پیاس نہیں ہے؟''

کویر نے کہا: ''میں پیاسا ہوں۔ بہت پیاسا ہوں۔ برسوں سے کوئی چشمہ اِدھر سے نہیں گذرا۔ میں نے سالہا سال سے پانی کا ایک قطرہ بھی چکھا نہیں ہے۔ اگر میں تمھارا پانی پی لوں گا تو پھر اُن پرندوں کو کون سیراب کرے گا؟ اِن پھولوں کو کون اُگائے گا؟ ان ہرنوں کی پیاس کون بجھائے گا؟ نہیں! نہیں چشمہ! میں ہرگز تمھارا پانی نہیں پیوں گا۔ اب جلدی کرو۔ سمندر تمھارا منتظر ہے۔ للہ جلدی کرو۔ جلدی کرو ننھے چشمہ''۔

چشمہ نے کہا: ''پھر تم نمی ہی چکھ لو''۔

''کویر نے کہا: ''میں تمھاری نمی بھی نہیں چکھوں گا۔ اس کی حفاظت کروں گا اور پھولوں اور سبزوں تک پہنچاؤں گا تا کہ وہ زندہ رہیں''۔

سبزوں نے کہا: ''کویر کی نمی کو ہم جڑوں کے ذریعے ٹہنیوں تک پہنچاتے ہیں تا کہ وہ تازہ رہیں، اور تب ہرن اور بھیڑیں ہمارے پتوں کو کھائیں گی اور زندہ رہیں گی''۔

ہرنوں نے کہا: ''تازہ سبزوں کو چڑیوں تک، تا کہ انھیں پرواز میں طاقت ملے''۔

چڑیوں نے کہا: ''چشمہ کے راستہ میں ہم تازے پودے لگائیں گے تا کہ وہ بڑھ کر سایہ کریں اور ہمیشہ اس فدا کار چشمہ کو اپنی پناہ میں رکھیں''۔

ننھا چشمہ رو پڑا، اور بولا: ''میرے پانی میں سے ایک قطرہ سمندر تک پہنچا دو تا کہ اسے اس بات کا یقین ہو جائے کہ میں آ رہا ہوں''۔

پتنگوں نے اپنے آپ کو شورہ زار اور بگولوں تک پہنچایا اور بولے: ''اے بڑے شورہ زار! اے مضبوط ہواؤں کے بگولے! ننھا چشمہ سمندر کی طرف پہنچ رہا ہے، اُسے سمندر تک پہنچنے سے روک دو''۔

شورہ زار اور بگولے چیخ اُٹھے: ''ننھا چشمہ اس وقت کہاں ہے؟''

پتنگوں نے کہا: ''کویر کے بیچ و بیچ''۔

بگولہ نے شورہ زار میں طوفان مچایا اور نمک لیے ہوئے گول گول چکر کاٹتا ہوا ننھے چشمہ کی طرف چل پڑا۔

ہوا نے ابرِ سفید کو خبر دی۔

ابرِ سفید نے کہا: ''ننھے چشمہ! راستہ کو کج کرو۔ بگولہ اور شورہ زار آ رہے ہیں''۔

ننھے چشمہ نے راستہ کج کر دیا۔

پرندے، ہرن اور نسیم سبھی مل کر بولے: ''نہیں ہونے دیں گے، ایسا ہرگز نہیں ہونے دیں گے کہ بگولے چشمہ کے دل پر نمک چھڑک دیں، لیکن بگولہ ابھی شورہ زار کو لے کر آ رہا ہے''۔

راستہ بہت لمبا ہو گیا تھا۔ ننھا چشمہ تھکا جا رہا تھا لیکن اپنے لب پر یہ بات نہیں لا رہا تھا۔

سورج نے چشمہ کے پانی کو تھوڑا بھاپ بنا دیا تھا۔

ننھے چشمہ نے اپنی زندگی سے تھوڑی سی حیات کویر، جانوروں اور سبزوں کو بخش دی تھی اور جب کہ ہر روز وہ چلا جا رہا تھا، چشمہ کا پانی کم ہوتا جا رہا تھا۔

ابرِ سفید نے کہا: ''ننھے چشمہ! نا اُمید نہیں ہونا چاہیے۔ کبھی بھی نا اُمید نہ ہونا۔ میں گریہ کروں گا اور اتنا روؤں گا کہ تمھارا میٹھا پانی پھر بڑھ جائے گا''۔ اور یہ کہہ کر وہ رو پڑا۔

ابرِ سفید روز و شب گریہ کرتا رہا۔ ابرِ سفید نے سب سے کہا: ''ہمیں چشمہ کی مدد کرنی چاہیے۔ یہ چشمہ ایک فدا کار چشمہ ہے۔ ہمیں اُسے نا اُمید نہیں ہونے دینا چاہیے۔ دوستو! سب اس کی مدد کرو تا کہ خدا راضی ہو جائے''۔

کوہستانی برف بہت زیادہ پگھل گئی تا کہ چشمہ کا پانی بڑھ جائے۔ زمین نے اپنا ذخیرہ بھی اُنڈیل دیا تا کہ ننھے چشمہ کا پانی زیادہ ہو جائے۔ ہوا نے ہرنوں کو برف کے پگھلنے کی خبر دے دی اور کہا کہ ''چشمہ کا پانی نہ پینا تا کہ وہ سمندر تک پہنچ سکے''۔

ہرنوں نے پھر اُچھل کود کم کردی تا کہ وہ چشمہ کا پانی کم پئیں۔ سبھی جانتے تھے کہ ننھے چشمہ کو سمندر تک پہنچنا چاہیے تا کہ وہ سب کو سیراب کر سکے۔

ابرِسفید اتنا رویا کہ اب اس کا رونا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ ہرن اور پرندے دُبکے پڑے سوتے سوتے تھک گئے، سبزے اور پھول مرجھا گئے۔ اور سبھی ایک آواز ہوکر ننھے چشمہ کو دعا دے رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ ''خدایا! خدایا! اس فداکار چشمہ کے پانی کو شیریں بنا!''

چشمہ ہر روز میٹھا، شفّاف اور پانی سے بھرتا جا رہا تھا اور جلدی جلدی سمندر کی طرف جا رہا تھا۔

بگولہ بھی چیختا ہوا شورہ زار کو اپنے ساتھ لیے بڑھا آ رہا تھا۔

ایک دھوپ بھرے دن میں ابرِسفید نے خوش خبری دی کہ سمندر نزدیک ہے۔

ننھے چشمہ نے سمندر کی لہروں کی آوازیں سنیں اور سمندری ہواؤں کو محسوس کیا۔ سمندر کی ٹھنڈی ہوائیں اس کے بدن کو پیار سے چھو رہی تھیں۔

ننھے چشمہ نے بھی شوق سے اپنی لہریں اُٹھائیں۔ زور لگایا اور بہت تیزی کے ساتھ اپنے کو آگے بڑھایا لیکن یکا یک وہ ساکت ہوگیا اور دل ہی دل میں بولا: ''ہمیں احتیاط رکھنی چاہیے؛ ایسا نہ ہو کہ یہاں بھی کوئی مرداب ہو''۔

ابرِسفید چلّایا: ''نہیں، نہیں، مرداب نہیں ہے۔ یہاں سمندر ہے۔ جلدی کرو ننھے چشمہ''۔

حشرات نے ابرِسفید کی آواز سنی، بولے: ''بگولہ، شورہ زار! جلدی کرو''۔

چشمہ سمندر میں پہنچا۔

بگولہ، شورہ زار کے نمک کو اپنے ساتھ لیے ہوئے سمندر کے نزدیک پہنچ گیا۔

نسیم نے کہا: ''پہنچے، تیار ہو جاؤ''۔

چشمہ لہروں کی آوازیں سن رہا تھا۔ لہریں بے چین اپنے آپ کو پتھروں سے ٹکرا رہی تھیں تا کہ چشمہ کو آواز دیں۔ چشمہ نے کہا: ''نمک کے کھارے پانی کو میں محسوس کر رہا ہوں۔ آہ ابرِسفید! وہ لوگ پہنچ گئے... پہنچ گئے۔ اگر مجھ کو اپنے آپ میں لے لیا تو پھر کیا ہوگا؟ مجھے کیا کرنا چاہیے...؟''

سمندر اُدھر ہے، میں سمندر کی لہروں کی مہربان آواز سن رہا ہوں۔ مرغابیوں کو دیکھ رہا ہوں۔ آہ ابرِسفید! کہیں سمندر تک نہ پہنچ پاؤں...؟''

ابرِسفید نے کہا: ''نا اُمید نہ ہو ننھے چشمہ! خدا تمھارے ساتھ ہے، تم جتنا ہو سکے جلدی کرو۔ اب راستہ زیادہ نہیں ہے''۔

چشمہ نے التجا کرتے ہوئے کہا: ''خدا ہماری مدد کیسے کرے گا؟ ابرِسفید! خدا کہاں ہے؟''

''جہاں بھی تم نظر ڈالو گے، خدا کو تم دیکھ سکتے ہو،
بادلوں کی بارش میں،
تمھارے راستہ کے کھلے ہوئے پھولوں کی خوشبو میں،
پرندوں کی اُڑان اور آواز میں،
ہرنوں کی معصومیت میں،
بھیڑوں کی پُرسکون چَرائی میں،
کسی چشمہ کے نغمہ میں،
ہر جگہ، خدا ہر جگہ ہے''۔

ننھا چشمہ بھیڑوں کے ایک بڑے گلّہ کو تک رہا تھا جو آرام سے معصومیت کے ساتھ چرنے میں مشغول تھے۔ بے اختیار اس کا شوق بڑھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح اپنی ہی 'کل کل' کو سننے لگا اور بے اختیار تیزی سے حرکت میں آیا، اپنے آپ کو دیکھا۔ اسے

ایسا لگا جیسے کہ وہ اب سیاہ نہیں ہے، مٹ میلا بھی نہیں ہے اور بُرا بھی نہیں ہے۔ اب نہ تو اس میں کوئی بوُ ہے اور نہ رنگ۔ بے رنگ تھا، بے رنگ؛ آئینہ کی طرح صاف اور روشن۔ اب وہ اپنے سینہ میں آسمان کے خوبصورت عکس کو دیکھ رہا تھا۔ آسمان بنفشئ تھا، نیلا تھا اور سبز؛ پیلا تھا اور لال؛ ایک خوبصورت قوسِ قزح کی طرح۔

پھر وہ چلّایا: ''ابرِسفید! اے ابرِسفید! میں آسمان کو اپنے سینہ میں دیکھ رہا ہوں۔ آسمان کی رنگین کمان کا عکس مجھ پر پڑ رہا ہے؟ میری مدد کیجیے تا کہ میں سمندر تک پہنچ جاؤں''۔

ہرن اور بارہ سنگھے چشمہ کے کنارے سو رہے تھے اور اس کو انھوں نے اپنی پناہ میں لے لیا تھا۔

نسیم نے اپنے آپ کو بگولہ (گردباد) کے بیچ و بیچ جھونک دیا۔ نسیم اور بگولا کچھ دیر تک دونوں ایک دوسرے کے دست و گریبان رہے، فضا گرد و غبار سے بھر گئی۔ شورہ زار کا نمک فضا میں بکھر گیا۔ ننھے چشمہ نے پھر کچھ نہ دیکھا۔ کھلی ہوئی آنکھوں سے سمندر کے پھیلے اتھاہ پانی کو تکتا رہا۔ نہ جانوروں کو دیکھ رہا تھا نہ پرندوں کو، نہ کویر کو نہ شورہ زار کو، نہ ابرِسفید کو دیکھ رہا تھا نہ بگولہ اور نسیم کی جنگ۔

پرندے اُڑ رہے تھے اور انھوں نے خود کو معرکہ تک پہنچا دیا تھا۔ کچھ ہی لحظہ میں ہوا ساکت ہوگئی۔ گرد و غبار بیٹھ گئے۔ اب نہ نسیم کا پتہ تھا نہ گرد و غبار کا۔ صرف چشمہ تھا اور سمندر کی آواز جو ایک ہو جانے کے نغمہ کو آپس میں سن رہے تھے۔

ننھا چشمہ سمندر کی لہروں کے صرف زمزمہ کو سن رہا تھا اور دیوانہ وار آگے بڑھتا گیا۔

کنکر اور پتھر کو بکھیر دیا، سیپ اور گھونگھوں کو ایک طرف لگا دیا اور سمندر کی لطیف نمی کا احساس کیا اور انتہائی شوق سے خود کو آگے کھینچ کر لے گیا۔

وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کے پانی کے قطرے زمین پر نہیں پھسل رہے ہیں بلکہ آسمان میں پرواز کر رہے ہیں اور سمندر کی طرف جا رہے ہیں۔

یک بیک سمندر کے ذخیرہ میں غرق ہوگیا۔

ایک مرغابی سمندر کے نزدیک آئی اور اپنی لمبی چونچ سے اس کے پانی کو چکھا۔ یک بارگی خوشی سے بازو پھڑپھڑائے اور آسمان کی طرف اُڑ گئی۔

مرغابیوں کا ایک بڑا جھنڈ سطحِ آب پر نمودار ہوا۔ آبی جانور خوشی سے آوازیں نکالنے لگے اور خود کو پانی میں ڈال دیا۔ سمندر کا پانی پیا اور خدا کا شکر ادا کیا۔

اب ننّھا چشمہ ننّھا نہیں تھا، ایک سمندر کی طرح بڑا ہوگیا تھا۔ ننّھے چشمہ کو نجات مل گئی تھی۔

ابرِسفید نے سمندر کی طرف دیکھا اور اس کے بعد اس راستہ کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہا جسے ننّھے چشمہ نے اپنے پیچھے چھوڑا تھا۔

ننّھے چشمہ نے اپنے پیچھے چھوڑے ہوئے علاقہ کو سرسبز شاداب اور آباد کر دیا تھا۔ چشمہ کے اُس طویل راستہ میں اب زندگی تھی۔

خوشبودار اور تازی گھاسیں اور رنگ برنگے پھول کھلے ہوئے تھے، چشمہ کے راستہ میں ہرن، بارہ سنگھے اور پرندے اُچھل کود مچا رہے تھے اور چشمہ کا پانی پی رہے تھے۔

دُور راستہ میں بھیڑوں کا ایک بڑا سا گلّہ چر رہا تھا اور چرواہا خوشی سے بانسری بجا رہا تھا۔

ہوا، پھولوں، ہرنوں اور چرواہے کی بانسری کی آواز لیے لیے پھر رہی تھی۔

سبھی کہتے تھے خدا نے یہ چشمہ ہمارے لیے بھیجا ہے۔ خدا اس چشمہ سے راضی ہے، راضی رہے۔

ابرِسفید خوشی خوشی اُڑ گیا اور پھر آسمان میں گم ہوگیا۔

○○

مسافر

صبح سے چلتی ہوئی ٹھنڈی ہوا ہر آن تیز تر ہوتی جارہی تھی۔ بیابان کا رنگ دُھندلا چکا تھا اور فضا میں سیاہی بڑھتی جارہی تھی۔

چنار کے درخت سے بھی اوپر ایک سیاہ بگلا آرام آرام سے اُڑ رہا تھا۔

سیاہ بگلے نے کئی بار درخت کا چکّر لگایا اور سب سے اُونچی شاخ کی پُھنگی پر بیٹھ گیا۔

اُس سبز پوش مسافر کو دیکھ رہا تھا جو آہستہ آہستہ دُور بیابان کے آخری سرے پر جارہا تھا۔ اُسی نے لکڑہارے کے آنے کی خبر دی تھی۔

بگلا اُس وقت تک اسے تکتا رہا جب تک کہ وہ آنکھوں سے اوجھل نہ ہوگیا۔

پھر اس نے پوچھا: ''اے اُونچے چنار کیا تم اس کی باتوں کا یقین کر رہے ہو؟''

چنار نے کہا: پتہ نہیں شاید سچ ہی کہا ہوگا۔ میں نے اُسے نہیں پہچانا۔ یہ کوئی اجنبی تھا۔ نا آشنا تھا۔

بگلے نے بازو پھڑ پھڑائے، خود کو اپنے گھونسلے میں پہنچایا اور بولا: ''تم سچ کہتے ہو، مسافر نا آشنا تھا۔ شاید لکڑہارے کو اچھے سے پہچانا نہ ہو، شاید کسی اور پر اسے لکڑہارے کا گمان ہوا ہو''۔ پھر اس نے آہستہ سے اپنے جوڑے سے کہا: ''خدا کرے کہ ایسا ہی ہو''۔

سبز اور چمکدار اون والی بگلے کی مادہ گھبرا کر بولی: ''خدا اس بے گناہ چوزہ پر رحم کرے'' اور اُس نے ننھے چوزہ کو جو ابھی تازہ تازہ انڈہ سے باہر آیا تھا اپنے پَروں میں سمیٹ لیا۔

چوزہ سردی سے کانپ رہا تھا۔ اس نے خود کو ماں کے پَروں میں چھپالیا۔

چنار نے بگلے کی باتیں نہیں سنی تھیں، بولا: ''مجھے نہیں معلوم شاید مسافر نے سچ ہی کہا ہو، شاید لکڑہارا ابھی راستہ میں ہو۔ پتہ نہیں میری شاخیں کیوں کانپ رہی ہیں۔ سچ ہے اس سال سردی بہت جلد آ گئی ہے نا!''

بگلے نے کہا: ''میرے پیارے چنار! زیادہ غمگین نہ ہو۔ اس سخت سردی میں لکڑہارا دیوانہ نہیں ہے کہ گھر سے باہر نکلے گا''۔ اسی بیچ بگلے کی نظر سفید اور ٹیڑھے میڑھے بیابان کے راستہ پر پڑی۔ کچھ دیر تک ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ سڑک بیابان کے بیچوں بیچ مڑ جاتی اور پھر آگے بڑھ جاتی، دُور سڑک کی انتہا پر کوئی کالی چیز ہل رہی تھی اور دَم بدم بڑی ہوتی جارہی تھی۔

بگلا لرز گیا، اس نے آہستہ سے اپنی مادہ سے کہا: ''دیکھو! اس سیاہی کو دیکھو؛ تمھیں بھی وہ دِکھائی دے رہی ہے؟''

سبز بگلے نے اس نقطہ کو دیکھا اور اپنے سر کو ہلایا۔ دونوں چند لحظہ سیاہی کو دیکھتے رہے اور پھر بے اختیار انھوں نے چوزہ کو اپنے پروں میں سمیٹ لیا۔ بگلے کانپ رہے تھے لیکن چھوٹا چوزہ ہر بات سے بےخبر اپنے حال میں مگن چیں چیں کر رہا تھا۔

چنار تھوڑی دیر چپ رہا اس کے بعد اس نے پوچھا: ''کالے بگلے! کیوں خاموش ہو؟ خدا نہ کرے کہ کوئی خبر ہو!''

کالا بگلا باوجودیکہ تیزی سے کانپ رہا تھا اور اس کی چونچ بھی ہل رہی تھی، بولا: ''پتہ نہیں کیوں اس قدر مجھے سردی لگ رہی ہے۔ اُونچے چنار، تم نے ٹھیک ہی کہا، اس سال سردی بہت جلدی آ گئی۔ میں تو کانپ رہا ہوں''۔

چنار نے کہا: ''ہا... ہاں۔ میں نے کہا نا اِن ہواؤں میں برف کی مہک آ رہی ہے۔ مجھے برف کی مہک کی اچھی پہچان ہے۔ دیکھو، دیکھو، فضا کا رنگ دیکھو۔ میں یقین سے

کہتا ہوں کہ بہت جلد بھاری برف باری ہوگی۔ میری بات کا یقین کرو کالے بگلے، اگر میں اس کے بعد نہ رہوں، تمام سال...''

بگلے میں اب طاقت نہیں تھی۔ وہ اپنے آپ کو اس سے زیادہ بچا نہیں سکتا تھا اور اب وہ بہت اچھی طرح لکڑہارے کی وحشت ناک کلہاڑی اس کے کندھے پر ہلتی ہوئی دیکھ رہا تھا۔ بیچ میں چنار کی بات کو کاٹتے ہوئے وہ بولا: ''چنار، اُونچے چنار، مہربان چنار... لکڑہارا آرہا ہے۔ اُف میرے خدا! اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

چنار کی شاخیں کانپ اُٹھیں، کچھ سوکھے پتّے اس کی شاخ سے الگ ہوئے اور ہوا میں تیرتے ہوئے زمین پر آرہے۔

ہرے بگلے نے بچہ کو زیادہ ہی بھینچ لیا۔ چوزہ جو گرم ہوگیا تھا کچھ زیادہ ہی چیں چیں کررہا تھا۔

کالا بگلا اپنے گھونسلہ سے اُڑا اور اُونچی شاخ کے سرے پر بیٹھ گیا۔ لکڑہارا آرام آرام سے بڑھتا آرہا تھا۔

اپنے سر کو اس نے اُوپر اُٹھایا اور خوش ہوکر درخت پر اپنی نگاہیں گاڑ دی تھیں۔ نظر آرہا تھا۔ اس کی داڑھی گھنی، سخت اور کھچڑی تھی۔ قہوئی رنگ کی نمدی ٹوپی سے اپنے کھچڑی بالوں کو ڈھانپے ہوئے تھا۔

وہ درخت کے پاس پہنچا، کھڑا ہوا، اپنی کلہاڑی کو اپنے پاؤں کے بیچ رکھا، گہری سانس بھری اور درخت کو تکنے لگا۔ سر کو کئی بار اس نے ہلایا، پھر اس طرح جیسے اُسے کچھ یاد آگیا ہو، کلہاڑی کو بڑی احتیاط سے زمین پر رکھا۔

درخت کی طرف گیا اور ٹھنڈی زمین پر بیٹھ گیا۔ اپنی پیٹھ کو درخت کے سہارے لگایا اور اپنے سامنے کی طرف گھورتا رہا۔ اس کے بعد اس نے دوسری گہری سانس لی، اپنی چلم نکالی، بھرا اور ایک گہرا کش لیا۔ تمباکو کا دھواں آسمان کی طرف اُڑایا اور پھر وہ

سوچ میں پڑ گیا۔ اپنے آپ ہی سوچنے لگا کہ تھوڑی دیر بیٹھ جاؤں، کچھ تازہ دَم ہولوں تو اُٹھوں اور کام شروع کروں۔ اگر خدا نے مدد کی اور بازوؤں کو طاقت دی تو دوپہر تک کام ختم کرلوں گا۔ چار کلہاڑی میں ہی اس کا کام تمام ہے۔ بس چار زبردست کلہاڑی!

اس کے بعد اس نے اپنی گردن گھمائی اور ایک بار پھر درخت کے تنے کو دیکھا۔ اس بار خوشی سے اپنے سر کو ہلایا اور بولا: ''وہی؛ چار یا پانچ زبردست کلہاڑی اس کا کام تمام کردے گی، اس سے زیادہ کی ضرورت نہیں۔

چلم سے دوسرا کش لیا اور پھر بیابان اور اپنے سامنے کے آسمان کو غور سے دیکھنے لگا۔ سوچا، آج ہی کل میں برف گرے گی اور پھر کوئی پرندہ بھی اس بیابان میں پر نہیں مارے گا۔

خدا کا شکر! خدایا تیرا شکر ہے کہ تو خود ہی روزی پہنچاتا ہے۔ سچ، اگر یہ چنار بھی نہ ہوتا تو یہ بے مروّت سردی ہم کو نیلا کردیتی۔ سبھی کو پٹک دیتی۔ شاید میں تو بچ جاؤں لیکن بچوں میں جان نہیں ہے کہ وہ اس سردی کا مقابلہ کریں۔ دونوں کا دَم گھونٹ دے گی، دونوں کا ایک ساتھ۔

ایک پتّا جو دھیرے دھیرے نیچے آرہا تھا، لکڑہارے کی چلم پر گرگیا۔ لکڑہارے نے پتّے کو بڑی احتیاط سے پکڑا اور پھر اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔ پتّا رنگ برنگا تھا۔ لال بھی تھا اور پیلا بھی، کتھئی بھی تھا اور سبز بھی۔ لکڑہارا اپنے آپ سے بولا: ''گویا ابھی اس میں جان ہے''۔

ابھی اس کے پتّے سبز ہیں۔ اس کے بعد اس نے سر اُٹھا کر ایک مرتبہ پھر درخت کی شاخوں اور پتّوں کو دیکھا۔ درخت کی بعض شاخیں ابھی بڑی تھیں اور وہ کئی برس تک رہ سکتی تھیں اور وہ پھل اور پتّے بھی دیتیں۔

لکڑہارے نے تیز تیز کچھ کش لیے اور بولا: ''شیطان پر لعنت! شیطان پر لعنت! اس میں تو ابھی جان ہے، اس کی ایک شاخ بھی توڑوں تو یہ ملامت کرے گا۔ شیطان پر

لعنت! خدا نہ کرے کہ میں اسے کاٹوں اور اس کی آہ اور ملامت مجھے اور میرے بچوں کو لگے"۔

اُٹھا، کھڑا ہوا، درخت پر ایک نظر ڈالی اور پھر بیٹھ گیا۔ دوبارہ اُٹھا، کلہاڑی کو اُٹھایا، چند قدم آگے بڑھا اور پھر بیٹھ گیا۔ ایک زبردست کش لیا۔ چلم کی آگ بجھ چکی تھی۔ دیا سلائی اُٹھائی کہ چلم کو دوبارہ جلائے، لیکن وہ اسی بیچ شرمندہ ہوا اور دوبارہ دیا سلائی کو جیب میں ڈال دیا اور پھر اپنے سامنے کے بیابان کو ٹکٹکی باندھ کر تکنے لگا۔ حدِ نظر صرف بیابان ہی تھا یہاں، خشک، خالی اور ٹھٹھرتا ہوا، نہ کوئی درخت، نہ کوئی حرکت، نہ کوئی جھاڑ نہ جھنکاڑ۔ سچ ہے وہ کیسے اس سردی کو بہار تک کھینچے گا۔ اگر وہ اس چنار کو نہیں کاٹتا ہے تو سردی سے سبھی اینٹھ جائیں گے، وہ بھی اور اس کے بچے بھی۔

اتنی دیر تک وہ بیابان کو تکتا رہا کہ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں اور بیابان اسے دُھندلا دِکھائی دینے لگا۔

ناگہاں اس نے ایک آواز سنی: "بوڑھے لکڑہارے! لکڑہارے!" بے اختیار اس کی نظر اٹھ گئی۔ اپنے چاروں طرف دیکھا، کوئی نہیں تھا۔ دوبارہ یہی آواز اس کے کان سے ٹکرائی: "بوڑھے لکڑہارے!"

مڑا، درخت تھا کہ اس سے باتیں ہی کیے جا رہا تھا: "لکڑہارے، شاید تم نہیں چاہتے کہ مجھے کاٹو؟"

لکڑہارا تھوڑی دیر خاموش رہا، صرف دھیرے سے سر ہلا دیا، اس کے بعد بولا: "پتہ نہیں! پہلے میں چاہتا تھا کہ تجھے کاٹ دوں لیکن اب پتہ نہیں!

درخت نے کہا: "لکڑہارے، مجھے پتہ ہے کہ میں بھی سب کی طرح ایک دن مرجاؤں گا۔ مجھے معلوم ہے کہ ایک دن تم میری شاخوں کو کاٹ ڈالوگے۔ بس یہی خواہش ہے کہ اس آخری سردی تک مجھے چھوڑ دو۔ اس وقت تک اگر میں زندہ رہا تو ٹھیک، ورنہ میں اپنے آپ کو خود تمھارے سپرد کردوں گا"۔

لکڑہارا کچھ سوچ کر بولا: "کیوں؟ اس آخری سردی تک؟... میں... میں، بلند چنار، میرا دِل بہت چاہتا ہے کہ تمھاری خواہش پوری کردوں، مگر میں ایسا کر نہیں سکتا، کیوں کہ مجھے سردی ہی میں تمھاری ضرورت ہے"۔

چنار بولا: "لکڑہارے! مجھے اتنا موقع دو کہ میں تمھیں ایک راز کی بات بتادوں۔ جس دن خدا نے مجھے پیدا کیا اس نے تین نعمتیں عطا کیں اور اُن تین نعمتوں کے بدلے مجھ سے قول و قرار لیا۔ خدا نے مجھے سبز پتّیاں عطا کیں تاکہ میری ہری بھری پتّیاں حیوانات کی غذا بنیں۔

خدا نے مجھے نئی نئی شاخیں عطا کیں تاکہ میری شاخ اور پتّے پرندوں کے گھونسلے اور تھکے ہاروں کے لیے پناہ گاہ ہوں۔

خدا نے مجھے لکڑیاں عطا کیں تاکہ میرے مرنے کے بعد انسانوں کے گھروں کو گرمی بخشوں---مگر بوڑھے لکڑہارے، پچھلی بہار سے آج تک جس طرح خدا نے مجھ سے عہد و پیمان لیا تھا ابھی تک میں عمل نہیں کرسکا۔ اب میں پریشان ہوں۔ میں اس بات پر پریشان ہوں کہ خدا مجھ سے راضی نہیں ہوگا۔

بوڑھے لکڑہارے! ایک بے رحم شکاری نے کالے بگلے کے بازوؤں کو زخمی کردیا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کالا بگلا جنوب کی طرف جانے والے سارسوں کے جھنڈ کے ساتھ کوچ نہیں کرسکا۔ میں نے اسے قول دیا کہ آخر زمستان تک اِن دونوں بگلوں اور اس کے چوزہ کو پناہ دوں گا۔ اگر تم مجھے کاٹ دو گے تو یہ پرندے اپنے مُنھے چوزہ کے ساتھ سرگرداں اور پریشان ہوں گے۔

لکڑہارے! مجھے اتنی مہلت دو کہ مرنے سے پہلے اس ذمّہ داری کو اس طرح انجام دوں جس طرح خدا چاہتا ہے۔ اُن تینوں وعدوں میں سے یہ تنہا عہد ہے کہ میں اس پر عمل کرسکتا ہوں۔

لکڑہارے! بس اتنا رُک جاؤ کہ یہ چوزہ صرف اتنا بڑا ہو جائے کہ اُڑ سکے، اس کے بعد میں اپنی تمام لکڑیوں، شاخوں اور پتوں کے ساتھ تمھارے اختیار میں ہوں۔

بوڑھے لکڑہارے! میں تم سے التجا کرتا ہوں...''

جیسے ہی ٹھنڈی ہوا چلی اُس نے چنار کے کچھ پیلے پتوں کو اُن کی شاخوں سے توڑ دیا اور اس کو فضا میں اُڑا دیا۔ پتے بڑی بے دِلی سے فضا میں ناچتے ہوئے زمین پر آ رہے۔ لکڑہارا خاموش، پرسکون درخت اور اس سے الگ ہوئے پتے کو دیکھ رہا تھا۔ تبھی ایک کالا بگلا بازو پھڑپھڑا کر نیچے آیا اور سب سے نیچے کی شاخ پر بیٹھ گیا۔ سبز بگلا بھی گھونسلہ سے باہر اُڑا اور دوسری شاخ پر بیٹھ گیا۔ بیابان کی شدید سردی تیز سوئیوں کی طرح لکڑہارے کے بدن کو چھید رہی تھی۔ لکڑہارے کے کان ٹھنڈک سے سُن ہونے لگے۔ اس نے اپنی نمدی ٹوپی اپنے کانوں پر کھینچی۔ اس پر بھی اُسے سردی لگ رہی تھی۔

درخت پر موجود گھونسلے سے ایک بگلے کے چوزہ کی دردناک چیں چیں کی آواز آ رہی تھی گویا اسے بھی سردی لگ رہی تھی، کانپ رہا تھا اور التجا کر رہا تھا۔

سبز بگلا دوبارہ اپنے گھونسلے میں چلا گیا۔ چوزہ کی چیں چیں دھیرے دھیرے کم ہوتی گئی اور پھر بالکل بند ہوگئی۔

لکڑہارے نے ایک گہری سانس بھری، جھک کر کلہاڑی کو زمین سے اُٹھایا اور بغیر کچھ بولے چل پڑا۔

بوڑھے لکڑہارے کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرح اپنے گھر کو گرم کرے۔

○

لکڑہارے کا گھر بالکل ٹھنڈا تھا۔ ایک لڑکا، ایک لڑکی، دو چھوٹے بچے پھٹے پرانے لحاف کے نیچے کانپ رہے تھے۔ گھر کے باہر ہوا شائیں شائیں کر رہی تھی۔

اگرچہ ابھی دوپہر بھی نہیں ہوئی تھی مگر فضا تاریک ہو رہی تھی۔

چھوٹی لڑکی اپنے شانوں کو سمیٹے ہوئے تھی اور اس کے دانت بج رہے تھے اور بولی:

''یا اللہ! کاش ایک چھوٹا سا کوئلہ کا ٹکڑا اور ایک سوئی کی نوک برابر آگ ہوتی!''

چھوٹے لڑکے نے اس کی طرف دیکھا مگر کچھ بولا نہیں۔ چھوٹی لڑکی بولتی رہی:

''بھیا! یعنی تم بتا سکتے ہو کہ آج بابا کو لکڑی مل جائے گی؟''

لڑکے کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اپنی بہن کو کیا جواب دے۔ اس کا باپ کئی دن سے لکڑی لانے جا رہا تھا لیکن ہر بار خالی ہاتھ لوٹتا۔ لڑکے کو ایسا لگ رہا تھا کہ اگر اس بار بھی لکڑی نہیں ملی تو ممکن ہے کہ سردی سب کا کام تمام کر دے۔ لیکن وہ اپنی بہن سے یہ کہنا نہیں چاہتا تھا، بولا: ''آؤ آؤ، پورا لحاف اپنے چاروں طرف لپیٹ لو۔ مجھے سردی نہیں لگ رہی ہے۔ مجھے نہیں چاہیے۔ تم سب لے لو''۔

لڑکی نے ابھی اپنے بھائی کو جواب نہیں دیا تھا کہ گھر کا باہری دروازہ کھٹکا اور کھل گیا۔ لڑکا اور لڑکی چپ تھے اور ایک دوسرے کو تک رہے تھے۔ لڑکی دیوار سے چمٹ گئی۔ اس کے بھائی نے آہستہ سے کہا: ''ڈرو نہیں، ڈرو نہیں، ضرور بابا ہیں''۔

کمرہ کا دروازہ کھولا اور بوڑھا لکڑہارا داخل ہوا۔ آج بھی پہلے کی طرح خالی ہاتھ تھا۔ اتنا تھکا ہوا تھا کہ اپنے بچوں کی طرف جا کر مسکرا بھی نہ سکا۔ اس نے ایک برا سا منہ بنایا۔ کلہاڑی کو دیوار سے ٹکایا اور بچوں کی طرف چل پڑا۔ بیٹے نے چاہا کہ باپ کے سامنے مسکرائے لیکن نہ کر سکا۔

لڑکی کے دانت اسی طرح بجتے رہے، مسکرائی اور بولی: ''بابا، آج بھی خالی ہاتھ...؟''

لکڑہارے نے اپنے بچوں کے ٹھٹھرتے ہوئے ہاتھوں کو اپنے کھردرے ٹھنڈے ہاتھوں میں لیا اور دونوں کو اپنی گود میں کھینچ کر سینے سے چمٹا لیا اور وہیں زمین پر بیٹھ گیا۔

دیوار سے ٹیک لگایا اور ان کے سروں کو اپنے زانو پر رکھ کر پیار سے بالوں کو سہلانے لگا۔ دونوں کے چہرے سفید برف کے ٹکڑوں کی طرح ٹھنڈے تھے۔ لکڑہارے نے لحاف کو بچوں کے اُوپر کھینچا اور ان کو اپنی کود میں دبالیا۔ لڑکے کو ایسا لگا کہ کچھ گرم ہوگیا ہے لیکن لڑکی اسی طرح کانپ رہی تھی اور اس کے دانت کٹ کٹ کر رہے تھے۔

بوڑھے لکڑہارے کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ خود بھی اسے سردی لگ رہی تھی اور کانپ بھی رہا تھا۔ لڑکی کی آنکھوں میں بھی آنسو تھا اور وہ بات کرنا چاہتی تھی مگر نہ کرسکی۔ اس کا منہ کھلا اور پھر بند ہوگیا۔

''بولو، بولو، میری جان کیا چاہتی ہو؟''

لڑکی کے دانت اسی طرح بج رہے تھے، بولی: ''با... باب... مجھے سردی لگ رہی ہے، میں برف ہورہی ہوں...'' اور وہ بلبلا اُٹھی۔

بوڑھے کے بھی بے اختیار آنسو بہنے لگے۔ موٹے موٹے آنسوؤں کے قطرے اس کی مٹ میلی داڑھیوں پر پھسل رہے تھے۔ گھر میں لڑکی کی ہچکیوں کی آواز تھی اور باہر ہوا شائیں شائیں کر رہی تھی۔ گھر کا باہری دروازہ بار بار ہوا سے کھلتا اور دیوار سے دھڑ دھڑ ٹکراتا۔ بیابان میں گھر کے اس دروازہ کے کھلنے اور بند ہونے کی آواز گونج رہی تھی۔ لکڑہارے کی آنکھوں میں اچانک بجلی سی کوندی اور وہ کھڑا ہوگیا۔ اپنے دانتوں کو پیستے ہوئے بڑبڑایا: ''بگلے کا چوزہ ہمارے بچوں سے زیادہ عزیز نہیں ہے، چلتا ہوں چنار کے درخت کے پاس''۔

بچوں کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اُن کے بابا نے کیا کہا۔ تعجب میں پڑ گئے اور پوچھا:

''کیا ہے بابا!''

بوڑھے نے بیٹے کو دیکھا۔ ایک تلخ سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا: ''کچھ نہیں بیٹا، کچھ نہیں۔ لکڑی لینے جارہا ہوں؛ پوری سردی کے لیے۔ تم لوگ گھر میں ہی رہو، جب تک

میں لوٹ کر نہیں آتا تم لوگ گھر سے نہ نکلنا۔ اگر نکلو گے تو سردی لگ جائے گی۔ نہ بیٹھنا، نہ سونا، کھڑے رہو اور چلتے رہو، ٹہلتے رہنا، اُچھل کود کرنا، اگر بیٹھ گئے تو جم جاؤ گے، جانِ پدر!''

لکڑہارے نے کلہاڑی کو اپنے کندھے پر رکھا، جوتا پہنا اور چل پڑا۔

○

برف دھیرے دھیرے گر رہی تھی۔ کالا بگلا چند نازک شاخوں سے اپنے گھونسلے کو چھپا رہا تھا کہ چوزہ کے سر پر برف نہ گرے۔

چنار کو دھیرے دھیرے نیند آرہی تھی۔ وہ سونے جارہا تھا تین مہینے کے لیے کہ پھر وہ بہار میں جاگے اور دوبارہ سبز و شاداب ہوجائے۔

بگلا اسی طرح اپنا کام کرتا جارہا تھا اور پھر بولا: ''بلند چنار تم سوگئے؟''

چنار نے کہا: ''نہیں ابھی جاگ رہا ہوں مگر دھیرے دھیرے مجھے نیند آرہی ہے''۔

بگلے نے کہا: ''میں تم سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں''۔

چنار نے کہا: ''پوچھو''۔

بگلا بولا: ''سچ! چاہتا ہوں میں کہ یہ پوچھوں کہ... اے اُونچے چنار! کیا تم موت سے ڈرتے ہو؟''

چنار نے سوچ کر جواب دیا: ''نہیں، ڈروں کیوں؟ موت حق ہے اور سب کے لیے ہے''۔

''مگر جب لکڑہارا آیا تو تم کانپ رہے تھے''۔

''ہاں میں کانپ رہا تھا''۔

''کیوں؟''

چنار کچھ نہیں بولا۔

بگلے نے کہا: ''ناراض مت ہو اُونچے چنار، سچ، میں بھی اسی لکڑہارے کے بارہ میں سوچ رہا تھا، میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ مسئلہ بہت وحشت ناک ہے۔ افسوس اگر کہیں ایسا ہی ہوجائے کہ لوگ تمھیں کاٹ لے جائیں اور جلادیں! اُف، کتنا بھیانک ہوگا''۔

چنار کچھ رُک کر بولا: ''مگر کالے **بگلے**، موت کے بعد جل جانا ہی میری آرزو ہے۔ یہ بھی خدا کے ساتھ میرا ایک عہدوپیمان ہے۔ میں اس لیے...'' اس نے چاہا کہ وہ کہہ دے ''سچ میں تمھارے لیے پریشان تھا، تمھارے چوزہ کے لیے اور اپنے اس وعدہ کے لیے جو میں نے خدا کے ساتھ کیا ہے'' لیکن وہ کچھ بولا نہیں، چپ رہا۔

بگلے نے کہا: ''میرے عزیز چنار، شاید میں نے تم کو رنجیدہ کردیا، مجھے معاف کردو!''

چنار کے درخت نے **بگلے** کو اپنی محبت بھری شاخوں سے سہلایا اور کہا: ''نہیں، نہیں کالے **بگلے**۔ میں اصلاً ناراض نہیں ہوں۔ میں نے موت کے بارے میں غور وفکر کیا ہے۔ ہر سردی کے موسم میں جب میں سونا چاہتا تھا اور ہر بہار کی فصل میں جب میں نیند سے اُٹھتا تھا تو موت ہی کے بارے میں سوچتا تھا۔

کالے **بگلے**! میں جتنا ہی سوچتا ہوں اُتنا ہی دیکھتا ہوں کہ میں خدا کی مرضی کے مطابق نہیں جی رہا ہوں۔ اب صرف یہی ایک آرزو ہے کہ میری موت بے فائدہ نہ ہو۔ اب تو بس میری آرزو یہی ہے کہ میری موت اور میرا جلنا ایک ساتھ ہو۔ میرے جلنے سے محروم لوگوں کے گھروں میں روشنی اور گرمی پہنچے۔ کتنا بہتر ہوتا کہ وہ گھر کسی بوڑھے اور فقیر لکڑہارے کا ہوتا...''

ابھی چنار کی باتیں ختم نہیں ہوئی تھیں کہ ہرا بگلا چیخا اور بولا: ''آہ، لکڑہارا! لکڑہارا آرہا ہے''۔

کالا بگلا اپنے گھونسلہ میں بیٹھ گیا اور اس نے لکڑہارے کو دیکھا۔

لکڑہارا بڑی تیزی سے نزدیک آرہا تھا۔ کندھے پر کلہاڑی رکھے ہوئے اور پکّے ارادہ کے ساتھ، جلدی جلدی قدم بڑھا رہا تھا۔ دُور ہی سے اُس نے سر اُٹھایا اور درخت کو دیکھنے لگا۔

برف سے اس کے بال اور ٹوپی ڈھکے جارہے تھے۔ درخت کے نیچے پہنچا، کھڑا ہوا اور ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا۔ بہت احتیاط سے کلہاڑی کو زمین پر رکھا۔ اپنا ہاتھ اپنی پیشانی پر رکھا اور پھر اطمینان سے اپنے چہرہ پر پھیرا۔ اپنی ٹوپی اُتاری۔ برف کو جھاڑا اور پھر اپنے سر پر رکھ لیا۔ اس کو خود بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے۔

کالا بگلا اپنے گھونسلہ سے اُڑا اور نچلی شاخ پر بیٹھ گیا۔ **بگلے** کا چوزہ بہت درد اور منّت سے چیں چیں کر رہا تھا۔ لکڑہارے نے دوبارہ اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرا، گویا برف کے چھوٹے سے چھوٹے ریزے کو صاف کر رہا ہو، پھر سر اُٹھایا۔ غمگین اور گرفتہ آواز میں بولا: ''کوئی چارہ نہیں ہے۔ میرے بچے جم رہے ہیں۔ مجھے لکڑی کی ضرورت ہے''۔

یک بیک بیابان جیسے ساکت ہوگیا ہو۔ ہوا بھی ٹھہر سی گئی۔ چنار بھی بے حرکت اور **بگلے** کا چوزہ بھی چپ ہوگیا۔ اس وسیع بیابان میں صرف برف کے موٹے موٹے دانے تھے، جن میں حرکت تھی اور چنار کی شاخ پر جم رہے تھے۔ برف دھیرے دھیرے بغیر کسی آواز کے نیچے آرہی تھی اور چنار کی شاخوں اور بگلوں کے گھونسلوں کو ڈھک رہی تھی۔

لکڑہارے کی سانس رُک رہی تھی۔ یہ بات کہنے کے بعد وہ ڈر رہا تھا کہ اب سانس بھی کیسے لے۔ کالا بگلا شاخ سے اُڑا اور بوڑھے لکڑہارے کے سامنے زمین پر گری برف پر بیٹھ گیا اور بولا: ''بوڑھے لکڑہارے، ہماری فکر مت کرو۔ ہم جاسکتے ہیں اور آخر اپنے جینے کے لیے کوئی جگہ ڈھونڈ ہی لیں گے''۔

لکڑہارا بولا: ''پھر درخت کا کیا ہوگا؟''

''لکڑہارے درخت خود راضی ہے۔ اصلاً اس کی آرزو یہی ہے''۔

لکڑہارے نے اسی غمگین لہجے میں کہا: ''مگر ابھی نہیں، ابھی نہیں۔ ابھی تو اس کی برسوں عمر باقی ہے اور تم بھی اس وقت اپنے لیے کوئی جگہ تلاش نہیں کر سکتے۔ میں اطراف میں تمام گھوم چکا ہوں۔ میلوں راستہ میں کوئی درخت نہیں ہے''۔

بگلے نے کہا: ''اس طرف کیسا ہے؟ مشرق کی طرف، جہاں سورج نکلتا ہے''۔

''کیا فرق پڑے گا، یہاں ہر طرف بیابان ہے۔ اُدھر بھی اِسی طرح ہے۔ ہر جگہ ایک ہی جیسی ہے۔

---حتیٰ کہ ایک آبادی بھی نظر نہیں آ رہی ہے۔ تم کہاں جاؤ گے؟ کہاں گھونسلہ بناؤ گے؟''

بگلے نے کہا: ''اتنے نا اُمید مت ہو لکڑہارے! ہم جب اُڑیں گے اور اُوپر سے دیکھیں گے تو شاید کوئی درخت مل ہی جائے جہاں ہم پوری سردی مہمان رہ سکیں''۔

قبل اس کے کہ لکڑہارا کچھ بولے ہرا بگلا بازو پھڑپھڑاتا ہوا نیچے اُترا اور ایک شاخ پر بیٹھ کر بولا: ''نہیں نہیں کالے بگلے، تم جانتے ہو تم کیا کہہ رہے ہو؟ اگر ہمارے چوزے کو سردی لگ گئی تو پھر؟ ہمارے چوزے کے بارے میں تم نے کچھ سوچا۔ تم اس زخمی بازو کے ساتھ کیا اُڑ پاؤ گے؟''

کالا بگلا اُڑا اور اپنے جوڑے کے پاس آ کر بیٹھ گیا اور بولا: ''ہاں میں اُڑ سکتا ہوں۔ اگر راستہ دُور نہ ہو تو میں یہ کام کر سکتا ہوں۔ ہمارے چوزے میں بھی سردی کو سہنے کی طاقت اب زیادہ ہے۔ ہم اس کو اپنے بازوؤں میں گرم رکھ سکتے ہیں، لیکن لکڑہارے کے بچوں کا کیا ہوگا؟ ہرے بگلے! ہم تو پھر بھی موسمِ بہار میں انڈے دے سکتے ہیں اور بچہ والے ہو سکتے ہیں، اگر ہم یہاں سے چلے گئے تو چنار بھی اپنی آرزو کو پہنچ جائے گا اور لکڑہارا بھی اپنے گھر کو گرم رکھ سکتا ہے''۔

ہرے بگلے نے اپنی چونچ کھولی اور چاہا کہ کچھ بولے کہ اسی بیچ کالے بگلے نے غمگین لہجے میں کہا: ''ہرے بگلے خدا کے لیے!''

ہرا بگلا روتے ہوئے اپنے گھونسلہ تک پہنچا۔ اپنے چوزہ کو اپنے پروں میں سمیٹا اور ایک غمگین نغمہ گنگنانے لگا۔

ہرے بگلے کا نغمہ اتنا غمگین تھا کہ لکڑہارے نے بے اختیار اپنے سر کو جھکا لیا۔

درخت جو اَب تک خاموش تھا بول پڑا: ''میرے ہمسایو! کیا تم جا رہے ہو؟''

کالا بگلا ہرے بگلے کے پہلو میں بیٹھا تھا اور بولا: ''مہربان چنار خدا حافظ! تم ہمارے لیے اچھے پڑوسی تھے۔ ہم نے برسوں تمھاری شاخ پر گھونسلہ بنایا اور تم نے ہم کو محبت سے اپنی شاخوں کے درمیان پناہ دی۔ اے پیارے چنار! اب رخصت کا وقت ہے۔ میں اور ہرا بگلا اور یہ بے زبان چوزہ ہم سب یہ دعا کریں گے کہ اب جب بہار آئے تو تم میں نئی نئی شاخوں کے ساتھ کونپلیں پھوٹیں اور دوبارہ سرسبز اور شاداب زندگی گذاریں۔ مہربان چنار خدا حافظ! بوڑھے لکڑہارے خدا حافظ!''

شفاف آنسو کالے بگلے کی آنکھوں سے ٹپک گئے اور اس کے چہرہ کو نم کر دیا۔

درخت نے محبت و مہربانی سے اپنی شاخوں کو بگلوں کے پر و بال پر پھیرا۔ کالا بگلا بھی ہرے بگلے کے ساتھ گانے لگا اور ان کی غمگین آواز خاموش بیابان میں پھیل گئی۔

لکڑہارے نے جب سر اُٹھایا کہ وہ اپنی اشک آلود آنکھوں سے بگلوں کو رخصت کرے تو دیکھا کہ گھونسلہ خالی ہے اور چنار کی بلندی سے ہرے اور کالے دو بگلے اپنے چھوٹے چوزے کے ساتھ اُڑ رہے تھے اور دُور ہوتے جا رہے تھے۔ بگلے چلے گئے۔ چلے گئے۔ چلے گئے۔ یہاں تک کہ دو سیاہ نقطوں کی شکل میں نظر آتے رہے اور پھر دھیرے دھیرے غائب ہو گئے۔

○

ہوا پھر سے تیز تیز چلنے لگی تھی اور برف کو دائیں بائیں گھما کر فضا میں بکھیر رہی تھی۔ درخت کی شاخیں کانپ رہی تھیں اور سرسر کی آوازیں نکال رہی تھیں جیسے چنار بھی مہاجر بگلوں کے لیے گنگنا رہا ہو۔

لکڑہارے نے درخت کا سہارا لیا۔ اس کے پیر بوجھل تھے۔ وہ بے حالی میں بیٹھ گیا۔ اپنے سر کو دونوں ہاتھوں کے درمیان لے لیا اور پھر سوچنے لگا۔ برف باری تیز ہو رہی تھی۔ اس کے ہاتھ اور سر برف سے ڈھک گئے۔

درخت نے اپنے کو سنبھالا اور بولا: ''بوڑھے لکڑہارے! میں تیار ہوں!''

لکڑہارے نے اپنے دونوں ہاتھوں کو سر سے ہٹایا اور بیابان کی طرف ایک ٹک دیکھنے لگا۔ سامنے گرتی ہوئی برف کی ایک وسیع چادر نے بیابان اور آسمان کو ڈھک لیا تھا۔

درخت دوبارہ بولا: ''لکڑہارے کلہاڑی اُٹھاؤ، میں تیار ہوں''۔

لکڑہارا اُٹھا، تھکے قدموں سے کلہاڑی کے پاس گیا، برف کو کلہاڑی سے ہٹایا اور درخت کو تکنے لگا۔

اس نے چاہا کہ کلہاڑی اُٹھائے؛ لیکن ایسا نہ کر سکا۔ درخت بولا: ''لکڑہارے! قبل اس کے کہ تم مجھے کاٹو، میں چاہتا ہوں کہ تم مجھ سے ایک پیمان کرو۔ میں چاہتا ہوں کہ تم سے ایک وصیت کروں''۔

بوڑھا لکڑہارا چاہتا تھا کہ کچھ بولے مگر اس کا گلا رُندھا ہوا تھا۔ چنار بولا: ''تمھیں پتہ ہے، برسہابرس سے مسافر اس سڑک سے صرف میری اُمید میں گذرتے ہیں۔ بوڑھے لکڑہارے مجھے قول دو کہ میری ایک ہری شاخ کو اپنے گھر پر بہار تک محفوظ رکھو گے اور جب بہار آئے گی تو اُسے اسی جگہ میرے کٹے ہوئے تنے کے پاس لگا دو گے۔ لکڑہارے، اس شاخ کی دیکھ بھال کرنا، تا کہ میرے مرنے کے بعد ایک ہرا بھرا چنار دوبارہ اسی جگہ کھڑا ہو جائے۔ لکڑہارے! کیا تم مجھے قول دیتے ہو؟''

لکڑہارا بولا: ''اُونچے چنار، میں تمھیں قول دیتا ہوں''۔

چنار بولا: ''تو پھر شروع کرو''۔

لکڑہارے نے کلہاڑی اُوپر اُٹھائی اور پھر نیچے رکھ دی۔ اس کے دل کی آواز نے اسے کلہاڑی چلانے نہ دیا۔

باوجودیکہ برف گر رہی تھی پسینہ نے اس کا چہرہ اور داڑھی نم کر دیا تھا اور وہ تیز تیز سانس لے رہا تھا۔

درخت نے پھر کہا: ''لکڑہارے! کھڑے کیوں ہو۔ موسم ٹھنڈا ہوتا جا رہا ہے۔ تمھیں اپنے گھر جلدی پہنچنا چاہیے، تمھارے بچے منتظر ہیں''۔

چنار نے کہا: ''لکڑہارے! میری خواہش بھی ہے اسی طرح سے مرنے کی۔ یا اللہ! کام تمام کر لکڑہارے! آنکھیں بند کرو اور کلہاڑی اُٹھاؤ''۔

لکڑہارے نے آنکھیں بند کیں اور کلہاڑی اُٹھائی، لیکن ایسا نہ کر سکا، اس کے ہاتھوں میں جان ہی نہ تھی۔ گویا بگلوں کے اُڑ جانے سے لکڑہارے کے ہاتھوں کا دَم ہی نکل گیا تھا۔

لکڑہارے نے اپنی آنکھیں بند کیں۔ اس کے ہاتھ فضا میں تھے اور اس کا دِل دھڑک رہا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔

دوبارہ اس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔ اس کا گلا رُندھا جا رہا تھا۔ شاید اندر اندر رو رہا تھا۔ کہہ رہا تھا، خدایا! میں کیا کروں؟ کیا کروں؟ تو میری مدد کر۔ وہ رو پڑا اور بے اختیار اس کے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے۔ کلہاڑی اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر زمین پر گر پڑی۔ کلہاڑی کے گرنے کی آواز بیابان میں گونجی۔ کسی نے اس کو آواز دی: ''لکڑہارے، لکڑہارے، بوڑھے لکڑہارے!'' شاید کسی اجنبی بوڑھے کی آواز تھی۔ سوچا شاید اسے وہم ہے۔ اس نے کان لگایا، دوبارہ آواز آئی --- ''لکڑہارے!''

آنکھیں کھولیں۔ایک سبز پوش مسافر کو دیکھا، وہی مسافر جس نے لکڑہارے کے آنے کی خبر چنار کو دی تھی۔

لکڑہارا اپنی کول کول آنکھوں سے مسافر کو تکتا رہا۔اسے یاد نہیں آ رہا تھا کہ اس سے پہلے اسے کہیں دیکھا ہے؟

اس کی گھنی داڑھی اس کے سینہ کو ڈھکے ہوئے تھی--- برف سے بھی زیادہ سفید اور چشمہ کے پانی سے زیادہ شفاف تھی۔گویا کہ سینکڑوں سال سے وہ جی رہا تھا، ان سب کے باوجود اس کی آنکھیں ابھی جوان تھی؛ دو چمکدار ستارے کی طرح اس کے چہرے پر چمک رہی تھیں۔

مسافر نے اپنی چمکدار آنکھیں لکڑہارے کی آنکھوں میں ڈال دیں۔لکڑہارا سمجھ نہ پایا کہ کیا کہے۔مسافر نے کہا: ''لکڑہارے، شاید تم اس درخت کو کاٹنے جا رہے ہو؟''

''...نا، نا... نہ کاٹو، لکڑہارے اسے نہ کاٹو۔اس درخت میں ابھی جان ہے۔ اس کی جان نہ لو''۔

ضعیف مسافر کی آواز کھنکتی ہوئی اور گرجدار تھی لیکن محبت میں ڈوبی ہوئی۔آواز لکڑہارے کے کان میں گونجی۔لکڑہارے کا دل دھڑکنے لگا، اس کی زبان بند ہوگئی۔

ضعیف مسافر دوبارہ بولا: ''لکڑہارے اس کی زندگی نہ لو۔اسے چھوڑ دو کہ یہ درخت بچ جائے۔چھوڑ دو کہ یہ درخت مسافروں کو سایہ اور پرندں کو آشیانہ دے سکے۔

بوڑھے لکڑہارے، چھوڑ دو تا کہ دوسرے زخمی اور خوں آلود بگلے اس طوفانی فضا میں بیابان میں سرگرداں نہ ہوں۔

زخمی اور خوں آلود بگلے؟ آہ...! نہیں، بگلے! تم نے انھیں دیکھا ہے؟ کہاں؟ (اے بوڑھے مسافر!)''

''ہاں، ہاں لکڑہارے، میں نے تھوڑی دیر پہلے اسے بیابان میں دیکھا تھا۔وہ طوفان میں سرگرداں تھے۔اے کاش کہ وہ جانتے کہ ایک بلند چنار اس بیابان میں ہے۔اس وقت وہ ضرور بچ جاتے''۔

لکڑہارے کے دل پر ایک غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا اور اس کا دل تڑپنے لگا۔

''یعنی اب بگلے اس فضا میں...آہ، نہ...''

بجھی ہوئی آواز سے پوچھا: ''بگلے کدھر گئے ہیں؟''

اس وقت ضعیف مسافر کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی اور اس نے دھیرے سے سر ہلایا اور کہا: ''لکڑہارے، خدا تم سے راضی ہو۔

اِدھر سے جاؤ؛ پورب کی طرف۔اس درخت کو چھوڑ دو اور جاؤ۔شاید وہ تمھیں مل جائیں۔اگر بگلے تمھیں مل جائیں تو انھیں اپنے گھر لے جاؤ، شاید خدا ان بگلوں اور اس درخت کی خاطر تمھارے گھر میں روشنی اور گرمی عطا کرے''۔

لکڑہارا حیرت زدہ ہوکر اپنے آپ سے بولا: ''گرمی اور روشنی؟''

ضعیف مرد نے دوبارہ سر کو ہلایا اور آہستہ سے کہا: ''لکڑہارے، اس کے بعد تم کو پتہ چلے گا''۔

وہ دھیمے سے سر ہلاتے اور مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

لکڑہارے نے کچھ کہنا چاہا لیکن کہہ نہ سکا اور اس کا منہ کھلا رہ گیا۔اس کی آنکھیں اس سبز پوش ضعیف مسافر پر ٹکی رہیں اور وہ دھیرے دھیرے نظروں سے دُور ہوتا گیا۔

لکڑہارے کے پاؤں میں اگرچہ اب طاقت نہ تھی اور نہ ہی چلنے کا یارا تھا۔ برفانی طوفان تھا کہ بڑھتا ہی جا رہا تھا، برف کے بڑے بڑے اولے لکڑہارے کے سر اور چہرہ پر تازیانے کی طرح پڑ رہے تھے۔پھر بھی وہ چلتا رہا۔بگلوں کا کہیں کوئی پتہ نہ تھا۔

جیسے زمین نگل گئی یا آسمان... وہ سوچتا رہا: ''بے چارے جانور شاید اس برف کے نیچے دفن ہوگئے ہوں''۔

لکڑہارا دھیرے دھیرے مٹی کے ٹیلے کی طرف پہنچ رہا تھا۔ ٹیلہ جو اور بیابانوں کی طرح خشک اور خالی تھا، اُسے بھی برف نے ڈھک کر سفید کردیا تھا۔ وہ نا اُمید ہوکر پلٹا اور سوچنے لگا: ''اسی ٹیلہ سے ہی اُوپر جاؤں شاید وہ مل جائیں ورنہ پھر لوٹ جاؤں گا''۔

ٹیلہ سے اُوپر گیا۔ بلندی پر کھڑا ہوا۔ ایک لمبی سانس لی۔ اس کا دَم گھٹ رہا تھا۔ سانس مشکل سے لے رہا تھا۔ سوچا، کاش گھر ہی پر رہا ہوتا۔ کرسی کے نیچے بن ماں کے بچوں کو دونوں طرف سے بغل میں دبائے انھیں کہانی سناتا، پھر چلم نکالتا، اسے بھرتا اور اس کے دھوئیں کو کمرہ میں اُڑا دیتا۔

بے اختیار اس نے سانس لی اور دھویں کی طرح بھاپ اس کے منہ سے نکل کر فضا میں بکھر گئی۔

اپنے آپ سے بولا: ''لکڑہارے، لکڑہارے، ہوش میں آ۔ تیرا دَم گھٹ رہا ہے۔ تو آخری مرحلہ پر پہنچ رہا ہے، امروز و فردا میں بارِ سفر بندھ جائے گا۔ ہوش میں آ۔ تیری زندگی کے یہ جو دو دن بچے ہیں اسی میں خدا کو خوش کرلے''۔

گہری سانس لی اور پلٹ گیا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا، تاحدِ نظر بیابان ہی بیابان تھا، جسے برف کی سفید چادر نے سر سے پیر تک ڈھک لیا تھا۔ برف کے درمیان قدموں کے نشان کا ایک باریک راستہ بنا ہوا تھا۔ برف دھیرے دھیرے ان قدموں کے نشان پر گرتی جارہی تھی اور انھیں بھی مٹا رہی تھی۔

وہ دوبارہ ٹیلے کی بلندی کی طرف لوٹ پڑا۔ سرے پر پہنچ کر کھڑا ہوا۔ اپنے چاروں طرف دیکھا۔ یک بیک تعجب سے اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ اُس طرف ٹیلے کے نیچے کئی درختوں کی سوکھی ڈالیں ساکت و بے حرکت

ایک دوسرے سے اُلجھی ہوئی کھڑی تھیں۔ اسے سبز پوش مسافر کی بات یاد آگئی اور بولا: ''تعجب ہے کہ اب تک اس نے اس ٹیلے کے پیچھے کیوں نہیں دیکھا تھا''۔

جلدی جلدی دوڑتا ہوا وہ درختوں کے پاس گیا اور وہیں کھڑا ہوگیا۔ درخت اتنے زیادہ تھے کہ پوری سردی اس کے گھر کو گرم رکھتے۔ ایک درخت کے تنے کو اس نے چھوا۔ بالکل سوکھا تھا۔ جیسے برسوں پہلے یہ سوکھ چکا تھا۔

دوسرے درخت بھی کچھ اسی طرح تھے، کھوکھلے، سوکھے اور بے جان۔ لکڑہارا خوشی سے درختوں کو دیکھتا رہا کہ اسی اثنا میں سوکھے درختوں کی جڑ میں دو سیاہ دھبے نظر آئے۔ وہ اس طرف گیا۔ دو پرندے تھے۔ دو چھوٹے بگلے، ایک ہرا اور ایک کالا۔ برف نے ان کے بدن کے کچھ حصوں کو ڈھک دیا تھا: ''آہ... نہیں... مسافر بگلے!...'' چند لحظہ کے لیے گویا سکتہ میں آگیا، پھر اپنے کو سنبھالا، اور حیرت کے عالم میں بیٹھ گیا۔ کالے بگلے کو برف سے نکالا، اس کے پروں پر لگی ہوئی برف کو صاف کیا، بگلے کے بدن میں گرمی بالکل نہیں تھی۔ ٹھنڈا، بالکل ٹھنڈا پڑا تھا۔ لکڑہارے نے اس کے زخمی بازو کو بہت احتیاط سے برف کے نیچے سے نکالا، بگلے کے بازو کا زخم کھل گیا تھا۔ خون خشک ہوکر اس کے زخم کے اِردگرد جم گیا تھا۔ لکڑہارے نے کالے بگلے کو احتیاط سے زمین پر رکھا، اس کے خون سے برف سرخ ہوگئی تھی اور اسی طرف تھوڑی دُور پر ہرا بگلا بھی بے حس و حرکت پڑا تھا اور برف کے نیچے ڈھکا جارہا تھا۔ لکڑہارے کی آنسو بھری آنکھیں ان بے گناہ بگلوں کو تک رہی تھیں۔ معصوم بگلے جو اپنے قافلہ سے پیچھے رہ گئے تھے اور اب برف میں اپنی جان گنوا رہے تھے۔

اس نے محسوس کیا کہ سبز بگلے کے بازوؤں کے نیچے کچھ حرکت ہورہی ہے۔ اس نے جلدی جلدی برف ہٹائی۔ ہرے بگلے کا بدن ابھی گرم تھا، اور اس کے بازوؤں کے نیچے چھوٹا چوزہ ہل رہا تھا۔ لکڑہارے کا گلا خوشی سے رُندھ رہا تھا۔ چوزہ اور سبز بگلے کو

اپنے ہاتھوں میں لیا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اسے پیار سے اپنے ہاتھوں میں دبائے۔ بگلوں کو اپنے سینے سے لپٹایا اور بے اختیار آنسو بہنے لگے۔ جیسے کہ بگلے اس کے اپنے بچے تھے۔ گویا اس نے اپنی چھوٹی بیٹی اور اپنے بیٹے کو گود میں دبایا ہو۔

سبز بگلے کا بدن ٹھنڈا ہو رہا تھا اور چوزہ شدت سے کانپ رہا تھا اور چیں چیں کر رہا تھا۔ لکڑہارا چوزے کو اپنے چہرہ کے برابر لایا۔ چوزہ اور بھی زور زور سے چیں چیں کرنے لگا۔ لکڑہارا رُندھی ہوئی آواز سے بولا: ''اے بچہ! ڈرو نہیں، ڈرو نہیں۔ میں تمھیں اپنے گھر لے جاؤں گا، تمھیں زندہ رہنا چاہیے، بڑا ہونا چاہیے، تم اس فدا کار بگلے کی یادگار ہو جس نے اپنی جان قربان کر دی''۔

○

بہار اپنی تمام تازگی اور تراوٹ کے ساتھ یعنی نیلے نیلے آسمان پر چمکتے ہوئے سورج، بیابان کے خودرو لہلہاتے سبزے، صبح کی رُوح افزا نسیم اور شبنم کی خنکی کے ساتھ آ چکی تھی۔

لکڑہارا کندھے پر بیلچہ رکھے ہوئے اپنے دو شاد و خرم بچوں اور ایک جوان بگلے کے ساتھ جو اس کے سر پر پرواز کر رہا تھا، بیابان کی طرف جا رہا تھا۔

اس جوان بگلے کا سر سبز تھا اور اس کا بازو سیاہ۔

لکڑہارا اُچھلتے کودتے بچوں اور جوان بگلے کی اُڑان کو دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ اُن کے پیچھے پیچھے ایک سبز بگلا بھی اُڑتا ہوا آ رہا تھا۔ وہ دونوں آہستہ آہستہ سڑک کے کنارے پہنچ رہے تھے، وہیں جہاں اُونچا چنار تھا۔

جوان بگلا مستی کے عالم میں گا رہا تھا۔ بازوؤں کو پھڑپھڑاتے ہوئے چنار کی شاخوں اور پتوں میں چھپ گیا۔ چنار اب سرسبز و شاداب تھا اور نسیم بہاری کے جھونکے

اسے جھولا جھلا رہے تھے۔ جوان بگلا شاخوں کے درمیان اسی پرانے گھونسلہ پر بیٹھ گیا اور گانے لگا۔ یہ وہی گھونسلہ تھا جو کبھی کالے بگلے کا آشیانہ تھا۔

لکڑہارا باوجودیکہ خوشی سے سرہلا رہا تھا، لیکن پریشانی میں چیخ کر بولا:

''جوان بگلے، گھبرانا نہیں۔ مہاجر بگلے آج ہی کل میں آ پہنچیں گے''۔

چنار کے ملائم پتوں کی سرسراہٹ نے لکڑہارے کی اس فریاد کو جوان بگلے تک پہنچنے نہ دیا۔

○

لکڑہارا چند لحظہ بگلے کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہا اور پھر اس نے میٹھے میٹھے احساس کے ساتھ ایک لمبی گہری سانس بھری۔

بیلچہ کو تازی نم مٹی میں گاڑا اور بولا: ''بچو، آؤ میری مدد کرو۔ اس درخت کے چاروں طرف ایک پتلی سی نہر کھودیں، اس درخت کو سیراب کریں۔ اسے کبھی پیاسا نہیں رہنا چاہیے۔ یہ درخت برسہابرس مسافروں اور ہجرت کرنے والے بگلوں کی پناہ گاہ رہے گا''۔

اسی بیچ ہرا بگلا بھی خوشی سے گاتا ہوا سرسبز چنار کے پتوں اور اس کی شاخوں میں پنہاں ہوگیا۔

○○

اس رات بی بی ہماری مہمان تھیں

شب تھی، زبردستی اپنی آنکھوں کو میں نے کھولا۔ ابھی جمائی بھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ والد صاحب کی 'ہاں، نہیں' شروع ہوگئی۔

''اُٹھو، مصطفیٰ اُٹھو، جاؤ بی بی کو آواز دو، سحری کے لیے یہاں لے آؤ''۔

نیند میں میں نے پوچھا: ''سحری میں ہے کیا؟''

''جو کچھ بھی ہو، اُٹھو، جاؤ اور جلدی واپس آؤ''۔

میں نے کہا: ''اگر پلاؤ نہیں ہوگی تو میں نہیں جاؤں گا''۔

اُنھوں نے کہا: ''اُٹھو، باتیں زیادہ نہ کرو، ابھی اذان ہوجائے گی... ہے، پلاؤ ہے''۔

اصلاً مجھ میں حوصلہ نہیں تھا کہ میں جاؤں۔ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا تھا۔ جب کبھی کوئی اچھا کھانا پکتا تھا یا ہوتا تھا، بی بی کو ہم لوگ خبر کردیتے تھے۔ لانے اور لے جانے کا کام بھی میرے ہی سر ہوتا تھا۔ اس کا یہ مطلب نہ تھا کہ مجھے بی بی سے محبت نہ تھی۔ نہیں، مجھے وہ بہت عزیز تھیں، اور کیوں نہ ہوتیں بہرکیف وہ ہمارے والد کی دادی تھیں۔ وہ آنکھوں سے معذور تھیں مگر میری دلجوئی بھی خوب کرتی تھیں۔ جب بھی میں اُن کے پاس جاتا، الماری میں اِدھر اُدھر ڈھونڈتیں، پھر نُقل، مصری، مغزیات اور دیگر کھانے پینے کی چیزیں لے کر آتیں اور کہتیں کھالو، تندرست ہوجاؤ، بس تمھیں تو ایک ہو جو دادی کے کام آتے ہو۔ آخری عمر کے عصا ہو۔ ان سب کے باوجود میرے اندر حوصلہ

نہیں تھا کہ آدھی رات کو میں چل پڑوں اور اُس کوچہ میں جاؤں، اور گلیوں سے گذرتا ہوا انھیں آواز دوں، وہ بھی اس تاریکی میں جب ہاتھ کو ہاتھ دِکھائی نہ دے۔

میں نے پوچھا: ''سائیکل سے جاؤں؟''

''جاؤ بھی۔ جس طرح سے جانا چاہو، جاؤ''۔

میری والدہ بیچ میں بولیں: ''نہیں، ضروری ہے کہ آدھی رات میں سائیکل سے جاؤ! اس اندھیرے میں تمھیں کچھ نظر تو آئے گا نہیں، گڑھے میں گر جاؤ گے اور خود کو شدید چوٹ لگاؤ گے''۔

میں نے کہا: ''روشنی ہے، گاڑی بھی ہے، ورنہ میں نہیں جاؤں گا''۔

والد نے اونہہ کہہ کر کے کہا: ''جاؤ بھی بابا۔ ابھی صدام آجائے گا اور سارا کام معطل ہوجائے گا''۔

اچھا ہوا کہ میرے بھائی نہیں جاگ رہے تھے ورنہ وہ بہت غصّہ ہوتے اور مجھے ہرگز نہیں چھوڑتے۔ میں کتنا ہی کہتا رہتا وہ مجھے دو چپت لگاتے اور کمرہ کے کونہ میں بٹھادیتے کہ اب آگے کبھی ایسی خواہش ہی نہ کروں۔

امّی گئیں بھائی کو جگانے کے لیے اور میں بہت تیزی سے بابا کی سائیکل لے کر فرار ہوگیا۔

○

دادی اسی طرح بیٹھی تسبیح کے دانے پھیر رہی تھیں۔ میں نے کہا: ''دادی جان جلدی کیجیے''۔

وہ بولیں: ''میں نے کہا... نا، میں نہیں جاؤں گی۔ میری جان تم واپس جاؤ۔ میرے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ آدھی رات میں وہاں جاؤں''۔

میں نے کہا: ''پلاؤ ہے''۔

انھوں نے کہا: ''ہوگا میری جان، میرے بدلے تم کھا لینا۔ نوشِ جان کر لینا۔ میں بڑھیا قبر میں پیر لٹکائے، پلاؤ کھاؤں یا نہ کھاؤں، فرق نہیں پڑتا۔ تم جوانو! کھاؤ تاکہ تمھاری ہڈیاں مضبوط ہوں''۔

''اگر صدام آجائے، ایک بم آپ کے سر پر پھینک دے، نہ میں رہوں گا کہ آپ کی مدد کروں، نہ حسین، کوئی آپ کی مدد کو نہیں آئے گا کہ آپ کے جنازہ کو ملبہ کے نیچے سے باہر نکالے''۔

انھوں نے کہا: ''آخر بیٹا، اپنی جان کو بھی سوچو، سحر قریب ہے آدمی ایسی بری بات منہ سے نہیں نکالتا''۔

میں نے کہا: ''کوئی اور تو آپ کے پاس ہے نہیں، کوئی ہے؟''

''ہے، کیوں نہیں ہے۔ فرشتے ہیں اور ملائکہ میرا جنازہ باہر کھینچ کر نکالیں گے''۔

اب مجھ میں حوصلہ نہیں تھا، میں نے کہا: ''اب آدھی رات میں فرشتے اور ملائکہ کہاں ہیں کہ آپ کا جنازہ ملبہ سے باہر نکال لیں گے۔ آیئے دادی جان چلیے۔ بابا ناراض ہوں گے''۔

انھوں نے کہا: ''اس کے لڑنے جھگڑنے کی میں عادی ہوچکی ہوں۔ وہ میرا اپنا بچہ ہے''۔

میں نے کہا: ''دادی جان، ابھی چلیے۔ میں بابا جان سے کیا کہوں گا؟ آپ تو بوڑھی ہوگئی ہیں۔ آپ سے تو وہ لڑائی کریں گے نہیں۔ وہ تو مجھ پر خفا ہوں گے اور مجھے سزا دیں گے کہ میں آپ کو کیوں نہیں لایا''۔

دادی جان نے دوبارہ تسبیح تیز تیز پھیرنی شروع کردی۔ دل کہہ رہا تھا کہ اکیلے ہی واپس چلا جاؤں لیکن میں سمجھ رہا تھا کہ جیسے ہی گھر میں قدم رکھوں گا بابا ناراض ہوں گے اور بھیا حسین بھی، اسی لیے میں نے ان سے خوشامد کی اور کہا کہ یہاں اکیلے رہ کر کیا

کیجیے گا، اُٹھیے اور چلیے؛ میری قسم! آپ کے پاس سحری بھی نہیں ہے کہ آپ کھایئے گا''۔

انھوں نے کہا: ''کیوں نہیں ہے! خدا ان پڑوسیوں کے بزرگوں کو بخشے! کل رات ہی مشہدی قمر کے بیٹے مصطفیٰ نے میرے لیے ایک گرما گرم سنگک (روٹی) بھیجی تھی۔ ایک ٹکڑا افطاری میں اور ایک ٹکڑا ابھی کھالوں گی۔

میرا دل دُکھ گیا۔ میں نے اپنے دل میں سوچا، بے چاری ضعیفہ، دانت تک تو ہے نہیں۔ ہمیشہ سوکھی روٹی کھاتی رہتی ہیں۔ انھیں لے ہی چلنا ہے۔ زبردستی ہی سہی، لے ہی جاؤں گا۔

میں نے کہا: ''خالی روٹی!''

اُنھوں نے کہا: ''نہیں بیٹے، چائے میں نے بنالی ہے۔ پنیر میرے پاس ہے''۔

میں نے کہا: ''جلدی ہی بھوک نہ لگ جائے گی! ایک رات سحری میں ہم لوگوں نے روٹی پنیر اور چائے لی تھی، سب کے لیے روزہ رکھنا بہت مشکل ہوگیا تھا۔ میں نے اور صغریٰ نے تو ظہر تک ہی روزہ توڑ دیا۔ صرف بھیا حسین، بابا اور نانی روزہ رہیں۔ دادی خدا کے لیے اب چلیے۔ میری خاطر چلیے۔ آپ کہتی ہیں نا کہ تم میرے لیے بہت عزیز ہو۔ مجھ پر قربان صدقہ ہوتی رہتی ہیں۔ آج رات میری خاطر ہمارے گھر چلیے۔ چھوڑیے اگر صدام آ گیا تو کم از کم سب ایک جگہ تو رہیں گے۔ کچھ سمجھیں!''

ہماری بی بی (دادی) نے چادر اُٹھائی اور بولیں: ''کیا بولوں بیٹا، آدھی رات میں اس آنکھ سے، ہمارے لیے بہت سخت ہے۔ ان پاؤں سے چلا نہیں جاتا۔ یہیں راحت سے ہوں''۔

میں سمجھ گیا کہ اب راضی ہورہی ہیں۔ میں نے کہا: ''میری خاطر!''

اُنھوں نے کہا: ''اللہ تم بچوں سے امان دے۔ امان، امان...''

میں ہنسا اور بولا: ''بس جلدی کیجیے، میں باہر گلی میں سائیکل لیے آپ کا منتظر ہوں''۔

انھوں نے کہا: ''ایں! سائیکل سے آیا ہے؟''

میں پھول گیا اور بولا: ''ہاں، پھر کیا، گاڑی ہے!''

انھوں نے کہا: ''تم آگے آگے چلو بیٹا، میں پیدل پیدل آ رہی ہوں۔ اندھیرے میں تو آنکھ بھی ڈر جائے''۔

میں نے کہا: ''آپ بھی بی بی۔ ڈر کس بات کا!''

میں نے کہا: ''روشنی ہے، مارچ ہے اُس میں۔ بھیا حسین کیسے آپ کو لے جاتے ہیں؟ اُس وقت آپ نہیں کہتیں کہ ڈر رہی ہوں۔ اب جب میری باری آئی تو آپ اس طرح کہتی ہیں''۔

انھوں نے کہا: ''تیز نہ چلانا''۔

میں نے کہا: ''نہیں آرام آرام سے چلوں گا''۔

پھر اسی طرح میں دھیرے دھیرے جا رہا تھا کہ میں نے دیکھا بی بی نے مجھے کمر سے اتنا مضبوطی سے پکڑا تھا کہ جیسے جیٹ پر سوار ہیں۔ عنقریب تھا کہ سائیکل میرے ہاتھ سے چھوٹ جائے اور ہم دونوں کے ہاتھ پاؤں ٹوٹ جائیں۔

میں نے کہا: ''بی بی آخر بات کیا ہے۔ میری کمر ذرا ڈھیلی کیجیے نہیں تو اب میں گرنے ہی والا ہوں''۔

انھوں نے کہا: ''اصلاً تم مجھے نیچے اُتار دو۔ میری آدھی عمر گذر گئی، پیدل ہی میں مجھے راحت ہے''۔

میں نے دیکھا کہ انھیں نیچے اُترنے کا پھر بہانہ مل گیا۔ میں نے کہا: ''ہرگز نہیں! مجھے پکڑے رہیے، بس ابھی پہنچے''۔

○

جب ہم لوگ اپنے گھر کے نزدیک پہنچے تو بی بی نے پوچھا کہ ''سالن ہے؟''

میں نے کہا: ''ہاں''۔

اُنھوں نے پوچھا: ''کون سا سالن ہے، تمھیں معلوم ہے؟''

میں جانتا تھا کہ بی بی کو خوبانی کا سالن بہت پسند ہے۔ اندازہ سے کہہ دیا ''شاید خوبانی کا سالن ہے''۔

انھوں نے کہا: ''خوبانی!... خو... خو... بہت اچھا... بہت اچھا۔ خوبانی مقوی ہے۔ الٰہی خیر۔ چلو دیکھتے ہیں...''

میں نے بھی کچھ اور نہیں کہا۔ بس اتنا بولا: ''واہ! بی بی آپ نے کہیں ایسا دیکھا ہے۔ بہت سارا کوشت، اچھا سا، دُنبہ کا اس میں پڑا ہے۔ بہت اچھے دنبہ کا۔ بس صدّام اتنا موقع دے دے کہ ہم لوگ اسے کھالیں''۔

انھوں نے کہا: ''خدا اسے ذلیل کرے۔ الٰہی اُسے تو ذلیل کر جس نے مسلمانوں کو دربدر کیا''۔

میں نے بی بی کا ہاتھ پکڑا اور انھیں اندر لے گیا۔ احمد آغا پاسبان کے کمرہ سے شور شغب کی آوازیں آ رہی تھیں۔ پتہ نہیں احمد آغا کس بات پر اپنی بیوی سے جھگڑا کر رہا تھا۔

اصغر آغا جگر کی حوض کے کنارہ بیٹھے ہاتھ منہ دھو رہے تھے۔ میں نے سلام کیا، بولے: ''سلام مصطفیٰ۔ کہاں تھے؟ بی بی کو لانے گئے تھے؟ سلام بی بی! اوہ! ہم فقیروں کی یاد آ گئی!''

بی بی نے کہا: ''الٰہی خیر، طاقت نہیں ہے پہلے کی طرح آؤں اور جاؤں''۔

''طاقت کیا چیز ہے بی بی۔ طاقت تو آپ کے دشمنوں کو نہیں ہے۔ ہمارا غریب خانہ بھی ہے بی بی۔ اگرچہ کچھ ہے تو نہیں مگر ایک پیالی کڑوی چائے تو مل ہی جائے گی''۔

بی بی بولتی جارہی تھیں: ''تم لوگ زندہ رہو''۔ میں نے ان کا ہاتھ پکڑا اور دھیرے دھیرے سیڑھی سے اُوپر لے گیا۔

بھائی حسین اور صغریٰ بھی جاگ گئی تھی، لیکن چھوٹی معصومہ ابھی سو رہی تھی۔ سب نے چائے پی لی تھی۔ کمرہ میں دسترخوان بچھا ہوا تھا اور سبھی ہم لوگوں کے منتظر تھے۔

بابا نے کہا: ''تم لوگ اتنی دیر تک کہاں تھے؟ ابھی اذان ہوجائے گی''۔ دل میں آیا کہ سب بی بی کا قصور ہے۔ مجھے معطل کیے ہوئے تھیں، مگر میں بولا نہیں۔ میں نے سوچا ابھی بابا ان پر ناراض ہونے لگیں گے، اور پلاؤ اُن کے منہ میں زہر ہوجائے گی۔

میں نے کہا: ''اندھیرا تھا۔ گلیوں میں تیز نہیں چل سکتا تھا''۔

انھوں نے کہا: ''اب بیٹھو چائے پیو۔ صغریٰ! بی بی کے لیے بھی اُنڈیلو''۔

بی بی نے کہا: ''میں نے تو کہا کہ گھر پر آرام سے ہوں۔ آدھی رات میں مجھے کہاں لے جارہے ہو۔ یہاں کیا لا رہے ہو؟''

بابا نے کہا: ''ایسی راتوں میں گھر والوں کو ایک جگہ رہنا چاہیے۔ ایک دوسرے کی خبر رکھنی چاہیے تاکہ اگر کوئی بلا آئے تو پتہ چلے کہ کیا کام کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے۔ آپ دیکھتی نہیں کہ یہ ملعون ہر رات آتا ہے''۔

بی بی نے کہا: ''آئے تو آئے اور پھٹ پڑے۔ مجھے کوئی ڈر ہے؟ ارے قبر میں پیر لٹکا ہوا ہے، میں کیوں ڈروں؟''

بابا نے کہا: ''کیا ہم لوگ ڈرتے ہیں۔ میں کہہ رہا ہوں کہ سب لوگوں کو اکٹھا رہنا چاہیے۔ سب کو ایک دوسرے کی خبر رکھنی چاہیے کیوں بحث کر رہی ہیں''۔

بی بی نے ایک آہ بھری اور کچھ نہیں بولیں۔ بھائی حسین نے قند بی بی کی طرف بڑھائی اور بولے: ''بی بی چھوڑیئے اور چائے پیجئے''۔

بی بی نے قند لی اور بولیں: ''خدا بھلا کرے!''

بابا نے گھڑی پر نظر ڈالی اور 'ہونہہ' کی آواز نکالی اور بولے: ''سو بار اس عورت سے کہا ہے کہ ہم لوگوں کو ایک گھنٹہ پہلے سے جگایا کرو، جلدی کھانے کو لاؤ اور یہ ہے کہ خبر ہی نہیں لیتی۔ ایک دم موت کی طرح سر پر سوار ہوجاتی ہے اور سحری بھی کھانے کو نہیں مل پاتی۔ سو مرتبہ کہا لیکن کون سنے؟ سنتی ہی نہیں''۔

میں نے بات کاٹتے ہوئے اچھے موڈ میں کہا: ''لا مذہب آتا ہی ہوگا۔ کم از کم ایک بار ہمارے اسکول ہی پر گرادے کہ پڑھائی سے جان چھوٹے''۔

بابا کی آنکھیں غصہ سے اُبل پڑیں اور بھائی حسین نے کہا: ''تمھارے سر پر خاک۔ ایسی آرزو کے لیے تو تمھارے سر پر خاک۔ اُٹھو، نظروں سے دُور ہوجاؤ۔ پڑھنا نہیں چاہتے۔ جب بڑے ہوؤ گے تو کیا میری طرح بنو گے۔ صبح سے شام تک گدھے کی طرح کپڑا مل میں کام کرو گے؟ کچھ نہیں ہوگا، کچھ نہیں''۔

بابا نے بھی ان کی ہاں میں ہاں ملائی: ''یہ عقل و شعور ہے۔ بے غیرت''۔

میں نے کہا: ''اُف اُف! ارے ایسے ہی ایک بات کہہ دی''۔

بابا نے کہا: ''ایسی ہی بات کرنی ہے تو جاؤ مرو''۔

میں جواب دینے کی سوچ ہی رہا تھا کہ ممی نے باہر سے آواز دی: ''صغریٰ! دسترخوان لگاؤ۔ الحمدللہ! خیر ہوئی''۔

بھائی حسین نے بی بی کی طرف رُخ کیا اور کہا: ''اور چائے اُنڈیلوں؟''

بی بی نے کہا: ''نہیں بیٹا! اللہ تمھارا بھلا کرے۔ یہی ایک کافی ہے۔ دو تو ہو ہی جائے گی۔ کچھ کھا کر ایک پیتی ہوں تاکہ منہ کی چکنائی صاف ہوجائے''۔

ماں آئیں۔ سلام کیا اور بولیں: ''بی بی آپ ادھر آتی کیوں نہیں؟ یہ گھر کسی غیر کا نہیں ہے۔ آپ کے بیٹے کا ہے۔ آپ کا حق ہے۔ ان راتوں میں آپ یہیں اپنے بچوں کے ساتھ رہئے''۔

بی بی نے کہا: ''میرے لیے سخت ہے بیٹا اس آنکھ پر کہیں آنا اور جانا''۔

ماں نے کہا: ''جایئے گا نہیں، اب یہیں رہ جایئے۔ کیوں جایئے گا؟ اگر گھر کی بات ہے تو بچے روزانہ جائیں گے اور گھر کو ایک نظر دیکھ کر آ جائیں گے''۔

بابا کی آواز میں اب غصہ نہیں تھا، بولے: ''سو بار ان سے کہا کہ اسی جگہ رہئے، آخر ننھہ جان آپ کہاں جایئے گا، یہیں رہیں یہیں''۔

ماں نے کہا: ''رہیں گی، رہیں گی! آپ آیئے جب تک صدام نہیں آتا ہے آپ لوگ سحری کھایئے۔ پھر قابلمہ (ڈونگہ) کا ڈھکن کھولا۔ قیمہ خورش سے بھاپ نکل کر ہم لوگوں کی ناک میں آ رہی تھی۔ بابا نے لمبی سانس لی، اور بولے: ''واہ واہ! کیا خوشبو ہے''۔

بی بی نے بھی اپنی سانس کھینچی اور بولی: ''اللہ ہاتھ پیر سلامت رکھے بیٹی!''

بھائی حسین نے کہا: ''ایک رات تو ایسی آئی کہ ہم لوگ اچھی غذا کھائیں''۔

بابا نے کہا: ''کھاؤ اور اللہ کا شکر ادا کرو، ایسے بہت سے ہیں جو اتنا بھی نہیں رکھتے۔ اس جھاڑو دینے والے رجب کو دیکھو۔ بدبخت برسوں ایسا کھانا نہیں کھا سکتا ہے۔ میں نے قابلمہ میں نظر ڈالی تو دیکھا کہ خوبانی کا کہیں پتہ ہی نہیں البتہ گوشت کا ایک اچھی طرح پکا ہوا سرخ ٹکڑا آلو کے بیچ سے جھانک رہا تھا۔ جیسے مجھ ہی کو آنکھ مار رہا ہو۔ دل چاہا کہ جھپٹ پڑوں، لیکن میں نے دیکھا کہ اس کام کے لیے کلیجہ چاہیے۔ بھائی حسین کے ہاتھوں میری اچھی شامت آ جائے گی اور پٹ جاؤں گا۔ میں نے کہا: ''جہنم کی قسم جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ دو منٹ کے بعد مار بھول جائے گی لیکن گوشت کا مزہ ایک ہفتہ تک میرے منہ میں رہے گا''۔ میں نے نیچی نظر سے دیکھا کہ ماں اور بابا پلاؤ کو پلیٹوں میں نکال رہے ہیں اور بھائی حسین کا ذہن اس طرف نہیں ہے۔ موقع مناسب ہے۔ قابلمہ (ڈونگہ) کی طرف ہاتھ بڑھایا کہ بھائی حسین نے ایک بھرپور ہاتھ میری پیٹھ پر جمایا اور بولے کہ ''ناخن نہ لگاؤ۔ بھاگو یہاں سے۔ پیچھے چل کر بیٹھو''۔

میں سمجھ گیا کہ یہ کنکھیوں سے مجھ پر ہی نظر رکھے ہوئے تھے۔ میں جھنجھلا گیا، بولا: ''ناخن کون مار رہا ہے؟ میں تو یہ دیکھ رہا تھا کہ گوشت ٹھیک سے پکا ہے کہ نہیں''۔

صغریٰ نے کہا: ''تمھاری جان کی قسم! جھوٹے، چاہتے ہو کہ گوشت نکالو اور کھا جاؤ''۔

میں نے اس کے پہلو میں کہنی سے مارا اور دھیرے سے بولا: ''چپ رہو نہیں تو ابھی بتاتا ہوں''۔

بھائی حسین نے کہا: ''مصطفیٰ غصہ نہ دلاؤ۔ اٹھوں گا تو اتنا ماروں گا کہ کتے کی طرح چیں چیں کرتے رہو گے''۔

میں نے کہا: ''خورش میں خوبانی کیوں نہیں ڈالا؟''

بابا نے کہا: اتنا نہ بولو، چپ چاپ کھاؤ''۔

میں نے کہا: ''یہ بات طے نہیں تھی کہ خوبانی ڈال کر بنے گا؟''

بھائی حسین نے کہا: ''نہیں کھاؤ گے تو جاؤ اپنا کام کرو''۔

بابا نے کہا: ''بیٹھو۔ کھاؤ۔ تم لوگ اتنی بحث کرو گے تو صدام آ جائے گا اور کچھ کھا نہ پاؤ گے اور چپت لگا کر چلا جائے گا''۔

بھائی حسین بولے: ''بچہ میں تمیز ہونی چاہیے۔ آپ سزا نہیں دے سکتے تو ان کو میرے سپرد کیجیے''۔

بی بی نے کہا: ''بچو! تم لوگ کھاؤ۔ مگر اس طرح مرغ لڑائی نہ کرو۔ افسوس ہے کہ تم لوگوں میں شرافت نہیں ہے''۔

ماں نے کہا: ''خدا کی قسم میں تو ذلیل ہوگئی۔ ہر وقت ہوں ٹوں، ہر وقت ہوں ٹوں''۔

اس کے بعد چاول کا قاب دسترخوان پر رکھا اور خورش (سالن) ابھی چاول پر انڈیل ہی رہی تھی کہ یکا یک بجلی چلی گئی اور سائرن بجنے لگا۔ ماں نے دوڑ کر معصومہ کو

کود میں لیا اور بولیں: ''یا حضرت عباسؑ!'' بابا نے بھی اسی طرح بی بی کا ہاتھ پکڑا اور فرّاٹے دار گالیاں بکنے لگے اور کہتے رہے بے شرافت، بے مروّت، تیرے ماں باپ پر لعنت، ایک لقمہ روٹی تک کا حلق سے اُتارنے کی مہلت نہیں دی۔

دھیرے دھیرے ہم لوگ بھی زینہ سے نیچے اُترے۔ بھائی حسین نے ماں اور صغریٰ کو سنبھالا، بابا بھی بی بی کو لے کر نیچے آ گئے۔ میں بھی اُن کے آگے آگے دوڑ رہا تھا۔

احمد آغا پاسبان اور اصغر آغا جگرکی، ان کے کمرے ہمارے کمرے کے نیچے تھے، وہ بھی باہر نکل آئے تھے۔ ہم سب گلی میں پہنچے۔ دروازہ کے سامنے کھڑے ہوئے۔

حسین آغا سبزی فروش اور رجب فرّاش بھی اپنے بچوں کے ساتھ اکٹھا تھے۔

سب کے سر آسمان کی طرف اُٹھے ہوئے تھے اور نگاہیں عراقی جہازوں کی تلاش میں تھیں۔ رجب فرّاش نے مجھے دیکھا اور ہنستے ہوئے بولا: ''مصطفیٰ خود ہی آ گئے۔ چپ ہو جاؤ۔ اب مصطفیٰ خود ہی آ گئے''۔

سب کی نگاہیں اب میری طرف تھیں، جب بھی ہوائی جہاز آتا تھا سب کی نظر میری طرف ہوتی تھی کہ میں انھیں ہوائی جہاز دِکھاؤں۔ سب یہ سمجھتے تھے گویا میں وہاں کا نگراں تھا۔ جیسے ہی خطرہ کا اعلان ہوتا میں گلی میں آ جاتا۔ لوگ میرے پاس جمع ہو جاتے کہ اب میں انھیں دِکھاؤں۔

اصغر آقا جگرکی نے کہا: ''یہ بے ایمان، اِس کی آنکھ عین عقاب کی طرح ہے''۔

عموماً راتوں میں تو میں ڈھونڈ لیتا۔ اپنی آنکھیں آسمان میں اتنی گھماتا، اسے غور سے دیکھتا کہ ستاروں کے بیچ میں ہوائی جہاز مل ہی جاتا۔

احمد آقا پاسبان--- بمباری والی راتوں میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے گلی کا حاکم ہوں، بولے: ''مصطفیٰ! یا اللہ! نظر دوڑاؤ بھائی۔ دیکھوں میں''۔

اصغر آقا جگرکی نے کہا: ''میں بھی دیکھوں۔ مصطفیٰ کیا فرماتے ہیں!''

میں نے اپنا منہ پھلایا اور آسمان کی طرف سر اُٹھایا۔ بہت کوشش کی، ستاروں کے درمیان تلاش کیا مگر ہوائی جہاز کہیں نظر نہ آیا۔ یہ لامذہب ستارے اسی طرح بے حس و حرکت اپنی جگہ پر چمک رہے تھے اور ہل ہی نہیں رہے تھے۔ حسین آقا سبزی فروش نے کہا: ''ہاں آئے نہیں!''

بابا نے کہا: ''پتہ نہیں۔ مصطفیٰ کو کچھ دِکھائی ہی نہیں دیتا''۔

میں نے کہا: ''نہیں، ابھی آیا ہی نہیں ہے''۔

رجب فرّاش بولے: ''ایسے ہی ہے، نہیں آئے''۔

میں نے کہا: ''نہیں! ابھی تو نہیں، انتظار کرو۔ جیسے ہی آئیں گے میں بتاؤں گا''۔

میں اسی طرح دیدہ پھاڑے دیکھ رہا تھا۔ مگر میرے کان پڑوسیوں کی طرف لگے ہوئے تھے کہ دیکھوں وہ میری اس نگہبانی کی تعریف کرتے ہیں یا نہیں؟ ایسا لگتا تھا جیسے کہ میں محلّہ کا نگہبان ہوں۔ سب اپنی اپنی ہی باتیں کر رہے تھے۔

احمد پاسبان کی بیوی بولیں: ''آقا ناصر وغیرہ بھی چلے گئے۔ اپنا اسباب گاڑی میں ڈالا اور چلے گئے''۔

اصغر آقا جگرکی نے پوچھا: ''کب؟ کب چلے گئے ہم لوگوں کو خبر ہی نہیں ہوئی؟''

احمد آقا نے کہا: ''کل وقتِ غروب۔ ایک گاڑی چار سو تومان کرائے پر لی''۔

بھائی حسین نے کہا: ''خوب! لوگ چلے جائیں۔ اُن کے بدلے ہم سب موجود ہیں۔ یہ کوئی بات ہوئی!''

احمد آقا پاسبان بولے: ''ہاں وہ! غرض دھیمے دھیمے لوگ چلے ہی جا رہے ہیں''۔

بابا نے کہا: ''ہم لوگ بھی چلے ہی جائیں۔ مگر سوال ہے کہاں جائیں، ہمارا گھر ہماری زندگی یہاں ہے''۔

اصغر آقا جگرکی نے کہا: ''جس کے جگر ہوگا وہ یہاں رہے گا''۔

بابا بولے: ''جگر-مگر کی بات نہیں ہے، زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ کبھی دیکھتے ہو کہ کوئی سڑک پر جاتا ہے، آناً فاناً ایکسیڈنٹ ہوتا ہے اور مرجاتا ہے''۔

احمد آقا پاسبان نے کہا: ''ہاں ایسا بھی ہوتا ہے''۔ اور پھر اس کے بعد مجھے دیکھا اور پھر انھیں ایکدم مجھے حکم دینا یاد آ گیا اور بولے: ''مصطفیٰ کیا خبر ہے؟ تم نے تو اپنی جگہ بھی چھوڑ دی اور یہاں آ کر کھڑے ہوگئے۔ جاؤ دیکھو کہ لوگ اُٹھے کہ نہیں؟''

منہ بناتے ہوئے میں نے ایسا ظاہر کیا کہ جیسے مجھے یہ نگہبانی پسند نہیں پھر بھی آسمان کو دیکھنے لگا۔ کچھ بھی نہیں ہے۔ حسین، میرے بھائی، جو کبھی مجھے آدمی میں شمار نہیں کرتے تھے اور کبھی میری نگہبانی کو قبول بھی نہیں کیا ایکدم سے بول پڑے: ''ہاں مصطفیٰ! کچھ بھی خبر نہیں ہے نا!''

ایکدم میرے دِل میں خوشی کا ایک احساس ہوا اور میں نے اپنے آپ سے کہا: ''ہو نہ ہو آج تو ہر حالت میں ڈھونڈنا ہی ہے''۔ میں نے اپنی نگاہ پورے آسمان پر دوڑائی، لیکن اتفاق سے ہوائی جہاز کا ایک نشان بھی نہیں تھا اور میں یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ اپنے آپ کو اس طرح سے ناکام ثابت کروں۔ میں چاہتا تھا کہ بھائی حسین کو یہ بتادوں کہ میں بھی اب اتنا بڑا ہو چکا ہوں کہ لوگ میرا شمار انسانوں میں کریں اور وہ جہاں بھی جائیں مجھے اپنے ساتھ لے کر جائیں۔

میں نے جواب دیا: ''ابھی ڈھونڈ نکالتا ہوں۔ جیسے ہی آئے گا ویسے ہی بتاؤں گا، مگر کیا کروں کہ ابھی آیا ہی نہیں ہے''۔

اسی طرح ستاروں کے درمیان ڈھونڈ رہا تھا کہ میں نے دیکھا کہ دُور آسمان کے ایک کونے سے تین منزلہ فرشتہ بلڈنگ کے اوپر سے ایک ستارہ ہم لوگوں کی طرف آ رہا ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں کو کول کول کر کے اس ستارہ پر ٹکٹکی لگائی جو چل رہا تھا۔

میں نے دیکھا؛ ہاں ٹھیک وہی ہے۔ میں ایکدم چیخ پڑا: ''آ گیا!... آ گیا!... آ گیا... وہاں ہے!... اِدھر آ رہا ہے!''

میں نے ماں کی آواز سنی: ''یا حضرت عباسؑ!''

نہیں پتہ کہ بی بی زور زور سے نفرین کرنے لگیں کہ دعا کرنے لگیں۔ عورتوں اور بچوں نے چیخ پکار شروع کر دی اور مرد میرے چاروں طرف جمع ہو گئے۔

احمد آقا پاسبان نے سب کو ہٹایا اور میری بغل میں آ کر بولے: ''کہاں؟ تم اُسے دیکھ رہے ہو؟''

میں نے کہا: ''اُدھر ہے، ہماری انگلی کے سرے کی طرف دیکھئے یہاں ہے آ گیا۔ اِدھر ہے آ گیا''۔

رجب فراش نے ناامیدی سے کہا: ''ہمیں نظر نہیں آتا''۔

احمد آقا پاسبان نے کہا: ''اوہ! پچھم کی طرف سے آ رہا ہے۔ کمبخت کتنی تیزی سے آ رہا ہے''۔ طیارہ شکن حملہ شروع ہوگیا اور پھر فضا میں آتش بازی اور پٹاخے سے چھوٹنے لگے۔ عورتوں نے کوسنا شروع کر دیا۔ مرد خاموش صرف آسمان تکے جا رہے تھے۔ بابا نے زیرلب گالیاں دینی شروع کر دیں۔

بھائی حسین نے کہا: ''دیکھو یہ کدھر گراتے ہیں''۔

رجب فراش نے ایک آہ کھینچی اور بولا: ''خدا...!...''

بی بی پھر کوسنے لگیں۔

احمد آقا پاسبان نے ایک گہری سانس لی اور بولے: ''شاید کہیں گرا نہیں پائے۔ کسی نے اُن کا جواب نہیں دیا۔ ہوائی جہاز ہماری گلی کے اوپر سے گذر گیا''۔

حسین آقا سبزی فروش نے کہا: ''ہاں (تم سچ کہتے ہو) گرایا نہیں۔ خدا کرے کہیں نہ گرایا ہو''۔

یکبارگی ایک دو تین مرتبہ 'بم بم بم' کی آواز گونجی۔ تیسری اتنی نزدیک تھی کہ ہماری گلی کے مکانوں کی دیواریں لرز اُٹھیں۔

بابا نے پیشانی سے پسینہ پونچھا اور بولے: ''تین پھینکا ہے۔ تین جگہ مارا ہے''۔

رجب فراش بولے: ''خدا کرے بیابان میں پھینکا ہو''۔

اصغر آقا جگرکی نے کہا: ''ایک تو یہیں کہیں پھینکا ہے۔ یہیں خانی آباد میں''۔

احمد آقا پاسبان بولے: ''نا، ایسا لگتا ہے کہ دُور تھا، اُس طرف، ریلوے لائن کی طرف''۔

ہمارے حسین بھائی بولے: ''میں چلتا ہوں۔ ہماری موٹر سائیکل لاؤ''۔

بابا نے کہا: ''کہاں؟ چھوڑو، کم سے کم خطرہ تو ٹل جائے!''

بھائی حسین نے کہا: ''جب تک موٹر سائیکل نکالوں گا خطرہ ٹل جائے گا۔ پچھلی راتوں میں بھی جب بم پھینکا گیا تھا ایسا ہی ہوا تھا۔ میں نے دوڑ کر اپنی موٹر سائیکل اُٹھائی اور بمباری کی طرف چل پڑا۔ میرے پہنچتے پہنچتے خطرہ ٹل چکا تھا''۔

طیارہ شکن گولے بند ہو چکے تھے۔ بس کبھی کبھی ایک آدھ گولے کی آواز دُور دُور سے سنائی دے رہی تھی۔ ایک آگ کا لپکا آسمان کے کونے پر تیر کی طرح فضا میں گیا اور بجھ گیا۔ میرے بھائی نے موٹر سائیکل نکالی۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ بابا نے کہا: ''تمھیں کیا معلوم کہ کہاں مارا ہے؟ تم کہاں جاؤ گے؟''

بھائی حسین نے کہا: ''معلوم کرلوں گا۔ ایمبولینس اور فائر بریگیڈ کی آواز سے''۔

میں نے پوچھا: ''میں بھی چلوں؟''

حسین نے جواب نہیں دیا، پھر میں نے پوچھا: ''بھیا میں بھی چلوں؟''

کہا: ''کیسے آؤ گے؟ میرے پاس جگہ نہیں ہے۔ اصغر میرے پیچھے بیٹھنا چاہتا ہے۔ تم جاؤ سحری کھاؤ''۔

میں رنجیدہ ہو کر بولا: ''بھیا میں بھی چلوں گا''۔

خطرہ ٹلنے کا سائرن (اثر یرسفید) بجا۔

بابا نے کہا: ''چلیں ہم لوگ چلیں۔ دو نوالے اُتار لیں۔ ابھی اذان ہو جائے گی''۔

بی بی کا ہاتھ پکڑا اور چل دیئے۔ دیوار کے کونے کے سہارے سے اُنھیں اوپر کو اُٹھایا۔ ابھی کوئی چل نہیں پایا تھا کہ لاؤڈ اسپیکر سے اذان کی آواز بلند ہوئی:

"سبحان اللّٰہ والحمد للّٰہ ولا..."

سب اپنی اپنی جگہ یہ آواز سن کر سوکھ سے گئے۔ بابا نے غصہ میں دانت کو پیستے ہوئے کہا: ''نامرد تجھ پر لعنت اور تیرے باپ پر لعنت، تیرے باپ کے باپ پر لعنت۔

ماں نے کہا: ''بے کار کا اپنا خون کیوں جلا رہے ہو۔ کھانا رکھ دیں گے اور اس کی افطاری کرلیں گے۔ یہ بھی ٹھیک ہی رہے گا''۔

بی بی نے کہا: ''مصطفیٰ جان، مجھے میرے گھر لے چلو''۔

بابا نے کہا: ''کہاں جایئے گا۔ آپ نے بھی اسی وقت شروع کر دیا۔ یہیں رہئے''۔

بی بی ملول ہو کر بولیں: ''نہیں میں جاؤں گی۔ وہاں نماز بہت اچھے سے ہو جاتی ہے۔ اللہ تیرا بھلا کرے بیٹا''۔

ماں نے کہا: ''افطار کے وقت آ جایئے گا۔ میں مصطفیٰ کو بھیج دوں گی''۔

بی بی کچھ نہیں بولیں۔ میں نے دوبارہ بھائی حسین سے کہا: ''بھیا میں نہیں چلوں؟''

بھائی حسین غصہ ہوئے اور بولے: ''تمھیں بی بی کو نہیں لے جانا ہے؟ کتنی باتیں بناتے ہو تم! موٹر سائیکل اسٹارٹ کر دی''۔

بی بی نے کہا: ''مصطفیٰ جان! اگر تم کو کام ہے تو نہ آؤ۔ میں تنہا چلی جاؤں گی۔ میں اپنے آپ گھر پہنچ جاؤں گی''۔

میں غصہ میں ان کا جواب نہیں دینا چاہتا تھا، لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ بولا:
''کیوں نہیں، آ رہا ہوں۔ سائیکل لے کر آ رہا ہوں''۔
سائیکل میں نے نکالی۔ گلی میں کوئی بھی نہیں تھا۔ بی بی کونے میں اکیلی کھڑی تھیں اور نہ جانے اپنے آپ سے کیا باتیں کر رہی تھیں۔
بھائی حسین اور اصغر جگر کی گلی کے موڑ سے چلے گئے۔ بی بی سے میں نے کہا:
''چلتا ہوں آپ کو گھر پر چھوڑتا ہوں، پھر ایمبولینس کے سائرن کی آواز کی طرف چلتا ہوا بمباری کی جگہ پر پہنچوں گا''۔
بی بی آئیں، میرے پیچھے سائیکل پر بیٹھ گئیں۔ میں نے کہا: ''بی بی مجھے مضبوطی سے پکڑ لیجئے۔ پکڑ لیا؟''
بی بی کچھ بولیں نہیں۔ سائیکل کی لائٹ آن کی اور چل پڑا۔

○

پورا راستہ بی بی خاموش خاموش تھیں، کچھ نہیں بولیں۔ اپنے سوکھے ہڈی جیسے ہاتھوں سے انھوں نے میری کمر مضبوطی سے پکڑ لی اور اپنے آپ سے کچھ بولتی جا رہی تھیں۔
سائیکل سے بی بی کے گھر تک کا راستہ دس منٹ سے زیادہ کا نہ تھا۔ میرا ذہن اصلاً راستہ پر نہ تھا۔ بات کرنے کی خواہش نہیں ہو رہی تھی۔ میں تو بس منصوبہ بنا رہا تھا کہ کس طرح گھر پہنچوں اور ان کے چنگل سے چھوٹوں ورنہ ہمیشہ کی طرح کہیں گی کہ یہیں رہ جاؤ، اب کہاں جاؤ گے اور ضد کریں گی۔ ان سے ایسے ہی کہہ دوں گا کہ کل امتحان ہے، مجھے پڑھنا ہے۔ اس کے بعد ایمبولینس کے سائرن کے پیچھے ہولوں گا۔
سڑک پر ایک بڑی موٹر سائیکل ملی۔ اس نے اپنی رفتار دھیری کی اور مجھ سے پوچھا:
''تم کو نہیں معلوم کہ بم کہاں پھینکا؟''

میں اسی طرح سانس لیتا ہوا بولا: ''ہم کو نہیں معلوم، ہاں اسی طرف کہیں یا خانی آباد یا ریلوے لائن...''
اس نے کہا: ''ریلوے لائن نہیں بلکہ اسی طرف ہے کہیں؟''
بی بی کی گلی کے شروع میں ہی پہنچے تو بی بی نے پوچھا: ''مصطفیٰ ہم لوگ پہنچ گئے؟''
میں نے کہا: ''ہاں آپ ہی کی گلی ہے''۔
گلی میں بہت مجمع تھا۔ گلی کے آخر میں بی بی کے گھر کے نزدیک آگ لگی ہوئی تھی، جس کے شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ آگ کے شعلوں سے دیواریں سرخ ہو رہی تھیں۔ دوڑتے ہوئے لوگوں کے سایے دیواروں پر پڑ رہے تھے۔ اسے دیکھ کر ڈر لگ رہا تھا۔ میں نے ایک سے پوچھا: ''کیا ہوا؟ کیوں آگ جل رہی ہے؟''
میرا جواب نہیں دیا۔ تیزی سے دوڑا اور چل دیا۔ ایک دوسرا چلایا: ''بچو! اِدھر آؤ۔ بم یہاں گرایا ہے۔ اس گلی میں مارا ہے''۔
میرا دل کوریے کی طرح پھڑکنے لگا۔ بی بی نے کہا: ''مصطفیٰ جان، یہاں کیا ہوا ہے؟''
میں نے کہا: ''پتہ نہیں۔ ٹھہریئے دیکھتا ہوں... ایسا لگتا ہے کہ یہیں بم گرا ہے''۔
بی بی نے کہا: ''یا حضرت عباسؑ! یا فاطمہ زہراؑ!'' اور میری کمر کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔
سائیکل سے آگے نہیں بڑھا جا رہا تھا۔ مجبوراً ایک کنارے پر بریک لگائی۔ بی بی سے میں نے کہا: ''یہیں اُتر جایئے۔ جب تک میں نہ لوٹوں کھڑی رہیئے''۔
بے چاری بی بی بول رہی تھیں۔ گرفتہ آواز سے بولیں: ''کہاں جا رہے ہو مصطفیٰ! کہاں جا رہے ہو بیٹا! کھڑے رہو''۔
میں رُکا نہیں۔ سائیکل کو دیوار سے ٹکایا اور تیر کی طرح گلی کے آخری سرے پر پہنچا۔
اُس جگہ ایک شور، ہنگامہ، بھاگ دوڑ تھی۔ دل ہی دل میں سوچا، خدا نہ کرے بی بی کے گھر کو نہ مار دیا ہو۔ میرا گلا خشک ہوا جا رہا تھا۔ اپنے آپ کو زبردستی میں نے بھیڑ

تک پہنچایا۔ فضا دھویں اور خاک سے بھری تھی اور جوان لوگ بڑی بڑی ٹارچ لیے ہوئے گرد و خاک کے درمیان آ جا رہے تھے اور گھر میں سے اسباب نکال رہے تھے۔ اسی مجمع میں یک بیک میری نظر بھائی حسین اور اصغر جگر کی پر پڑی۔

بھیڑ میں ٹھہرا نہیں اور لوگوں کے ہاتھ کے گھیرے سے خود کو باہر نکالا۔ ایک نے کہا: ''بچے اِس طرف آ وَاِس طرف''۔

میں اسی طرح سکتہ میں بولا: ''میری بی بی کا گھر ہے!... میری بی بی کا گھر ہے''۔ اور حسین بھائی کے پاس چلا گیا اور بولا: ''بھائی!... بھائی!''

بھائی نے میری طرف دیکھا اور کچھ نہیں بولے۔ سر و صورت سیاہ، پسینہ میں بھیگے۔ آستین سے اپنا پسینہ پوچھتے ہوئے بولے: ''مصطفیٰ! بی بی کہاں ہیں؟''

میں نے چاہا کہوں کہ پیچھے ہیں، آ رہی ہیں، مگر جیسے ہی میری نظر بی بی کے گھر کی کچی جلتی ہوئی دیوار پر پڑی میں کہہ نہ سکا۔ صرف میرے ہونٹ کانپے۔ میرے بھائی نے اپنا ہاتھ میرے شانے پر رکھا۔ مجھے لپٹا کر بولے: ''کچھ نہیں مصطفیٰ، کچھ نہیں! مصطفیٰ جان گھر جاؤ اور بی بی کو بھی لے جاؤ۔ انھیں یہ سب نہ دیکھنے دو۔ جاؤ میرے بھیا، میری جان جاؤ''۔

پہلی دفعہ تھا کہ بھائی حسین کی آواز نہ خشک تھی نہ غصہ میں۔ کبھی بھی میں نے اُن کی آواز اتنی مہربان اور اتنی غمناک نہیں سنی تھی۔

ان کے اس طرح بات کرنے سے میں رو پڑا۔ میں اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا۔ آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ میں نے اپنے سر کو ہلایا اور جلدی سے بھیڑ میں لوٹ گیا تا کہ بھائی حسین مجھے روتا ہوا نہ دیکھیں۔

○○

آقا جان کی سائیکل

اس کا نام 'دبیرستان صفوی' (صفوی سیکنڈری اسکول) تھا۔ جیسا کہ لوگ کہتے تھے یہ دبیرستان (سیکنڈری کلاس) دُنیا کے سبھی دبیرستانوں سے الگ تھا۔ اس کا پرنسپل کبھی مارتا نہیں تھا۔ اس کے اساتذہ اسی جیسے تھے۔ کمزور بچوں کے لیے ہر روز شام کو اضافی کلاسیں لیتے۔ ان کے لیے بغیر کسی اجرت کے پرچے بناتے تھے۔ اس مدرسہ میں مارپیٹ کا دُور دُور تک گذر نہیں تھا۔ اس کے بدلے اچھا کھانا ملتا، کسی وقت دودھ تو کبھی کیک اور نہ جانے کیا کیا... تا کہ بچے اپنا منہ چلاتے رہیں اور خوب کام کریں اور ان کی لیاقت بڑھتی رہے، چونکہ اس جگہ وزیروں اور ممبر آف پارلیمنٹ (ایم پی) کے بچے پڑھتے تھے، اس وجہ سے ان میں ڈسپلن اور ادب اتنا زیادہ تھا کہ کسی طرح کی بے ترتیبی نظر نہیں آتی تھی۔ اس کے علاوہ جس نے بھی اس مدرسہ میں تعلیم حاصل کی یا وہ وزیر مملکت ہوتا تھا یا ممبر آف پارلیمنٹ یا ملک کے کسی اہم عہدہ پر...

میں آقا جان سے جب بھی کہتا تھا انھیں یقین نہیں آتا تھا۔ وہ کہتے تھے: ''بیٹا اس محسن کی باتوں کو نہ سنو! اسی طرح کچھ نہ کچھ کہتا رہتا ہے۔ آیا وزیر اور ایم پی کی کوئی کمی ہے کہ جس کا بھی اس مدرسہ میں نام لکھا گیا بس اسے عہدہ اور مقام دے دیں گے۔ وزیر اور ایم پی ہونے کے طریقے ہوتے ہیں، یوں ہی نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو ساری دُنیا شمیران کے موڑ پر چل پڑتی اور اپنے بچوں کا وہیں نام لکھوا دیتی۔

میں نے کہا: ''یوں ہی وہ کسی کو داخلہ نہیں دیتے۔ وہاں جانے کے لیے ہوشیار ہونا چاہیے، ذہین ہو اور اس کے نمبر زیادہ ہوں''۔

بابا کے ہونٹ پھڑکے اور بولے: ''ہوشیار کا کیا مطلب؟ یقیناً میرا آقا محسن، اسے 'الف' سے 'ے' تک کچھ سمجھ میں تو آتا نہیں۔ بہت ذہین ہے نا؟''

میں نے کہا: ''ٹھیک۔ کوئی نئی بات نہیں ہے؟

---ہاں بیٹا اگر پھوپھی مشہدی کے بھی پانچ چھ مَعلم ہوتے تو وہ بھی روس اور انگلستان کی صدر ہوتیں۔ اسی گفتگو کے دوران آقا جان کو مشہدی پھوپھی کی یاد آ گئی کہ وہ اس ترکی لہجہ، چھڑی اور موٹے چشمہ کے ساتھ روس یا انگلستان کی صدر ہونا چاہتی تھیں اور مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ ہنسی تو آقا جان کو بھی آ گئی لیکن وہ ہنسے نہیں۔ ہنسی کو دباتے ہوئے بولے: ''باور کرو بیٹا، اگر ایسا ہوتا جیسا کہ تم کہہ رہے ہو تو یہ مشہدی پھوپھی کچھ کم نہ تھیں۔ اگر سبھی لوگ دودھ، کیک اور نہ جانیں کیا کیا کھائیں اور ان کے لیے اضافی کلاسیز لگا دی جائیں تو سبھی اوّل درجہ کے طالب علم نہ ہو جائیں''۔

میں نے کہا: ''میں جانتا ہوں۔ چھوڑیے اِن باتوں کو آقا جان۔ میں چلوں۔ دیکھئے شاید میرا بھی نام لکھ لیں؟ ہوگا آقا؟ مجھے پتہ ہے کہ جب میں اپنا بائیوڈیٹا انھیں دِکھاؤں گا تو لوگ جلدی ہی مجھے قبول کر لیں گے''۔

''ہوسکتا ہے! مجھے کچھ کہنا نہیں ہے مگر میں اتنا جانتا ہوں کہ اس طرح کے اسکول میں بہت زیادہ پیسہ خرچ ہوتا ہے۔ زندگی کا سارا اثاثہ بیچ دوں تب کہیں جا کر اُس مدرسہ میں تمھارا نام لکھواؤں''۔

○

ہم لوگوں میں یہ طے ہوا ہے کہ ہم لوگ سائیکل سے جائیں گے۔ محسن نے خود یہ بات کہی کہ سائیکل سے چلیں گے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ راستہ لمبا ہے، پیدل تو نہیں جا سکتے۔

اگر تم بھی اپنے بابا کی سائیکل لے لو تو صبح جلدی ہی ہم لوگ چل پڑیں گے، دس بجے تک، یعنی دس گیارہ بجے تک وہاں پہنچ جائیں۔

میں نے کہا: ''ٹھیک ہے''۔ مگر مجھے معلوم تھا کہ میرے بابا اتنی آسانی سے سائیکل نہیں دیں گے۔ پھر بھی میں نے اللہ پر توکل کیا اور اس کی تلاش میں چل پڑا۔

آقا جان احاطہ میں اپنی سائیکل میں مشغول تھے۔ اس سائیکل میں ہمیشہ ایک دو خرابی رہتی ہی تھی۔ شام کو جب کام سے وہ لوٹتے تھے کھانا کھا کر آرام کرتے اور پھر سائیکل کے پیچھے پڑ جاتے۔ پرزے پرزے الگ کر دیتے۔ کبھی یہ پیچ کستے تو کبھی وہ ڈھیلی کرتے۔ کبھی بھی یہ ڈھنگ کی سائیکل نہیں تھی۔ جب بھی اسے چلایئے، یا تو اس میں ہوا نہیں ہوتی تھی یا پنکچر ہوتا یا کوئی پیچ ڈھیلی یا کوئی پرزہ ڈھیلا۔ خلاصہ یہ کہ جان منہ کو آ جائے تب کہیں جا کر کسی جگہ پر پہنچا جائے۔

میں نے معلوم کیا اور دیکھنے کے لیے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ایک تانبہ کے تار سے پیڈل کو کس رہے تھے۔ اصلاً اِدھر اُدھر کی اُن کو کچھ خبر نہیں تھی۔ میں نے بات شروع کی مگر نہیں ہو سکی۔ علی رضا بھی 'جن' کی اولاد، وہ بھی وہیں موجود تھا اور مجھے طرح طرح سے منہ چڑھا رہا تھا۔ کاش میں اس کے منہ پر ایک گھونسہ جما سکتا، افسوس کہ اس کا موقع نہیں تھا۔

مگر آنکھ سے ایسا دھمکایا کہ سمٹ گیا۔ پھر وہ آقا جان پر اپنا رنگ چڑھانے لگا اور بولا: ''آقا جان دیکھئے..'' مگر میں نے موقع ہی نہیں دیا کہ وہ اپنی بات پوری کرے۔

میں نے جلدی سے پوچھا: ''امّی کہاں ہیں؟'' مجھے معلوم تھا کہ انھیں باورچی خانہ میں ہی ہونا چاہیے۔ میں وہاں رُکا نہیں آگے بڑھ گیا۔ وہ آلو تل رہی تھیں۔ آلو کا ایک تلا ہوا ٹکڑا منہ میں ڈالا اور زبان جل گئی۔ جلدی سے باہر نکالا اور تیزی سے اسے پھونکنے لگا۔ ماں نے کہا: ''کیا ہوا بچہ؟ جلدی کیا ہے؟ آرام آرام سے کھاؤ۔ اپنے کو تم نے جلا لیا''۔

میں نے کہا: ''امّی، کل میں محسن کے ساتھ نام لکھوانے جاؤں گا، اسی مدرسہ میں جسے میں نے بتایا تھا۔ آپ چل کر میرے لیے بابا سے سائیکل کی اجازت لے لیں گی؟''

ماں نے آستین سے پیشانی پر پسینہ کے موٹے قطروں کو پونچھا۔ ان کا چہرہ گرمی سے سرخ ہو رہا تھا میری طرف رُخ کیا اور بولیں: ''تم اپنے بابا کا مزاج جانتے ہو؟''

میں نے کہا: ''نہیں، اگر آپ کہیں گی تو وہ دے دیں گے''۔

''خوب؛ تم جاؤ اور خود کہو۔ اگر نہیں دیا تو پھر میں ان سے کہوں گی''۔

''اگر نہیں دیا؟ کیا مطلب؟''

''دیں گے۔ تم جاؤ اور اُن سے کہو تو''۔

دوبارہ میں احاطہ میں گیا۔ اپنے چہرہ پر پانی ڈالا کہ میرا چہرہ ٹھنڈا ہو جائے اس کے بعد میں جا کر بابا کے سامنے بیٹھ گیا۔

علی رضا بیہودہ نے پھر زبان باہر نکالی۔ میں نے اپنا چہرہ پھیر لیا تا کہ نہ دیکھوں۔

بابا طاقت لگا کر تار کو مضبوطی سے کھینچ رہے تھے۔ میں نے بھی پیڈل کو ٹھیک سے پکڑ لیا اور بولا: ''مضبوطی سے پکڑا ہے نا کہ ہلے نہ''۔

بابا جو میری طرح ہانپ رہے تھے اور پسینہ اُن کی گردن تک بہہ رہا تھا، بولے: ''جمورہ (زنبورہ) لاؤ''۔

میں نے اوزار اِدھر اُدھر گرایا تا کہ مجھے چمٹا مل جائے اور علی رضا پر اپنا غصّہ بھی اُتار دیا۔ ایک ہاتھ مارا اور بولا: ''پیچھے چل کر بیٹھو۔ اوزار کو ہاتھ نہ لگانا''۔

بابا نے زنبورہ ہاتھ میں لیا اور بولے: ''اس تار کو مضبوطی سے پکڑ لو۔ دیکھیں تم ٹھیک سے پکڑ سکتے ہو؟ نکل نہ جائے!''

''ٹھیک''۔ تار کو اتنا مضبوطی سے کھینچا کہ عنقریب تھا کہ میرا ہاتھ کٹ جائے۔

''اسے چھوڑ دو''۔

تار کو زنبورہ سے پکڑا اور میں نے راحت کی سانس لی۔ میں نے دوبارہ چاہا کہ اپنی بات کہوں، مگر نہیں کہا۔ اس کے بجائے میں بولا: ''بابا جان! یہ فیتہ بھی کھل گیا ہے، ماچس لاؤں اسے چپکا دیجئے''۔

''نا، اب ہمت نہیں ہے مجھ میں۔ بری طرح تھک گیا ہوں۔ سائیکل نہیں بلکہ لوہے کا ٹکڑا ہے''۔

''---ہوگا۔ بالآخر آدمی کو کہیں پہنچا تو دیتی ہے نا۔ اگر یہ نہ ہوتی تو آپ کارخانہ کیسے جاتے؟'' میں بولا۔

بابا نے نہیں سنا کہ میں نے کہا کیا ہے۔ کھڑے تھے اور پچھلا پہیہ اُٹھائے ہوئے پیڈل چلا رہے تھے اور پہیہ تیز تیز چل رہا تھا۔

''آخر میں نے اس بے ایمان کو ٹھیک ہی کر لیا...''

مسکرائے اور اپنے چہرہ سے پسینہ پونچھا اور بولے: ''محمد جان! سارا سامان اُٹھاؤ اور ڈبہ میں ڈالو''۔

علی رضا نے کہا: ''میں بھی سمیٹوں؟''

میں نے کہا: ''پیچھے جاؤ، پیچھے جاؤ۔ اپنا ہاتھ کھینچو''۔

میں جلدی سے بیٹھ گیا اور بابا نے جس جس سامان کو اُٹھانے کے لیے کہا تھا میں اُٹھانے لگا۔ میں اسی طرح سے سر جھکائے ہوئے بولا: ''بابا، کیا سچ کل آپ سائیکل سے جائیں گے؟''

بابا کو یا سمجھ گئے اور ذرا تیز لہجہ میں بولے: ''تمھیں کس لیے چاہیے؟''

''کچھ نہیں؛ وہی نام لکھوانے کے لیے۔ بہت دُور ہے۔ ہم لوگوں کو چاہیے کہ سائیکل سے جائیں۔ آخر بہت دُور ہے''۔

''بس کس لیے ہے؟ ایک تو مان دو اور سفر کرو''۔

''محسن اپنی سائیکل لا رہا ہے۔ میں اسی طرح پیدل اس کے پیچھے پیچھے جاؤں یہ نہیں ہوسکتا''۔

''کیوں نہیں ہوسکتا۔ تمھیں ان سے کیا کام ہے؟ پوری دُنیا وہاں جا رہی ہے تو کیا سب اپنی سائیکل سے ہی جا رہے ہیں؟''

''کیا ہوجائے گا اگر آپ اپنی سائیکل دے دیں گے؟''

''پھر وہی بات۔ بیٹا! شاید تمھاری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ میں کہہ رہا ہوں کہ کارخانہ تک یہ مجھے بڑی مشکل سے لے جاتی ہے اور تم یہ چاہتے ہو کہ شمیران کے موڑ تک اسے کھینچ کر لے جاؤ''۔

غیبی مدد تھی کہ اسی وقت میری ماں صحن میں آ گئیں۔ قبل اس کے کہ میں آنکھوں آنکھوں میں ان سے التجا کروں کہ میری مدد کیجیے، خود بولیں: ''اگر ایک دن آپ بس سے چلے جائیں تو آسمان زمین پر نہیں آ جائے گا۔ اسے دے دیجیے۔ چھوڑیے جانے دیجیے''۔

بابا کو غصہ آ گیا: ''اِن کو کیا کیا دے دوں کہ یہ چلے جائیں؟ تم سب لوگ مل گئے ہو اس سائیکل کو توڑ ڈالو اور جاؤ''۔

''آجکل اور لوگ بھی تو ہیں! دیکھئے کیا کیا کرتے ہیں اپنے بچوں کے پڑھنے پر، مدرسہ پر۔ ہوم ورک پر ناز کرتے ہیں۔ خدا کی قسم جن کے بچے گلی کوچوں میں دن رات گھومتے رہتے ہیں وہ لوگ اپنے بچوں کو زیادہ سراہتے ہیں۔ وہ آدمی بھی اچھا نہیں ہے کہ مالِ دُنیا سے اتنا چپکا رہے''۔

''کیسا مالِ دُنیا؟ کون سا مالِ دُنیا؟ یہ کھٹارا سائیکل! اِسی کو مالِ دُنیا کہتی ہو! تم کو شاید پتہ نہیں ہے کہ جو کچھ میں کہتا ہوں وہ صحیح ہے۔ بابا میں کہتا ہوں کہ یہ اس چڑھائی پر نہیں جاسکتی۔ واللہ یہ سائیکل اوپر تک نہیں جاسکتی اور اس کو پریشان کردے گی۔ کس طرح تم لوگوں کو سمجھاؤں''۔

جی میں آیا کہہ دوں ''اگر پریشان ہوؤں گا تو اپنے آپ سے'' کہ میری ماں نے مجھے اشارہ کردیا کہ کچھ نہ بولوں، چپ رہوں، وگرنہ میں غصہ سے پھٹ پڑتا۔

ماں نے کہا: ''بیٹا تم بھی محسن کی سائیکل پر ہی چلے جاؤ۔ دونوں ایک ہی پر چلے جاؤ۔ تم دیکھو، وہ کہتے ہیں کہ یہ چڑھائی پر نہیں جاسکتی''۔

غصہ سے میری آواز بھرائی ہوئی تھی۔ میں نے کہا: ''نہیں چاہیے؛ میں نہیں چاہتا کہ اُس کی سائیکل پر سوار ہوؤں کہ کل وہ مجھ پر احسان جتائے''۔

بابا کا غصہ اب ختم ہوگیا تھا۔ بولے: ''احسان کیسا بیٹا؟ سائیکل سواری میں بھی کوئی احسان ہوتا ہے؟''

میں نے کہا: ''میرا منہ نہیں پڑتا کہ کہوں کہ بابا نے مجھے سائیکل نہیں دی۔ میں آپ ہی کی سائیکل پر پیچھے بیٹھ کر چلا جاؤں گا''۔

''اس میں کیا برائی ہے؟''

''اس کی سائیکل ریس والی ہے۔ ہمارے مال کی طرح دقیانوسی زمانے کی نہیں ہے''۔

بابا کے ہونٹ دوبارہ پھڑکنے لگے۔ میں سمجھ گیا کہ یہ اس وجہ سے ہے کہ میں نے ان کی سائیکل کی توہین کردی ہے اور انھیں کچھ غصہ آ گیا، مگر کچھ کہا نہیں۔ میں بھی ناک بھوؤں چڑھا کر ایک کمرہ میں جا کر کونے میں چپ بیٹھ گیا اور اپنے پیر کی انگلی سے کھیلنے لگا۔

بابا نے پہلے تو کچھ نہیں کہا۔ جب کمرہ میں آئے تو پہلے میری بہن معصومہ سے کھیلنے لگے۔ اس کے بعد علی رضا سے باتیں کیں۔ پھر ماں سے باتیں کرنے لگے۔ پھر چائے پی، سگریٹ پیا اور تھوڑا ریڈیو کا بٹن اِدھر اُدھر کیا اور آخر میں کہا: ''چائے پی لو بیٹا!''

میں سمجھ گیا کہ بابا اب شرمندہ ہو رہے ہیں۔ مگر میں گیا نہیں، صرف آنسو بھری آنکھوں سے انھیں دیکھتا رہا۔ وہ چند لحظہ مجھے گھورتے رہے پھر مسکرائے، اُٹھے اور دہلیز تک گئے۔ صحن کو تکتے رہے، نہیں معلوم شاید آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے اُن کوریوں کو جو بغل والے پڑوسی کے درخت پر شور مچا رہی تھیں۔ اس کے بعد انھوں نے سائیکل کو دیکھا اور پھر شیہہ شیہہ کر کے کوریوں کو اُڑا دیا اور بغیر کسی پیش بندی کے بولے: ''اگر میں تمھیں پیسہ دے دوں تو جاؤ اور حسن سائیکل ساز سے ایک سائیکل کرائے پر لے لو۔ پیشانی کے شکن دُور ہو جائیں گے؟ تم راضی ہو جاؤ گے؟''

یک بیک مجھے ایسا لگا جیسے پوری دُنیا اُنھوں نے مجھے دے دی ہے اور میں اپنی خوشی کو روک نہیں پا رہا تھا۔

''کتنی ضرورت ہے؟ بیس تومان میں ہو جائے گا؟''

میں نے کہا: ''شاید دوپہر تک وقت لگے۔ آپ کو پتہ ہے راستہ کتنا ہے؟

''اچھا لو یہ تیس تومان۔ تین گھنٹہ کافی ہے؛ زیادہ ہی ہے۔ تم تھوڑا اِدھر اُدھر بھی گھوم سکتے ہو۔ علی رضا کو بھی اپنے ساتھ لے جاؤ''۔

یک بیک جیسے میرے سر پر ہتھوڑی ماردی۔ میں نے کہا: ''یہ ممکن نہیں۔ میں انھیں کیسے لے جاؤں گا؟''

''کیوں نہیں ہو جائے گا؟ ارے اپنے پیچھے انھیں بٹھا لو اور لیتے جاؤ۔ تیس تومان دو گے۔ مفت میں تو گاڑی لی نہیں ہے۔ لو یہ پانچ تومان اور رکھ لو۔ اگر کہیں تم نے اس کی گاڑی توڑ پھوڑ دی تو اس کا خسارہ ادا کر دینا''۔

میں چاہتا تھا کہ کہہ دوں کہ بابا اب آپ جائیے۔ اس میں پرزہ کہاں ہے...'' مگر میں نے دیکھا کہ یہ بولنے کی جگہ نہیں ہے۔ میرا کام اور خراب ہو جائے گا۔ مگر میں نے دل میں سوچ لیا کہ: ''علی رضا کو سائیکل نہیں چلانے دوں گا ایسا کام کروں گا کہ ہوش...''

مجھے لگتا ہے کہ میری ماں نے میرے دل کی بات پڑھ لی اور بولیں: ''چھوڑو، اسے ستاؤ نہیں۔ تمھارا بھائی ہے بیٹا''۔

مجھے بہت تیز غصہ آ رہا تھا کہ اگر اس نے کچھ بھی چاپلوسی کی تو میں اُس پر چڑھ جاؤں گا۔ ابھی سے ان کو بتائے دیتا ہوں، بعد میں نہ کہئے گا کہ ایسا کیوں کیا؟ ویسا کیوں کیا؟

بابا نے کہا: ''غلط کرتا ہے۔ ستاتا... علی رضا! تم نے سنا آدمی کے بچہ کی طرح سر جھکا کر رہنا اپنے بھائی کے ساتھ جا رہے ہو؛ سمجھے''۔

علی رضا کو تو بہانہ چاہیے تھا معصوم بن کر صرف سر ہلا دیا اور کچھ بولے نہیں۔ میں نے اُن کی آنکھوں میں دیکھا تو میرا دل اُن کے لیے دُکھ گیا۔ بے چارہ!

○

جو سائیکل مجھے ملی تھی اس کی خوبی یہ تھی کہ اس میں گھنٹی لگی تھی۔ وہ بھی کیسی گھنٹی کہ ہاتھ لگاتے ہی آواز آنے لگتی تھی۔ آواز بھی کیسی؟ جیسے بلبل نغمہ گا رہی ہو۔ کم بخت دی ری رنگ... دی ری رنگ... دی ری رنگ۔

اوپر تک جانے میں مجھے نانی یاد آ گئی۔ پھر بھی ایک جوش تھا ورنہ شروع سے ہی اس کے لیے ہر راستہ اُونچا ہی تھا۔ یعنی شروع میں چڑھائی اتنی سخت نہ تھی کہ ہماری سانس پھول جائے، اس کے بعد ضرور سانس پھولنے لگتی۔ مگر جب تک چھینٹ (کپڑا) کے کارخانہ تک پہنچیں سانس پھول کر برا حال ہو گیا۔ میں نے چاہا کہ علی رضا سے کہوں کہ بابا کا کارخانہ اسی جگہ ہے۔ میں نے دیکھا کہ اسے نیند آ گئی۔ کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ میں نے کہا: ''علی رضا تم سو گئے''۔

بولا: ''نہیں!''

میں نے کہا: ''پھر جواب کیوں نہیں دیتے''۔

کہا: ''سڑک کا تماشہ دیکھ رہا ہوں''۔

''یہیں بابا جان کا کارخانہ ہے۔ یہ عمارت بڑی ہے''۔

علی رضا کو گویا یقین نہیں آ رہا تھا۔ اسی طرح آنکھیں گول گول کیے ہوئے حیرت زدہ در و دیوار اور کارخانہ کی اُن کھڑکیوں کو جن پر سوت کے ٹکڑے اور روئی چپکی ہوئی تھی تک رہا تھا۔

''ہم لوگ چلیں۔ بابا کو چل کر دیکھیں؟ جانے دیں گے؟''

''ہاں کیوں نہیں جانے دیں گے؟ مگر یوں ہی چلیں؟ کیا کہیں گے؟''

''چلو دیکھتے ہیں... دیکھیں بابا ہیں؟''

''ہاں! وہ تو ہیں ہی جائیں گے کہاں؟''

محسن بھی، جو آگے چل رہا تھا، مڑا: ''کیوں تم لوگ دھیرے ہو گئے؟''

''کچھ نہیں، علی رضا کو بابا کا کارخانہ دِکھا رہا تھا''۔

محسن نے کارخانہ پر نظر ڈالی اور کہا: ''تمھارے بابا کا کارخانہ ہے؟ تمھارے بابا یہیں کام کرتے ہیں؟''

جب دیواروں پر روئی کو دیکھا تو پوچھا کہ ''دھاگہ تیار کرتے ہیں؟ روئی سے دھاگہ تیار کرتے ہیں؟''

میں نے کہا: ''نہیں کپڑا بُنتے ہیں۔ چھینٹ۔ تمھیں پتہ ہے کہ چھینٹ کیا ہے؟''

محسن نے کچھ سوچا پھر ایکدم سے جیسے کہ کچھ یاد آ گیا ہو بولا: ''چلو ریس لگاتے ہیں۔ آتے ہو ریس لگائیں''۔

جب تک چلوں اور کہوں کہ اس طرح نہیں ہوتا میں نے دیکھا کہ پیڈل گر گئی۔

تیزی سے جتنا جلدی ممکن ہو سکتا تھا اسے کسا اور وہاں تک پہنچا اور بولا: ''اس طرح سے مقابلہ نہیں ہوتا۔ ہمارے اوپر دو سواری ہے۔ اس کے علاوہ تمھاری سائیکل

ریس والی ہے، اس کے گیئر میں، دانت زیادہ ہیں۔ یہ مقابلہ نہیں ہوا''۔

اس نے کہا: ''ٹھیک ہے! تمھاری سواری کیسی بھی ہو مگر ہے تو سائیکل ہی اور پھر بڑی بھی ہے، تو تم جلدی پہنچو گے''۔

میں نے چاہا کہ کہوں کہ چھوٹا بڑا کیا ہے، لیکن دیکھا کہ جو کچھ بھی ہو مقابلہ میرے نفع میں ہے۔ جتنا جلدی ہم لوگ پہنچیں گے اُتنا ہی زیادہ ہم اپنے وقت بچاتے ہوئے پیسہ کا اور استعمال کر لیں گے۔ یعنی ہم اتنے ہی وقت میں اور جگہوں پر بھی گھوم لیں گے۔ میں نے کہا: ''چلو ہو جائے مقابلہ''۔ سائیکل اتنی تیزی سے چلائی کہ کب کس طرح ہم لوگ میدان 'اعدام' میں پہنچ گئے۔ پتہ ہی نہ چلا وہاں ہم لوگوں کی سانس نہیں آ رہی تھی۔ محسن آگے چلا گیا تھا اور اکیلا ہی چلا جا رہا تھا۔ ہم جتنا ہی زور لگاتے تھے مگر اپنے آپ کو اس کے برابر نہیں پہنچا پا رہے تھے۔ اس کی سائیکل ریس والی تھی، ہلکی تھی۔ میں مجبوراً اس کھٹارا سائیکل کو کھینچ رہا تھا۔ اس پر موٹے علی رضا نے اسے اور بھی بھاری کر دیا تھا اور اس کی بریک پر دباؤ ڈال رہا تھا۔ ایک مرتبہ میں جھنجھلاتے ہوئے پھولتے ہوئے دَم کے ساتھ اس سے تیز آواز میں بولا: ''ہینڈل کو دھیمے پکڑو موٹو، تمھیں کیا ہو گیا ہے؟ کیا تمھیں ڈر لگ رہا ہے کہ گر جاؤ گے؟'' بے چارہ علی رضا کو خیال آیا کہ میں تھک چکا ہوں اور مجھے غصہ آ رہا ہے۔ جلدی سے سنبھل گیا اور دھیرے سے پوچھا: ''اب ٹھیک ہے؟'' سچ مچ میرے دل میں ان کے لیے رحم آیا۔ میں نے اُن کو اس طرح کا مظلوم اور بات سہنے والا نہیں دیکھا تھا۔ جیسے ہی کچھ آگے بڑھے میں نے کہا: ''علی رضا! گھنٹی بجاؤ۔ یہ ٹھیلے والا کنارے ہٹے''۔

علی رضا کو پہلے تو اس بات کا یقین ہی نہیں ہوا کہ میں نے اس سے گھنٹی بجانے کے لیے کہا ہے۔ پھر تو گویا پوری دُنیا اس کو دے دی گئی ہو۔ تیز تیز گھنٹی بجانے لگا۔ دھریرنگ... دھریرنگ۔

''ٹھیک ہے بس''۔

دھریرنگ... دھریرنگ...

ایک آدمی مڑا، اس نے کچھ ہم لوگوں سے کہا: ''لیکن میں نے سمجھا نہیں''۔

''رُکو ٹھہرو۔ دیکھیں آخر یہ کیا کہہ رہا ہے''۔

''اے بچہ...!''

''کہہ رہا ہوں کہ پیچھے کا پہیہ پنکچر ہوگیا ہے؛ پنکچر۔ تمھارا پچھلا پہیہ پنکچر ہوگیا...''

سائیکل پر بیٹھے بیٹھے میں نے پچھلے ٹائر پر نظر ڈالی، دیکھا کہ ٹائر زمین سے چپکا ہوا ہے۔ دھریرنگ... دھریرنگ... دھری...

غصّہ میں زوردار ایک تھپڑ علی رضا کے گال پر مارا۔ ''کچھ خبر ہے احمق اتنی گھنٹی پر گھنٹی بجا رہے ہو... دیکھا تم نے کہ کیا ہوگیا ہے۔ بے فائدہ گھنٹی بجا رہے ہو نتیجہ ہوا کہ گاڑی پنکچر ہوگئی۔ نیچے اُترو۔ جلدی اُترو''۔

سائیکل میں نے علی رضا کو پکڑائی اور خود ہی ٹائر دیکھنے لگا: ''ارے ہاں یہ تو پنکچر ہوگئی۔ اب یہ نئی مصیبت سر پر آ گئی۔ اس طرح تو آگے نہیں جایا جاسکتا اور واپس حسن سائیکل ساز کے پاس جانا بھی مشکل ہے۔ ایک صاحب جو سڑک کے کنارے سگریٹ بیچ رہے تھے اُن سے میں نے پوچھا: ''یہاں کوئی پنکچر بنانے کی دُکان ہے؟ سائیکل کی مرمت کی؟''

سگریٹ فروش نے کہا: ''سائیکل مرمت! کیا کام ہے؟ پنکچر ہوگئی؟''

میں نے کہا: ''ہاں!''

''کیا آپ جانتے ہیں کہ کہاں ہے؟ ہاں! اوپر گلوبند ک چوراہے کے پاس''۔

''یہاں سے کتنی دُور ہے؟''

''نزدیک ہے۔ دو تین اسٹاپ سے زیادہ نہیں''۔

اسی درمیان محسن واپس آیا اور پوچھا: ''کیا ہوا؟ کیوں کھڑے ہو؟''

میں نے منہ بنا کے کہا: ''دیکھ رہے ہو یہ لعنتی پنکچر ہوگئی ہے۔ اور ہم لوگ معطل ہوگئے ہیں''۔

''سوار نہیں ہو سکتے؟ اسی طرح دھیرے دھیرے لے آؤ گے؟''

''نہ بابا۔ دھیرے دھیرے کیسے آئیں؟ ٹیوب اور خراب ہوجائے گا''۔

''پھر اسی طرح کھڑے رہو گے؟ کھڑے رہنے سے کیا فائدہ؟ دیر ہو رہی ہے''۔

''کوئی چارہ نہیں ہے، تمھیں بتاؤ اب ہم لوگ کیا کریں؟''

چند منٹ ہم لوگ کھڑے ایک دوسرے کو یونہی تکتے رہے اور اپنی بدبختی پر لعنت بھیجتے رہے۔ آخر میں محسن بولے: ''تمھیں پتہ ہے کہ وقت کیا ہو رہا ہے؟ ساڑھے دس بجے ہیں! دوپہر ہو رہی ہے۔ ایک کام کریں۔ کم از کم ہم میں سے ایک آدمی تو وہاں پہنچ جائے اور نام لکھوائے۔ اس طرح ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کام نہیں ہوگا''۔

میں نے دیکھا جیسے اس کا دل دھڑک رہا ہے۔ میں نے کہا: ''ٹھیک ہے تم جاؤ، ہم بھی جلدی ہی پہنچتے ہیں۔ کہیں اس بے ایمان کا پنکچر ٹھیک کراتے ہیں۔ ہمیں پتہ معلوم ہے۔ تمھارے پیچھے پیچھے پہنچتے ہیں۔ کیا یہ ٹھیک نہیں؟''

محسن کو ایسا لگا جیسے ایک بھاری بوجھ اس کے کندھے سے اُٹھالیا گیا ہو چین کی سانس لیتے ہوئے بولا: ''ہاں ہاں یہ بہتر ہے۔ مجھے بھی بابا کی دُکان پر کچھ کام ہے۔ بس میں گیا اور آیا، جب تک تم لوگوں کا کام بھی ہوجائے گا۔ بس دیر نہ کرو، جلدی چل پڑو''۔

اور خود سائیکل کے ساتھ تیزی سے اوجھل ہوگیا۔

محسن تو چلا گیا۔ میں نے بھی علی رضا کو آواز دی وہ سڑک کے کنارے بیٹھا ہوا تھا۔ اور ہم لوگ پیدل چل پڑے۔

سوچنے لگا، افسوس پانچ تومان کے لیے کتنے منصوبے بنائے تھے... وہی پنکچر میں خرچ کرو۔

سائیکل ساز بھی ایسا بوڑھا پھوس تھا کہ ایک پیچ ایک سال میں کھولتا۔ آخر میں نے اور علی رضا نے اس کی مدد کی۔ نائر کو نکالا۔ بدقسمتی سے مجھے اتنی بھوک لگی تھی کہ کمزوری محسوس ہونے لگی۔ وہ ایک ٹکڑا روٹی، جو ماں نے علی رضا کی جیب میں ڈال دی تھی، اس سے لی اور اپنے منہ میں ڈالی۔ جان میں جان آئی۔ میں نے جب دیکھا کہ بوڑھا مستری بڑے اطمینان سے سائیکل کا کام کر رہا ہے تو دوبارہ مجھ میں جان نہ رہی۔ اپنے آپ سے بولا اگر ہم لوگ پیدل چلتے ہوتے تو اب تک پہنچ چکے ہوتے۔ خلاصہ جب تک ہم لوگ چلنے کے لائق ہوئے تو بج گئے گیارہ۔

میں نے کہا: ''علی رضا جلدی کرو، اُڑے چلو کہ دیر ہو رہی ہے'' علی رضا بھی اللہ کی مدد سے اتنا تیز چلے کہ سائیکل ہاتھ سے چھوٹ جائے۔ میں نے کہا: ''دیوانہ! تمھیں کیا ہو گیا ہے؟ دھیمے چلو۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ سائیکل کے ساتھ زمین پر آ رہو''۔

میں نے روٹی کھائی تھی اس لیے مجھ میں طاقت آ گئی تھی۔ پلک جھپکتے ہی توپ خانہ چوراہے پر پہنچ گئے تھے۔ سامنے کی سڑک سے بائیں طرف جاؤں کہ دائیں طرف کہ اتنے میں علی رضا نے کہا: ''بھائی، بھائی! محسن... محسن... وہاں ہے''۔

محسن سڑک کے داہنی طرف جا رہا تھا۔ تیر کی طرح اس کے پاس ہم لوگ پہنچے۔ ایک پتلی سڑک پر پہنچے۔ پھولتی ہوئی سانس سے اس سے پوچھا: ''تم کیوں پیچھے رہ گئے؟ ہم لوگ تو ابھی یہاں پہنچے ہیں؟''

''بابا کو کام زیادہ تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ اپنے دوست سے مجھے ملوائیں اور مجھے ایک سفارشی خط دلوا دیں''۔

''سفارشی خط! کس لیے؟''

''اسی مدرسہ کے لیے۔ کیا تم نے اپنے بابا سے نہیں لیا؟''

''نا۔ معرفی نامہ کی کہاں بات ہوئی تھی۔ تم نے تو کہا تھا کہ صرف بائیو ڈیٹا، آئی کارڈ میرا اور بابا کا۔ تم نے معرفی نامہ کو تو نہیں کہا تھا''۔

''معلوم ہے۔ میں خود بھی نہیں جانتا تھا۔ بابا نے مجھ سے ابھی کہا: احتیاطاً رکھ لو۔ تمھارے پاس ہونا چاہیے''۔

میں اس پر بہت جھنجھلایا۔ اگر وہ میرا دوست نہ ہوتا تو اس کو میں مار دیتا اور سائیکل سے نیچے پھینک دیتا۔ غصہ کی وجہ سے میری آواز تھرتھرا گئی۔ میں نے کہا: ''کہاں ہے؟ لاؤ دیکھوں کیا ہے؟''

اس نے کہا: ''یہ ہے، جیب میں ہے''۔

مجھے اور زیادہ غصہ آیا۔ میں نے کہا: ''مجھے پتہ ہے کہ تمھاری جیب میں ہے لیکن جیب میں ہونے سے تو دِکھے گا نہیں''۔

وہ سڑک کے کنارے کھڑا ہوا اور میں بھی اس کی بغل میں۔ اپنی جیب سے لیٹر ہیڈ پر لکھا ہوا ایک کاغذ نکالا۔

''لاؤ دیکھوں''۔ میں نے اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔

اس نے کہا: ''دھیان سے، پھٹ نہ جائے۔ اگر ہاتھ میں پسینہ ہے تو اس پر ہاتھ نہ لگانا۔ کہیں روشنائی پھیل نہ جائے''۔

اس کی بک بک سننے کا حوصلہ نہیں تھا۔ میں نے کہا وہ مجھے پتہ ہے''۔ میں نے پڑھنا شروع کیا۔ کالی روشنائی سے لکھا ہوا تھا:

برادر گرامی جناب مستطاب آقائے ولایتی

پرنسپل مدرسۂ صفوی

سلام علیکم

حاجی آقا جواہری ہمارے خاص معتمدین میں سے ہیں جن کا میں آپ سے تعارف کرا رہا ہوں۔موصوف ہر لحاظ سے متدیّن، امانتدار اور صاحبِ فضیلت ہیں۔ اُن کے صاحبزادے آغا محسن جواہری بھی ذہانت و ذکاوت، علمی اور معلوماتِ عامہ کی استعداد میں اپنے والد محترم کے نقشِ قدم پر ہیں۔تعلیم کے سلسلہ میں آپ سے متعارف کرایا جارہا ہے۔اس ضمن میں میں ان کے حسب و کردار کی پوری ضمانت لیتا ہوں۔خداوند کریم کی بارگاہ میں آپ کا یہ عمل مقبول اور اجر محفوظ ہو کہ آنحضرتؐ نے فرمایا ہے:

"من اصبح لم یهتم بامور المسلمین فلیس بمسلم. اجر کم عندالله"۔

آپ کا برادر حقیر

فرشیان

مجھے یہ اچھا نہیں لگا اور دل میں آیا کہ اس خط کو پرزے پرزے کردوں۔ میں نے کہا: ''ٹھیک ہے، تم ان سے میرے لیے بھی لکھوا لیتے''۔

''نہیں ہوسکتا تھا کیونکہ ان کے لیے تمھارا جاننا ضروری تھا۔ دیکھو انھوں نے پہلے میرا نام لکھا ہے، آقائے محسن جواہری۔اس کے بعد انھوں نے میری ذہانت اور میری استعداد کے بارے میں لکھا ہے۔ لاؤ میں تمھیں دِکھاؤں...'' اور چاہا کہ کاغذ کو میرے ہاتھ سے لے لیں؛ میں نے دیا نہیں، اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ یک بیک اس کے چہرہ کا رنگ اُڑ گیا۔اس کا ہونٹ کانپنے لگا اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھر گئے۔ میں نے دیکھا کہ وہ رو پڑے گا۔ میں نے اس کا کاغذ اسے لوٹا دیا اور کہا: ''لو بابا! میں نے مذاق کیا تھا۔تم کتنے بھولے ہو''۔

کاغذ اس نے لیا، جلدی سے اپنی جیب میں رکھا اور اپنی سائیکل پر سوار ہو کر چل پڑا۔ نہ تو مجھ سے بات کی اور نہ ہی مجھے اور علی رضا کو دیکھا۔جیسے ہم لوگوں سے ناراض

ہوگیا ہو۔ میں نے کہا: ''بہت غصّہ کرتا ہے''۔اس کے بعد میں نے سوچا تمام عمر اس سے دوستی نہیں کروں گا۔علی رضا نے پوچھا: ''بھائی تم اسے کاغذ دینا نہیں چاہتے تھے؟''

''مجھے کیا ضرورت ہے۔میرے پاس خود میری مارکس شیٹ ہے۔میری پرسنٹیج اچھی ہے۔ مجھے سفارش کی کیا ضرورت''۔بعد میں میں نے سوچا کہ اگر ایسے ایسے سینکڑوں سفارش نامے لائے تب بھی اس پرسنٹیج کی برابری نہیں کرسکتا۔

جب چوراہے پر پہنچا تو میں نے دیکھا کہ مجھے راستہ نہیں معلوم تھا۔اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ہم لوگ بھٹک گئے تھے۔ دِل ہی دِل میں شرمندہ ہوا اور سوچا بہت غلط ہوا۔ ہم لوگوں کو محسن کے ساتھ ہی رہنا چاہیے تھا۔

ایک اخبار فروش سے میں نے پوچھا: ''بھائی معاف کرنا، چوراہا...'' بہت سوچا مگر اس چوراہے کا نام ہی نہ یاد آیا۔اس نے پوچھا: ''کیا؟ کون سا چوراہا''۔

میں نے کہا: ''سچ تو یہ ہے کہ میں بھول گیا۔اس طرف کون کون سے چوراہے ہیں؟'' اصلاً اس نے میری بات نہیں سنی کہ میں نے کیا کہا۔یونہی بولا: ''مجھے نہیں معلوم، آگے جاؤ، کسی اور سے پوچھ لو''۔

ہم لوگ آگے بڑھے۔ایک سنسان سڑک پر پہنچے۔اس کے دونوں طرف درخت تھے اور شفاف پانی داہنی طرف نہر میں بہہ رہا تھا۔ٹھنڈے ٹھنڈے نسیم کے جھونکے چہروں کو مس اور طبیعت کو مسرور کر رہے تھے۔ میں نے کہا: ''علی رضا دیکھو فضا کتنی صاف ستھری ہے۔کاش رات تک اسی سڑک پر سائیکل چلاتے! ہے نا؟''

علی رضا نے کہا: ''ہاں!'' پھر جیسے انھیں کچھ یاد آ گیا ہو۔بولے: ''بھائی ہمارا ساتھ چھوڑ کر تم دوسرے مدرسہ میں چلے جاؤ گے؟''

میں نے کہا: ''ہاں۔ میں چلا جاؤں گا۔وہاں جا کر ترقی کروں گا''۔

''ترقی کرو گے، یعنی کیا کرو گے؟''

''ترقی، یعنی میں وہاں جاؤں گا تو وزیر اور ممبر آف پارلیمنٹ بنوں گا۔ اپنے ملک کی ایک اہم شخصیت بنوں گا''۔

''یہ سب ہو جائے گا تو پھر کیا ہوگا؟''

''سائیکل اُف یہی...''

''بہتر گاڑیاں خریدوں گا۔ میں نے ایک بار ممبر پارلیمنٹ کو گاڑی میں سوار دیکھا۔ کیا گاڑی تھی! کمال کی تھی!''

''میں نے بھی دیکھا تھا''۔

''تم نے! نہیں تم نے کہاں سے ممبر پارلیمنٹ کو دیکھا تھا''۔

''پھر تم میرے لیے سائیکل خریدو گے؟''

''ہاں؛ پھر کیا پیسہ جب ہوتا ہے تو آدمی سب کچھ خرید لیتا ہے''۔

''اس وقت میں بھی تمھارے اسکول میں آؤں گا''۔

''ہمارے اسکول میں کوئی تمھیں گھسنے بھی نہ دے گا۔ وہاں جانے کے لیے عقل زیادہ ہونی چاہیے۔ تم ابھی بدھو ہو۔ تمھیں تو بابا جان کی سائیکل پر سوار ہونا بھی نہیں آتا۔ تمھاری صلاحیت بہت کم ہے۔ جب عقل و ہوش بڑھے گا تب تمھیں داخلہ ملے گا''۔

''میں بھی خوب کھانا کھاؤں گا تاکہ میری صلاحیت زیادہ ہو جائے''۔

''وہاں لوگ خود ہی خوراک دیتے ہیں لیکن پہلے تمھاری صلاحیت تو زیادہ ہو اور داخلہ تو ملے۔ اچھی غذائیں تو وہ خود ہی کھلائیں گے''۔

ابھی ہم لوگ سڑک کے آخری کنارے تک نہیں پہنچے تھے کہ دیکھا کہ محسن کی سائیکل زمین پر گری پڑی ہے اور وہ خود بیٹھا ہوا ہے اور سائیکل کے ساتھ زور لگا رہا ہے۔

ایک دو لڑکے علی رضا کی قد و قامت کے اس کے سامنے کھڑے اسے تک رہے تھے۔ میں نے چاہا کہ میں رُکوں نہیں اور اُسے نظر انداز کر کے آگے بڑھ جاؤں لیکن یہ

مناسب نہیں تھا۔ میں نے سوچا کہ کم از کم یہ دیکھوں تو سہی کہ اس پر کون سی بلا نازل ہوئی۔

آگے بڑھا۔ اس کے پاس پہنچا۔ بریک لگائی اور پوچھا: ''ہاں کیا ہوا؟ محسن کے ہاتھ کالے ہو چکے تھے۔ پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ اس نے پشت دست سے پسینہ پونچھا اور بولا:

''پتہ نہیں، کم بخت چین اُتر گئی ہے اور اس نے ہم کو معطّل کر دیا ہے''۔

میں نے کہا: ''چین بھی کوئی بات ہے۔ ہمارا علی رضا بھی اس کو چڑھانا جانتا ہے''۔

اس نے کہا: ''نہیں اس میں فرق ہے۔ یہ ویسی نہیں ہے کہ فوراً ٹھیک ہو جائے''۔

اس کی چھوٹی رنگ میں چار دانت ہیں۔ یونہی اسے چڑھایا نہیں جا سکتا۔

سائیکل سے اُترا اور اُسے علی رضا کو پکڑایا۔ میں نے کہا: ''ایک طرف سرکو۔ رنگ ونگ کیا چیز ہے۔ ارے سائیکل تو سائیکل ہے۔ ہٹو ابھی اسے تمھارے لیے ٹھیک کرتا ہوں''۔

سائیکل کو پھر اُونچا اُٹھایا اور میں نے کہا: ''اسے اُوپر سے پکڑو''۔

''خاک برسر... لعنت بھیجو''۔ اُسے یہ بھی نہیں پتہ تھا کہ اسے کیسے پکڑیں؟ میں نے کہا کہ ''جاؤ اور میری سائیکل پکڑو اور وہاں سے میرے پاس علی رضا کو بھیجو''۔

علی رضا تو خود یہی چاہ رہے تھے۔ فوراً لپکے ہوئے آئے۔ میں نے کہا:

''میں اسے پکڑتا ہوں اور تم پیڈل کو گھماؤ۔ یا اللہ!''

اس نے کہا: ''ٹھیک!'' اس کے بعد پیڈل چلانے لگا۔ میں نے اسی طرح دھیرے دھیرے چین کو پہلے دندانے پر چڑھایا، لیکن ایک دو چکر لگا کر چین پھر اُتر جاتی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ فری کے دانت خراب ہو گئے ہیں۔

''تم نے کیا کیا ہے۔ اس کے دانت خراب کر دیئے''۔ بیچارہ بچہ ڈر گیا۔ ایسا ڈر گیا گویا اپنے استاد کے سامنے ڈرے۔ بولا: ''نہیں، نہیں۔ میں نے تو صرف ایک دندانے پر چڑھایا تھا۔ ہاں یہی ہوا ہے۔ اچھا تو ایسے لگتا ہے تم نے اس کی چین بڑی کر دی ہے...''

میں نے علی رضا سے پھر کہا: ''اچھا اب گھماؤ، دیکھوں اب کیا ہوتا ہے؟''

اب کی بار میں نے ڈنڈا نیچے کیے اور پھر چین کو چڑھایا۔ کئی بار میں نے خود پیڈل گھمائی، اس بار چین اپنی جگہ پر فٹ ہوگئی۔ پھر محسن کو تھما دیا۔

محسن بولا: ''ارے کتنا معمولی کام تھا۔ خدا آپ کو ہر زحمت سے بچائے۔ شکریہ!''

میرے ہاتھ چکنے اور کالے ہوگئے تھے۔ مٹی مَل کر نہر کے پانی سے دھویا اور سب ساتھ چل پڑے۔

○

سورج بالکل ہماری پشت پر تھا اور سر کو جلا رہا تھا۔ ہم لوگ پریشان ہو رہے تھے مگر جب اسکول یاد آجاتا تو یہ تھکن اور گرمی سب بھول جاتے تھے۔ سڑک کے ختم تک پہنچتے ہی محسن بولا: ''اسکول وہاں ہے''۔

کئی پیڈل تیز چلائی اور ہن ہن کرتے ہوئے اسکول کے سامنے پہنچا۔ دوپہر ہونے والی تھی۔ پسینہ پانی کی طرح ہم لوگوں کے سر و چہرے سے ٹپک رہا تھا۔ علی رضا کا چہرہ تو گرمی سے تمتما رہا تھا۔ میرا دل اس کے لیے کڑھا۔ میں نے اس سے کہا: ''ادھر آجاؤ سایہ میں۔ پھر ہم لوگ سائیکل سواری کر سکیں گے''۔

ایک بوڑھا اسکول کے سامنے کرسی ڈالے ہوئے درخت کے سایہ میں بیٹھا تھا، بولا: ''ہاں کیا کام ہے؟''

محسن نے کہا: ''نام لکھوانے آئے ہیں''۔

''نام لکھوانا، کیا مطلب؟''

''کچھ نہیں۔ نام لکھوانا ہے۔ ہم لوگ یہاں اپنے داخلہ کے لیے آئے ہیں''۔

''اس وقت کیوں؟''

''میں نے کہا: ''ہم لوگوں کی سائیکل پنکچر ہوگئی تھی۔ پہلے نہیں آسکے''۔

''میں کہتا ہوں جلدی کیوں نہیں آئے؟ کل، پرسوں، ایک ہفتہ پہلے''۔

''آخر...''

''جاؤ اندر جاؤ۔ خود ہی دیکھو وہ لوگ کیا کہتے ہیں؟''

''برآمدہ میں داہنی طرف۔ تیسرا دروازہ۔ چانس لے لو؛ کچھ منٹ اور دیر سے پہنچے...''

میں کچھ سننے کے لیے رُکا نہیں۔ علی رضا کو ہم لوگوں نے سائیکل کے پاس ہی چھوڑا اور ہم لوگ اسکول کے صحن میں دوڑ پڑے۔

بظاہر دوسرے اسکولوں کے مقابلہ میں کوئی فرق نہیں تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ بالکل ہی کچھ فرق نہیں تھا۔ اس کا گراؤنڈ ہمارے اسکول کی گراؤنڈ سے بہت بڑا تھا۔ اس کی عمارت نئی تھی۔ لیکن اس طرح جیسا میں نے سنا تھا کہ یہاں سبھی بچے وزیر اور ایم پی کے ہوتے ہیں اس تناظر میں بڑا نہیں تھا۔

بڑی احتیاط سے سیڑھیوں سے چڑھ کر اوپر گئے۔ ہم دونوں ڈر رہے تھے کہ کہیں کوئی ایسا نہ ملے جو ہماری کالر پکڑ کر کہے کہ تمھیں اس اسکول سے کیا مطلب؟ چوروں کی طرح دبے دبے قدموں سے برآمدہ میں داہنی طرف کو تیسرے دروازہ پر پہنچ کر سانس لی۔ محسن نے کہا: ''تم دروازہ کھٹکھٹاؤ''۔ میں نے کہا: ''میں! کیا تم کو ڈر لگتا ہے؟''

میں نے دَق الباب کیا۔ آواز آئی: ''اندر تشریف لائیے''۔

دوبارہ کھٹکھٹایا: ''تشریف لائیے''۔

دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوئے۔ ایک صاحب چشمہ لگائے جن کے بال سفید تھے اور داڑھی کھچڑی تھی۔ میز سے لگے تھے۔ چشمہ کے پیچھے سے ایک نظر ہم لوگوں کے قیافہ پر ڈالی، بولے: ''فرمائیے!''

محسن نے کہا: ''ہم لوگ... اگر اجازت ہو ہم لوگ... میں...''

میں نے دیکھا کہ محسن کی لکنت ہی کام خراب کردے گی۔ میں نے کہا: ''جناب اجازت، ہم لوگ اپنا نام اس اسکول میں لکھوانے آئے ہیں''۔

''اوہ اوہ... نام لکھوانے آئے ہیں... تم دونوں بھائی ہو؟''

میں نے کہا: ''نہیں جناب۔ ہم دونوں ایک ہی محلّہ کے ہیں''۔

''ہاں کس محلّہ سے؟... ٹھیک ہے کوئی بات نہیں۔ مگر تنہا کیوں آئے ہو؟''

محسن اب ذرا دلیر ہوئے اور بولے: ''تنہا... تنہا نہیں آیا ہوں۔ جناب اجازت ہو، ہم دونوں ساتھ آئے ہیں۔ ان کے بھائی بھی آئے ہوئے ہیں، وہ بھی باہر کھڑے ہیں''۔

چشمہ والے نے پوچھا: ''آپ کے بھائی آپ سے بڑے ہیں؟''

میں نے کہا: ''نہیں جناب، اسے چھوڑیئے وہ ابھی چھوٹا ہے، دوسری کلاس میں ہے''۔

چشمہ والے نے سر ہلایا اور بولا: ''کوئی بات نہیں۔ ہمارے اسکول میں داخلہ کی شرطیں اس شیشہ کے نیچے ہیں جو سیکنڈری کے پہلے درجہ میں داخلہ کی ہیں۔ اسے لکھئے، اسی ہفتہ میں جلد سے جلد ان تمام کاغذات کو لے کر اپنے والد کے ساتھ رجسٹریشن کے لیے تشریف لائیے''۔

میں خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا۔ اصلاً مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اتنی آسانی سے وہ ہمیں قبول کرلیں گے۔ میں آگے بڑھا اور وہ کاغذ جو شیشہ کے نیچے لگایا ہوا تھا اس کو میں نے پڑھا۔ اتنا خوش تھا کہ مجھے اصلاً سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ لکھا کیا ہے؟ سراسیمگی میں بولا: ''معاف کیجیے، میرے پاس کاغذ اور قلم نہیں ہے''۔

محسن بھی اس لیے کہ کہیں مجھ سے پیچھے نہ رہ جائے بولا: ''جناب کچھ دن پہلے ہمارے والد یہاں کاغذات لائے تھے۔ آج ہم کچھ اور کاغذات لائے ہیں جو انھوں نے دیئے ہیں''۔

پھر اس نے چشمہ والے کو سفارش نامہ دیا۔ چشمہ والے نے سفارش نامہ کو پڑھا اور سر ہلایا اور بولا: ''تم سارے سرٹیفکیٹ پہلے لا چکے ہو؟ ٹھیک ہے، پھر میں اس کو بھی اسی میں رکھ دوں گا۔ تمھیں اب کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے''۔

میں نے بھی کام میں دیر نہیں کی۔ میں نے اپنی مارکس شیٹ نکالی اور میز پر رکھ دی اور عرض کیا: ''جناب اجازت ہے۔ ہم بھی مارکس شیٹ لائے ہیں۔ میری پرسنٹیج ساڑھے اٹھارہ ہے''۔

انھوں نے مارکس شیٹ لی اور میرا دل دھڑکنے لگا۔ دھیرے سے نیچی نظروں سے دیکھا وہ میرے نمبر دہرا رہے تھے اور دھیرے دھیرے سر ہلا رہے تھے۔ پھر مجھے سکون ملا کہ ہمارے نمبر انھیں پسند آ گئے اور میں نے اطمینان سے شیشہ کے نیچے کی شرطوں کو لکھنا شروع کیا۔

۱. پرسنٹیج پندرہ سے زیادہ ہونی چاہیے۔
۲. درخواست کنندہ کی علمی صلاحیت کو جانچنے کے لیے ایک تحریری امتحان اور ایک انٹرویو ہوگا۔
۳. درخواست کنندہ اس علاقہ میں سکونت رکھتا ہو۔

''... سکونت رکھتا ہو...'' بے اختیار میرے ہاتھ سست پڑ گئے اور ایک بار میں نے پھر جملہ اپنی زبان پر دہرایا۔ چند لحظہ اسے حیرت سے دیکھتا رہا۔ اپنی تصویر کو اس شیشہ میں دیکھا کہ کیسی تھی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اگلی شرط کو میں نہیں پڑھ سکا جو فیس سے متعلق تھی۔ شاید لکھا تھا کہ درخواست کنندہ پر لازم ہے کہ ماہانہ مبلغ دس ہزار ریال بابت...

میری تصویر شیشہ میں میرا منہ چڑا رہی تھی۔ اپنے بال پوائنٹ کو میں نے میز پر چھوڑا اور اپنی مارکس شیٹ جو میز پر تھی اسے اُٹھالیا۔

چشمہ والے نے کہا: ''شاباش! ٹھیک ہے بہت خوب۔ کوشش کرو۔ تم بھی جلدی سے اپنے بابا کو رجسٹریشن کے لیے لاؤ۔ اگر یہ ہفتہ گذر گیا تو پھر دیر ہو جائے گی اور ایسی صورت میں ہم تمھارا داخلہ لینے سے معذور ہوں گے۔

مارکس شیٹ کو اپنی جیب میں رکھا اور باہر نکل کر آیا۔ مجھے یہ بھی یاد نہیں کہ میں نے خدا حافظ بھی کہا کہ نہیں۔ یہ بھی حوصلہ نہ رہا کہ اتنا انتظار بھی کرلوں کہ محسن بھی آجائے۔

علی رضا کمپاؤنڈ میں آ گیا تھا اور چند کوؤں کو جو چنار کے بڑے سے درخت پر بیٹھے تھے، پتھر مار رہا تھا۔ جیسے ہی مجھے دیکھا دوڑتا ہوا میری طرف آیا اور کوروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا: ''باغیچہ میں آئے تھے کوروں کا کھانا کھانے! پھر پوچھا: ''چلیں؟''

میں نے سر ہلایا۔ اس نے کہا: ''سب ہوگیا؟'' میں نے کہا: ''ہاں!'' باہر جب نکلے بوڑھا بولا: ''بیٹے کیا ہوا؟ آپ کا نام لکھ گیا؟'' میں نے کہا: ''نہیں!''

وہ بولا: ''پھر کیوں؟ کیا آقا جیتی نہیں تھے؟''

یونہی مسکراتے ہوئے میں نے کہا: ''کیوں نہیں! سرٹیفکیٹ نہیں تھی میرے پاس... پھر کسی دن بالآخر...''

میں نے علی رضا سے کہا: ''چلو بیٹھو چلیں''۔

اس نے پوچھا: ''محسن نہیں آ رہا ہے؟''

''کیوں نہیں۔ میرے پیچھے پیچھے آ رہا ہے۔ ہم لوگ چلیں، وہ خود ہی ہمارے پیچھے آئے گا''۔

پیڈل پر جیسے ہی میں نے پیر رکھا مجھے حسن سائیکل ساز یاد آ گیا۔ بوڑھے آدمی سے میں نے پوچھا: ''آپ کے پاس گھڑی ہے؟''

اس نے کہا: ''گھڑی؟...'' اور مڑا اپنی جیکٹ کی جیب سے ایک زنجیر دار گھڑی باہر نکالی اور بولا: ''بارہ اور... پورے بارہ، بیٹے، پورے بارہ''۔

میں نے کہا: ''علی رضا دوڑ چلو، آدھے گھنٹہ سے زیادہ میرے پاس وقت نہیں ہے''۔

علی رضا نے کہا: ''کیا ہم سڑک پر گھومیں گے نہیں؟''

میں نے کہا: ''نہیں۔ اس کا موقع نہیں ہے''۔

علی رضا نے پھر کہا: ''بھائی اس کے بعد...'' آدھی بات منہ میں کھا گیا پھر وہ اس وقت تک کچھ بولا نہیں جب تک کہ ہم لوگ دوبارہ درختوں سے گھری اس سڑک پر نہیں پہنچ گئے جہاں دو چوڑی نہریں تھیں۔

''کیا اچھی سڑک ہے۔ ہے نہ بھائی!''

''ہاں...''

''ایک مرتبہ سائیکل کرائے پر لیں گے اور ہم لوگ یہیں آ کر چکر لگائیں گے۔ ٹھیک ہے نا بھائی!''

نہ جانے کیوں یک بیک اپنے آپ ہی اس کے لیے میرا دل دُکھ گیا۔ میں نے اپنی ٹھڈی اس کے سر سے چھلائی۔ مجھے پتہ تھا کہ اسے اچھا لگے گا۔ مجھے بھی اچھا لگتا ہے۔ اس سے کہا: ''میں چاہتا ہوں اب تم چلاؤ''۔ علی رضا کچھ بولے نہیں، شاید شرما گئے یا انھیں یقین نہیں تھا، صرف سر ہلایا۔

میں نے سائیکل کو نہر کے کنارہ روکا۔ نہر کا شفاف اور ٹھنڈا ایک چلّو پانی اپنے چہرے پر ڈالا۔ کچھ جان میں جان آئی اور میں بولا: ''آؤ سوار ہو''۔

میں نے سائیکل کے کیریئر کو پکڑا اور اسے ایسا لگا گویا اسے پوری دُنیا دے دی گئی ہو۔ سانپ کی طرح اس نے اپنے آپ کو سائیکل پر کھینچا اور پھر پیر مارنا شروع کر دیا۔

○

میں نے ایک مہینہ کے اندر علی رضا کو بابا جان کی سائیکل پر ہی اسے سائیکل چلانا سکھا دی۔

وہ جمعہ کا دن تھا۔ میں نے دیکھا کہ محسن اپنا سامان نکال رہا ہے۔ میں نے پوچھا:

''کہاں!''

اس نے کہا: ''کہیں نہیں۔ کیا میں نے تم کو بتایا نہیں ہے کہ ہم لوگ شمیران کے موڑ کی طرف منتقل ہو رہے ہیں''۔

''کیا وہاں گھر خریدا ہے؟''

''پتہ نہیں۔ کرایہ پر لیا ہے کہ خریدا ہے۔ بابا جانتے ہیں...''

''کتنا پیسہ دیا؟''

''بابا جانتے ہیں..مجد تم جانتے ہو وہاں لوگوں نے بہت ترقی کر لی ہے۔ میرے بابا کہتے ہیں کہ وہاں لوگ زیادہ ترقی کرتے ہیں''۔

''تمھاری سائیکل کا کیا ہوا؟ وہ بھی لے جاؤ گے؟''

''ہاں! پھر کیا۔ ادھر ہے۔ دیکھ نہیں رہے ہو؟ وہاں سڑک بہت سنسان اور کشادہ ہے۔ سائیکل چلانے میں مزہ آجاتا ہے''۔

محسن نے جدھر اشارہ کیا تھا میں نے اُدھر دیکھا۔ اپنی سائیکل کو سامانوں کے ساتھ رکھ دیا تھا۔

''اس طرح وہ خراب نہیں ہوگی؟''

''نہ بابا۔ وہ مضبوطی سے رکھی ہوئی ہے۔ گرے گی نہیں''۔

''میں سائیکل سے جا رہا تھا؛ اس کا مزہ ہی زیادہ ہے''۔

''سائیکل سے؟ جان ہونی چاہیے۔ چڑھائی میں پیڈل مارنے میں نانی یاد آجاتی ہے۔ گاڑی میں آرام سے بیٹھئے جب آنکھ کھلے گی آپ منزل پر ہوں گے''۔

علی رضا نے آگے بولنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ ''بھائی آپ کھڑے کیوں ہیں میں تھک گیا ہوں''۔

''کیا ہے۔ آیا میں''۔

علی رضا نے دوبارہ اپنے آپ کو سانپ کی طرح کھینچا اور سائیکل پر تیار ہو گئے کہ میں اُن سے کہوں کہ چلو۔ میں نے کیریئر کو پکڑا اور کہا کہ پیڈل چلاؤ۔

''ڈرو نہیں، چلو''۔

''کس طرف؟ اِس گلی سے؟''

''نہیں! سو مرتبہ کہا کہ چڑھائی کی طرف چلو۔ اگر تم چڑھائی پر چڑھنا سیکھ جاؤ تو پھر تمام گلی کوچے اور سڑک پر چلنا تمھیں آسان ہو جائے گا۔ اب پیر مارو...خوب بہت اچھا...چلو، چوراہے کی طرف چلو...شاباش...! شاباش...! پھر...پھر...''

چند قدم اس کے پیچھے پیچھے میں دوڑا۔ میں نے دیکھا کہ وہ اپنے آپ ہی بڑھ رہا ہے۔ کیریئر میں نے چھوڑ دیا۔ میں کھڑا ہو کر تازہ دَم ہوا۔ پھر اسی طرح سانس لے رہا تھا اور اس کے آگے بڑھنے کا منظر دیکھ رہا تھا۔ گرگٹ کی طرح پیچ و تاب کھاتے ہوئے پیڈل چلا رہا تھا۔ وہ بھی بابا کی سائیکل جو میرے قد سے بھی بڑی تھی۔

بے اختیار مجھے ہنسی آگئی۔ زیر لب بولا: ''ہماری طرح علی رضا بھی کتنی اچھی سائیکل چلا رہا ہے۔ بے چارہ!''

○○

شہر سلیمان کا سفر

حشمت خان کا کارخانہ ایک اندھیرے تہہ خانہ میں تھا۔ تہہ خانہ ٹھنڈا، مرطوب اور اس میں گُمسی مہک آتی تھی۔ اتنا ہی نہیں حشمت خان کے اس تہہ خانہ میں خچر کی لید، بیل کا گوبر، چھپکلی، چھچھوندر، بیماری، مکڑی کے جالے، اُون اور مٹّی کے مکان کی بھی مہک آتی تھی۔

ایک چھوٹی لڑکی کئی برس سے وہاں رات دن کام کرتی تھی مگر اس کا دل نہ وہاں رہنے کا چاہتا تھا اور نہ کام کرنے کا، لیکن مجبور تھی، کیونکہ حشمت خاں اس کا خرچ اُٹھاتا تھا۔ اسے کھانے، رہنے اور آرام کی جگہ دیتا تھا۔ اس بھری پری رنگارنگ منقّش دُنیا میں کسی سے کوئی سروکار نہ تھا، نہ اس کے بھائی تھے نہ بہن جو اس کے ساتھ کھیلیں اور نہ ہی ماں باپ جو اس کا ناز اُٹھائیں۔ وہ مجبور تھی کہ وہیں پڑی رہے۔

صبح سویرے مؤذن کی اذان کے ساتھ ہی اس کے دن کا آغاز ہو جاتا تھا اور مغرب کی اذان کے بعد ہی اس کا ہاتھ کام سے رُکتا تھا۔ باوجودیکہ وہ بارہ برس سے زیادہ کی نہ تھی، لیکن اگر اس کا کوئی ہمدم تھا تو نانی حلیمہ تھیں جو اسی کارخانہ میں کام کرتی تھیں اور بس۔ رنگ برنگی خواہشات اس کے ذہن میں اُبھرتیں۔ چھوٹی بڑی اچھی اور خوبصورت تمنائیں جو قالین کے نقش و نگار اور اس کے رنگ سے زیادہ مُنقش اور رنگین تھیں انگڑائیاں لیتی تھیں۔

اس لڑکی کی سب سے بڑی آرزو یہ تھی کہ وہ ایک ایسا غالیچہ بُنے جیسا حضرت سلیمانؑ کا تھا جو ہوا میں اُڑ سکے اور چھتوں کے اوپر سے گذرے، بادلوں کو پار کرے، ستاروں تک پہنچے اور وہ وہاں بلندی پر اپنے ہاتھوں کو پھیلائے اور کچھ چھوٹے چمکدار ستاروں کو توڑے اور اپنے غالیچہ کو انھیں ستاروں سے جگمگائے اور پھر حضرتِ سلیمانؑ کے شہر کو چل پڑے، جہاں پرندوں، چرندوں اور درندوں کے درمیان ایک چھوٹا سا گھر بنائے، اپنے لیے قالین بُنے اور خوشی خوشی دن گذارے۔

نانی حلیمہ کہتی تھیں: ''پیاری بیٹی! اپنے دماغ سے یہ بات نکال دو۔ میں نے تمام عمر اس جگہ کام کیا ہے اور قالین خانہ میں کمرخمیدہ ہوگئی۔ ابھی تک میں نے نہیں سنا کہ کسی نے کہا ہو کہ میں نے ایک ایسا غالیچہ بُنا جو حضرتِ سلیمانؑ کے غالیچہ کی طرح اُڑا ہو... کوئی کیا جانے، ممکن ہے حضرت سلیمانؑ کے غالیچہ کو بھی فرشتے آسمان پر لے گئے ہوں۔ ہمارے غالیچہ کے لیے کس فرشتے کے دل میں چاہ ہوگی کہ وہ اسے اپنے کندھے پر اُٹھائے اور آسمان کی طرف جائے...''

چھوٹی لڑکی نانی حلیمہ کی بات سن کر اُداس ہو جاتی تھی۔ اُس کا دل ٹوٹ جاتا تھا لیکن وہ اس بات پر جیسے یقین نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ یہ پرانے قصّے دوبارہ پیش آئیں۔ وہ چاہتی تھی کہ حضرتِ سلیمانؑ کا قصّہ، دعائے موسیٰ کا قصّہ، حضرتِ عیسیٰؑ کا معجزہ، معصوم فرشتوں کے قصّے، غالیچہ کے اُڑنے کا قصّہ، یہ سب پھر سے ہوئیں۔

بیچاری نانی حلیمہ کو کچھ خبر نہیں کہ چھوٹی بچی کے دل میں کیسے کیسے ارمان ہیں اور اُن کی باتیں اُس کے دل کو توڑ دیتی ہیں۔ اگر انھیں اس کا پتہ ہوتا تو وہ ہرگز ایسا نہ کہتیں؛ اسے تسلی دیتیں، اُسے یقین دلاتیں اور اپنی مادرانہ گفتگو سے اس کے رنج و غم کو بھلا دیتیں۔

ایسی حالت میں وہ لڑکی نا اُمید نہیں ہوتی۔ ہمیشہ وہ کہتی ٹھیک ہے نانی، ٹھیک ہے۔ میں کسی نہ کسی دن ضرور ایسا غالیچہ بُن لوں گی جو حضرتِ سلیمانؑ کے غالیچہ کی طرح

پرواز کرے گا۔

چھوٹی لڑکی راتوں میں اپنے آپ سوچتی رہتی؛ پورا پورا دن سوچتی؛ کام کرتی جاتی سوچتی رہتی؛ سونے کا وقت آ جاتا تب بھی سوچتی۔ ایک رات تو وہ اسی طرح سوچ میں کارخانہ کی دیوار کے ایک چھوٹے سے سوراخ سے آسمان پر ستاروں کو تکتی رہی اور ستارے کی روشنی اس سوراخ سے چنگاری کی طرح اس کے سر پر پڑ رہی تھی اور وہ اسی طرح تکتے تکتے سوگئی۔ صبح کو جب آنکھ کھلی تو اسے رات کی باتیں یاد آ گئیں اور وہ دُعا مانگتی رہی کہ نانی حلیمہ جلدی سے آ جائیں۔

نانی حلیمہ کا سایہ جیسے ہی کارخانہ کی سیڑھیوں پر نظر آیا دوڑی ہوئی آگے گئی اور پوچھا: ''نانی حلیمہ! مجھے دُنیا کی سبھی چڑیوں کی تصویر چاہیے۔ تمھارے پاس ہے؟''

نانی حلیمہ چونک گئیں: ''کیا بات ہے بیٹا! تم نے تو میری جان ہی خشک کردی۔ چڑیوں کی تصویر کس لیے چاہیے؟''

لڑکی نے کہا: ''کچھ نہیں۔ اسی طرح مجھے چاہیے... ضروری ہے''۔

نانی حلیمہ نے بچی کی آنکھوں میں حیرت سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ستارے چمک رہے تھے۔ نانی حلیمہ مسکرائیں اور بولیں: ''اچھا بیٹی، میں جانتی ہوں تمھیں یہ تصویریں کس لیے چاہئیں۔ میں ابھی تم کو یہ دیتی ہوں۔ مگر یہ جان لو بیٹی کہ ان پرندوں سے تمھارا غالیچہ اُڑ نہیں سکتا''۔

نانی حلیمہ کی باتیں نا اُمید کرنے والی تھیں، لیکن لڑکی نے ارادہ پکا کرلیا تھا۔ اسے پہلے سے معلوم تھا کہ نانی حلیمہ یہی کہیں گی مگر وہ مایوس ہونا نہیں چاہتی تھی اور نہ ہی غمگین، اور نہ یہ چاہتی تھی کہ اِن ستاروں کی چمک جو اس کے دل میں تھی وہ ماند پڑ جائے۔

نانی حلیمہ تصویریں لائیں۔ لڑکی نے جلدی جلدی اُن کو دیکھا۔ یا اللہ! سبھی چڑیاں ہیں۔ دُنیا کی رنگ برنگی چڑیاں۔ چھوٹی، بڑی، طوطا، کبوتر، چکور، عقاب، شاہین،

بگلا، ہنس، تیتر، کاکائی، مرغِ حق (اُلو)، سیمرغ 'مور، ہدہد...

خوشی سے اس کی چیخ نکل گئی اور نانی حلیمہ کے جھریٔ دار چہرہ کو چوم ڈالا۔ نانی حلیمہ بھی ہنسیں اور تن کر بولیں: ''کیا بات ہے بیٹی! تم نے تو مجھے بالکل کچل کے رکھ دیا اور گال پر ہلکی سی چپت لگاتے ہوئے بولیں دیوانی ہوگئی ہے! چھوڑ دیکھوں کیا کر رہی ہے... اگر حشمت خاں آئے گا تو کہے گا کہ قالین کے نقش کیوں اپنے سے ڈال رہی ہو تو تم کیا کہوگی''۔

لڑکی پھر غمگین ہوگئی۔ اس نے اپنے ہونٹ بسور لیے۔ رنجیدہ ہوگئی اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ نانی حلیمہ کا دل کڑھ گیا، اور اپنے آپ سے بولیں کہ اس طرح کی گفتگو کرنا ٹھیک نہیں۔ بچی ہے بہت خواہشمند ہے پر ایسے خوبصورت نقش کہاں سے حاصل کروں؟

دوپہر میں ہمیشہ کی طرح حشمت خان آیا تا کہ ایک نظر کارخانے پر ڈالے۔ اس نے دیکھا کہ لڑکی نے نئے نقش ڈالنے شروع کردیئے ہیں۔ پہلے تو ناراض ہوا اور بولا: ''یہ کیسے نقش ہیں؟ کیا شروع کردیا؟ کب سے استاد ہوگئی ہے، اپنے آپ نقش ڈال رہی ہے؟''

لڑکی نے دھیمی تھرائی ہوئی آواز میں کہا: ''اس کے نقش خوبصورت ہیں۔ قالین خوبصورت بنے گی۔ سبھی چڑیوں کی تصویریں ہیں۔ ابھی تک کسی نے ان تصویروں پر کام نہیں کیا ہے''۔

حشمت خاں نے ان نقوش کو بہ غور دیکھا غصہ۔ اس کا غصہ کم ہوگیا۔ معلوم نہیں کہ وہ نقشہ سمجھا کہ نہیں، مگر خوش ضرور ہوگیا لیکن اپنے چہرہ سے اس کا اظہار نہیں کیا۔ وہ چاہتا تھا کہ کچھ بولے کہ نانی حلیمہ نے مداخلت کی اور کہا: ''حشمت خاں، برائی کیا ہے؟ اتنے خوبصورت نقش!... میں نے اس سے کہا ہے کہ اس کام کو کرے۔ پرندوں کا

بُننا بہت مشکل ہے۔ اس نے خود پسند کیا کہ ان نقش و نگار کو بنائے گی۔ تم کیوں روک رہے ہو"۔

حشمت خاں کو اب کہنے کو کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ لیکن کچھ کہنا ہی تھا، بولا: "ٹھیک ہے۔ تم کہتی ہو تو بُنے، کوئی بات نہیں۔ اگر اس نے خراب کیا تو اس کی ذمہ داری تم پر۔ میں یہاں مفت پیسہ نہیں دے رہا ہوں"۔

حشمت خاں چلا گیا اور لڑکی نے قالین پر نقش و نگار بُننے شروع کر دیئے۔

نیلے دھاگے سے قالین کے نچلے حصہ پر نیلا نیلا حوض بُنا اور سفید سفید دھاگوں سے سارس جو حوض کے کنارے کھڑا تھا۔ حوض کو چوطرفہ سبز رنگ کے دھاگوں سے بُنا اور پھر اسے طرح طرح کے پھول سبزے اور درخت سے بھر دیا۔ درختوں کے اندر شاخوں میں اور حوض کے اوپر پرندوں کی تصویریں بن ڈالیں۔ سبز، ریشمی اور نیلے دھاگوں سے ہارل اور ابابیل بُنا، کتھئی اور بھورے دھاگوں سے چکور (چکاوک)، سنہرے، سبز اور زرد دھاگوں سے کبوتر (مرغ قاصد)، ہرے کچنار سے طوطا، رنگ برنگے دھاگوں؛ سبز، زرد، نیلے، سفید اور مرمری سے مور، اور سبھی رنگوں کے دھاگوں سے سیمرغ کو بُنا۔

لڑکی رات دن کام کرتی رہی۔ کتنا وقت گذر گیا اسے اس کا احساس نہ ہو سکا۔ اسے معلوم نہ ہوا کہ کب دن ہوا اور کب رات۔ اسے خبر ہی نہ ہوئی کہ کب ستارے نکلے اور کب چھپ گئے۔ حتیٰ کہ مانی حلیمہ کے آنے اور جانے کی بھی خبر نہ ہو سکی۔

اس کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ اسے رنگ دِکھائی نہیں دے رہے تھے۔ صرف سایہ اور روشنی کا احساس ہو رہا تھا؛ سیاہی اور سفیدی کا۔ دھاگوں کے رنگ کو انگلیوں کے لمس سے محسوس کر رہی تھی۔ کالے رنگ کے دھاگے کچھ موٹے تھے، لال دھاگے نیلے دھاگوں سے کھردرے تھے۔ زیتونی رنگ کے دھاگے چکنے تھے؛ سرمئی دھاگے

کچھ کم کھردرے اور سفید دھاگے نرم نرم تھے۔

اس کی انگلیوں کی کھال تو بکری کے بال سے بھی زیادہ سخت ہو گئی تھی۔ اس میں خون جم گئے تھے، وہ زخمی تھیں اور اس پر پپڑی سی پڑ گئی تھی۔ مگر وہ اسی طرح بُنے جا رہی تھی۔

یہاں تک کہ اس نے کھانا بھی نہیں کھایا اور نہ پانی ہی پیا تھا۔ اسے حشمت خاں اور مانی حلیمہ کسی سے بھی کوئی سروکار نہیں تھا۔ حشمت خاں روز آتا تھا۔ بڑی دلچسپی سے قالین کو دیکھتا تھا۔ سر ہلا ہلا کر مسکراتا اور زیر لب کہتا: "تعجب ہے! تعجب! شاباش!" اور مانی حلیمہ رنجیدہ اور افسردہ اس لڑکی کو دیکھتیں جس کی آنکھیں کچھ اور نہیں دیکھ رہی تھیں؛ جس کے ہاتھ تیز تیز گرہ باندھ رہے تھے... جب تنہا ہوتی تو گریہ کرتی۔

قالین کو ختم کرنے میں اب صرف تیس ہزار گرہیں باقی تھیں؛ اور بچی کے ہاتھ سے دو بالشت؛ اور نقش و نگار کے حساب سے چار پرندے۔

لڑکی اپنے آپ سے بولی: "خوب، اب میں ان چڑیوں کو بُنوں جس کے بازو مضبوط ہوں، جس کی طاقتِ پرواز زیادہ ہو، جنھیں حضرتِ سلیمانؑ کے شہر کے راستہ کا علم ہو اور جو میرے غالیچہ کو وہاں پہنچا سکیں۔

اُس کی انگلیاں عقاب کے پر کے لیے دھاگوں کو مس کر رہی تھیں اور وہ سنہرے دھاگے کی تلاش میں تھی لیکن اس کی زخمی انگلیوں پر اتنی پرتیں (کھٹیاں) جم گئی تھیں کہ وہ رنگوں کی تشخیص نہیں کر پا رہی تھی۔ اس نے سوچا شاید مانی حلیمہ کہیں اِدھر ہی اُدھر ہوں گی، اُن سے ہی کہوں گی کہ وہ سنہرا دھاگہ میرے لیے ڈھونڈھ دیں۔ بہت آواز دی مگر کوئی جواب نہیں ملا۔ مانی حلیمہ کئی دن سے کارخانہ میں نہیں آ رہی تھیں۔

لڑکی نے سوچا شاید مانی حلیمہ نہیں ہیں، خود ہی جو دھاگہ ہاتھ لگ جائے میں بُنوں۔ کیا فرق پڑتا ہے۔ میرا عقاب سفید ہوگا اور مہوکا لال۔ میرے غالیچہ کا شاہین یاقوتی

رنگ کا ہوگا اور میرا ہدہد نیلا۔

عقاب و مہوکا اور شاہین کو بھی بُن ڈالا۔ صرف عقلمند ہدہد کا بُننا رہ گیا تھا۔ عقلمند ہدہد کو سب سے اوپر پرواز کرتا ہوا دِکھانا چاہیے تا کہ پرندے حضرتِ سلیمانؑ کے شہر کا راستہ بھول نہ جائیں۔

ابھی ہدہد کا نقش پورا نہیں ہوا تھا کہ حشمت خاں کا سایہ سیڑھیوں سے اُترتا ہوا دِکھائی دیا۔ اس کے پیچھے دوسرے آدمی کا بھی سایہ کارخانہ میں داخل ہوتا نظر آ رہا تھا۔

لڑکی نے کام سے ہاتھ روک لیا اور سایوں کو تکنے لگی۔ حشمت خان کی آواز اُبھری:

''یہ ہے غالیچہ جسے میں کہہ رہا تھا۔ ابھی تراشا نہیں گیا ہے۔ یہاں تہہ خانہ میں اندھیرا بہت ہے۔ رنگ اچھے سے دِکھائی نہیں دے رہے ہیں۔ کل جب یہ غالیچہ پورا ہو جائے گا تو پھر آپ اسے سورج کی روشنی میں باہر دیکھئے گا اور اسے لے جایئے گا''۔

ایک انجانی سی آواز اُبھری: ''دیکھ رہا ہوں وہ تو یہیں پتہ چل رہا ہے۔ یہ غالیچہ تو ایک شاہکار ہے... شاہکار... بے نظیر...''

حشمت خاں دل ہی دل میں مسکرایا اور بولا: ''آپ نے ملاحظہ فرمایا... شازدہ... دیکھئے میں بہت زیادہ قیمت نہیں مانگ رہا ہوں؛ جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔ دیکھئے جناب دیکھئے... شازدہ صاحب... چڑیاں ایسی لگ رہی ہیں جیسے زندہ، درختوں میں گویا جان ہے اور درختوں کی شاخوں کے درمیان چلتی ہوئی ہواؤں کا بھی پوری طرح احساس کیا جاسکتا ہے۔ اس حوض کے پانی کو دیکھئے لہریں اُٹھ رہی ہیں۔ سبھی چیزیں فطری ہیں بالکل فطری۔ ملاحظہ فرمائیں، میں نے اس کی قیمت کے سلسلہ میں اتنا بھی...''

شازدہ نے حشمت خاں کو جملہ پورا کرنے نہیں دیا بولا: ''آہ! حشمت خاں، حشمت خاں، میری گذارش ہے کہ آپ قیمت کی بات نہ کریں۔ میں پورے یقین سے یہ بات کہہ رہا ہوں کہ یہ غالیچہ اتنا عمدہ بُنا ہے کہ اگر اس کے وزن کے برابر آپ

کو سونا تول دیا جائے تو بھی آپ کا حق ادا نہیں ہوگا''۔

لڑکی نے لوگوں کے سایے کو دیکھا۔ اُن کی آوازیں سنیں یہاں تک کہ اُن کے پاس سے آنے والی سگریٹ کی مہک کو بھی محسوس کیا مگر وہ کچھ بولی نہیں۔ وہ خیالوں میں گم تھی؛ اپنی چڑیوں کے؛ اپنے اُن پرندوں کے بارے میں جو اُس کے وفادار ہیں؛ جو اُس کی انگلیوں کے زخم کی مہک کو پہچانتے ہیں؛ جو اُس کے پسینہ کی بُو اور اس کی آنکھوں کی اس روشنی کو جانتے ہیں جو اَب آنکھوں سے جا چکی ہے۔

سایے سیڑھیوں سے اوپر چلے گئے۔ کارخانے کا دروازہ بند ہوگیا۔ چھوٹی لڑکی پھر تنہا ہوگئی اور خود سے بولی: ''میں ایسا نہیں ہونے دوں گی کہ لوگ کل میرا غالیچہ لے جائیں۔ میں غالیچہ ہرگز نہ لے جانے دوں گی''۔

اسے پسینہ آ رہا تھا۔ موسم ٹھنڈا تھا، مگر وہ بخار کی آگ میں جل رہی تھی۔

کل صبح سویرے منہ اندھیرے، قبل اس کے کہ حشمت خاں یہاں آئے میں اپنی چڑیوں کو اُٹھاؤں گی اور آبادی کے پیچھے پہاڑوں میں بھاگ جاؤں گی۔

اپنے غالیچہ کے پرندوں کو اس نے دیکھا اور پیار بھری نگاہوں سے مسکرائی۔ مشکل سے اس نے اپنے ہاتھوں کو اُٹھایا کہ ہدہد کے بقیہ آدھے نقش کو پورا کرے۔ تین گرہ سے زیادہ اس نے نہیں بُنا تھا کہ اسے لگا کہ وہ ایسا نہیں کرسکتی۔ اس کے پیر سست ہوگئے تھے اور ہاتھوں میں جان نہ تھی۔

اسی جگہ غالیچہ کے پاس بیٹھ گئی؛ لیکن نہیں، حتماً اسے حشمت خاں کے آنے سے پہلے اسے پورا کرلینا چاہیے۔ اس نے غالیچہ کے درختوں کی شاخوں پر مضبوطی سے ہاتھ رکھا اور بہ مشکل کھڑی ہوئی۔ بعد کی گرہوں کو اس نے کیسے بُنا اسے خود بھی پتہ نہیں۔ شاید وہ خود نہیں بُن رہی تھی، شاید فرشتے اس چھوٹے اور مرطوب کارخانہ میں آئے تھے

اور اوپر کی گرہوں کو باندھ رہے تھے۔

غالیچہ جب پورا ہوا تو اس نے دھاگوں کو کاٹا اور زمین پر بچھا دیا۔ اپنے گرم پیروں کو غالیچہ پر اُبھرے حوض کے روؤں پر رکھا۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ گویا حوض کے ٹھنڈے پانی نے اس کے تپتے ہوئے پیر کو ٹھنڈا کر دیا ہے۔ وہیں قالین کے سبز چمن کے بیچوں بیچ پرندوں کے بغل میں بیٹھ گئی۔ چاہتی تھی کہ ہمیشہ کی طرح غالیچہ کے پرندوں سے بات کرے۔ پچھلی راتوں میں جب غالیچہ مکمل ہو رہا تھا تو وہ بیٹھ کر ان جانوروں سے، جسے اس نے بُنا تھا مثلاً ہرنوں، خرگوشوں، پرندوں، کچھوؤں، مچھلیوں اور تتلیوں، یہاں تک کہ شیر، چیتے اور لومڑیوں سے آخری باتیں کر رہی تھیں اور اپنا درد دل بیان کر رہی تھی۔

لیکن اب وہ ان پرندوں سے بات نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اتنی تھک چکی تھی کہ خود سے بیٹھ بھی نہیں سکتی تھی۔ وہیں غالیچہ پر لیٹ گئی۔ اُسے یاد آیا کہ اس نے ہمیشہ یہ سوچ رکھا تھا کہ اپنے بُنے ہوئے غالیچہ پر نہ اسے بیٹھنا چاہیے اور نہ اسے سونا چاہیے۔ اس کا دل نہیں چاہتا تھا کہ اپنے غالیچہ کے سبزوں اور پھولوں کو وہ خود ہی کچل دے۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ خرگوشوں کی دُم اور پرندوں کے بازوؤں پر پیر رکھے، لیکن وہ اتنی بے حال تھی کہ اپنی جگہ سے اُٹھ نہیں پائی۔

اُسے ایسا لگا کہ وہ قدموں کی چاپ سن رہی ہے۔ کبھی بھی رات میں اس وقت کوئی کارخانہ میں نہیں آتا تھا۔ قدموں کی چاپ کارخانہ کے دروازے کے پیچھے ہی رُک گئی۔ کنجی تالے میں گھومی اور ایک چھوٹے چراغ کی کپکپاتی روشنی سیڑھیوں کے نیچے آئی اور کارخانے کو روشن کر دیا۔

چھوٹی لڑکی کی سانس سینہ میں رُک گئی۔ اس نے حشمت خاں کے سایہ کو پہچان لیا۔ سیڑھیوں پر کھڑا وہیں سے چراغ کو اوپر اُٹھائے ہوئے بولا: ''لڑکی! لڑکی! ابھی

کام ختم نہیں ہوا؟''

لڑکی نے چاہا جواب دے: ''کیوں نہیں حشمت، غالیچہ پورا ہو گیا۔ بالکل مکمل، صرف ایک بار دھوپ میں اس کے دھاگوں کو تراشنا ہے''۔

اس کی زبان بند تھی۔ وہ بول نہ سکی۔ حشمت خان دو سیڑھی نیچے اُترا۔ لڑکی کو دیکھا۔ ایک چھوٹی چڑیا کی طرح سمٹی ہوئی غالیچہ کے بیچوں بیچ سو رہی تھی۔

یکبارگی حشمت خاں کی آنکھوں میں خون اُتر آیا اور تیزی سے غالیچہ کی طرف لپکا۔ سوئی لڑکی کو اس نے بالوں سے پکڑ کر غالیچہ سے اوپر اُٹھایا اور چیخا: ''منحوس کہیں کی، اپنے ماں باپ کو کھا گئی، اب ہمیں بھی برباد کرنا چاہتی ہے۔ اگر ایک رواں بھی اس غالیچہ کا خراب ہوا تو جانتی ہے کہ اس کی قیمت پر کیا آفت آئے گی؟ کیا اس وقت تو اس کا خسارہ بھرے گی؟''

لڑکی کو گھسیٹتا ہوا دیوار تک لے گیا اور وہیں بچھی ہوئی ایک چٹائی پر اسے پٹک دیا۔ چھوٹی بچی نے اپنے پیر کو اپنے پیٹ میں سمیٹ لیا اور اپنے سر کو اپنے پیروں کی طرف موڑ لیا۔ پھر نہ تو حشمت خاں کا سایہ نظر آیا اور نہ ہی اس کی آواز سنائی دی۔ حشمت خاں سیڑھیوں سے اوپر گیا۔ کارخانہ کا دروازہ اپنی طرف سے بند کیا اور زیر لب بڑبڑاتا رہا۔ لڑکی کچھ سمجھ نہ پائی۔

اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ حشمت خاں کے بارے میں کچھ سوچے۔ اس کی ہڈیاں دُکھ رہی تھیں۔ پورے بدن میں کھنچاؤ اور درد تھا یہاں تک کہ وہ اس اجنبی خریدار کے بارے میں بھی نہیں سوچنا چاہ رہی تھی جس کا نام شازدہ تھا۔ حتیٰ کہ اسے اپنے غالیچہ کے پرندوں کے بارے میں بھی سوچنا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ صرف اور صرف سونا چاہتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اپنی آنکھوں کو بند کرے اور سو جائے۔

آنکھیں بند کیں؛ ابھی نیند نہیں آئی تھی کہ اس نے کچھ شور سنا۔ یہ شور کارخانہ

کے اندر تھا۔ چھوٹے غالیچہ کے پرندوں کا شور۔

غالیچہ کے پرندوں میں جان آ گئی تھی؛ وہ باتیں کر رہے تھے، چل رہے تھے اور چہچہا رہے تھے۔ پر پھڑپھڑا رہے تھے اور چونچیں لڑا رہے تھے۔

پرندے ابھی تک صبر کیے ہوئے تھے۔ خاموش تھے۔ کسی سے انھوں نے کچھ کہا نہیں تھا۔ شاید اس سے زیادہ اب وہ صبر نہیں کر سکتے تھے۔ پرندوں کا کام تو اُڑنا ہی تھا، شاید وہ اس مرطوب اور تاریک کارخانہ میں قیدی بن کر نہیں رہ سکتے تھے۔

اُلّو (مرغ حق) نے کہا: ''ہمیں حق شناس ہونا چاہیے۔ ہماری مالکن یہ لڑکی بے کس و بے نوا ہے۔ چلو اس کو اپنی پیٹھ پر سوار کریں اور چل پڑیں''۔

کالے کوّے نے کہا: ''ہم لوگ کہاں چلیں؟ فائدہ کیا ہے؟ جہاں کہیں بھی جائیں گے ایسا ہی ہوگا یا کوئی شکاری ہم پر تیر چلائے گا یا کسی پنجرہ میں ڈال دے گا یا کوئی پینٹنگ درست کرے گا یا کسی قالین کے کارخانہ میں اپنی قالین پر تصویر بنا دے گا''۔

مگر عقلمند ہدہد نے سر ہلایا اور کہا: ''کیوں، جگہ کیوں نہیں ہے؟ کیا تم نے حضرتِ سلیمانؑ کے شہر کا قصہ نہیں سنا ہے؟ وہاں پرندے، چرندے اور درندے، سبھی مل جل کر آپس میں زندگی گذارتے ہیں۔ ہم سب وہیں جائیں گے۔ اس چھوٹی لڑکی کو بھی حضرتِ سلیمانؑ کے پاس لے جائیں گے۔ اُن سے کہیں گے کہ یہ چھوٹی لڑکی ہم لوگوں کی مالک ہے''۔

عقاب نے کہا: ''میں بھی ساتھ ہوں''۔

سیمرغ نے کہا: ''ہم سبھی لوگ ہیں''۔

ہدہد نے کہا: ''ہمارے پیچھے پیچھے آؤ۔ مجھے راستہ معلوم ہے۔ میں اسے پہچانتا ہوں''۔

چڑیوں نے اُڑنا شروع کیا۔ غالیچہ آرام آرام سے اُٹھا دھیرے دھیرے بلند ہوا

اور لڑکی کے پیر کے پاس دوبارہ زمین پر بچھ گیا۔

چھوٹی لڑکی جب تک یہ سمجھے کہ کیا ہوا ہے غالیچہ پر بیٹھ چکی تھی اور غالیچہ اُڑ چلا تھا۔ پہلے تو اسے ڈر لگا مگر بعد میں اس نے دیکھا کہ سب کچھ ٹھیک ٹھیک ہو رہا ہے۔ وہ مسکرائی۔

کارخانہ کی کالی چھت میں شگاف ہوا۔ ستارے نظر آنے لگے۔

چڑیوں والا غالیچہ حشمت خاں کے قالین کے کارخانہ سے اُوپر اُٹھا اور آبادی کے اوپر سے گذرتا ہوا نانی حلیمہ کے گھر پر پہنچا۔ لڑکی نے چاہا کہ نانی حلیمہ کو آواز دے اور اس کو بھی اپنے ساتھ لے جائے لیکن انھیں جگانے کے لیے اس کا دل راضی نہیں ہوا۔ غالیچہ اب اتنا اُوپر جا چکا تھا کہ گاؤں کے سبھی چراغ ٹمٹماتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

دھیرے دھیرے بادلوں کے قریب پہنچا۔ چھوٹی لڑکی سوچنے لگی کہ ان بادلوں کی دُھنی روئی سے اپنے لیے ایک سفید تکیہ بنائے اور جب یہ سب ستاروں تک پہنچے تو اس نے سوچا کہ آسمان سے چار روشن ستاروں کو توڑ لے اور اُن کو اسے غالیچہ کے چاروں کونوں میں لٹکا دے۔ یہ ستارے اس کے غالیچہ کے لیے چراغ بن سکتے ہیں۔

○○

شناخت نامہ کے بغیر

حقیقت یہ ہے کہ کچھ دِنوں پہلے تک مجھے معلوم ہی نہ تھا کہ شناخت نامہ بھی کوئی کام آنے والی چیز ہے۔ میں نے کبھی سوچا نہ تھا کہ روٹی، کپڑے کی طرح انسان کی زندگی میں شناخت نامہ بھی لازم ہے، یہاں تک کہ دو تین دن پہلے میں اپنے بھائی خیراللہ کے ساتھ نام لکھوانے گیا۔

منگل کے دن بھائی خیراللہ کئی مہینوں کے بعد ہم لوگوں کے پاس آئے۔ میں محلّہ کے تلہٹ میں بچوں کے ساتھ کھڑا عباس اور غلام علی کے مرغوں کی لڑائی دیکھ رہا تھا کہ میری نظر بھائی خیراللہ پر پڑی۔

میں اتنا خوش ہوا کہ مرغوں کا تماشہ چھوڑ کر ان کی طرف دوڑا، ان سے لپٹ گیا۔ انھیں خوب چوما اور پھر ان کے ساتھ جھونپڑی کی طرف چل پڑا۔

بھائی خیراللہ ابھی جھونپڑی کی طرف پہنچے بھی نہیں تھے کہ بولے: ''عبداللہ پھر تم نے آوارہ گردی شروع کردی! میں نے تم سے کہا نہیں تھا کہ محلّہ میں اس طرح بے کار نہ گھوما کرو! میں نے تمھیں منع نہیں کیا تھا کہ تم مرغ بازی، کبوتر بازی اور وقت برباد نہ کرو! کوئی کام دھندا پکڑلو!''

میں نے کہا: ''میں بے کار نہیں گھوم رہا ہوں۔ میں آقا (بابا) کے بدلے کارخانہ جاتا ہوں۔ رات میں کام کرتا ہوں، دن میں خالی رہتا ہوں''۔

وہ بولے: ''ابھی تک اسکول میں تم نے نام نہیں لکھوایا؟''

میں نے کہا: ''نہیں۔ کوئی تھا ہی نہیں کہ مجھے لے جاتا''۔

''کوئی تھا ہی نہیں! ہوں... کیا تم لنگڑے ہو؟ اتنے سارے لوگ جو جارہے ہیں کیا ان سب کے پاس کوئی ہے؟''

یہاں تک کہ ہم لوگ جھونپڑی تک پہنچ گئے لیکن پھر کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔

جھونپڑی میں سبھی خیراللہ کو دیکھ کر خوش ہوئے، میرے بابا جو ابھی تک صرف لیٹے تھے اور سینہ سے خُرخُر کی آواز آرہی تھی، اپنی جگہ سے ہلے اور ہنسے۔ حلیمہ اور میری ماں بابا کے لیے انگیٹھی پر آلو چڑھا رہی تھیں تاکہ اسے کھا کر انھیں کچھ قوت آئے اور ان کا سینہ نرم ہو۔

جیسے ہی ہم لوگوں کو دیکھا، خیراللہ کی طرف دوڑیں۔ ناصر اور ملک ناز نے بھی جلدی جلدی خیراللہ کے بیگ کو ٹٹولنا شروع کیا۔

خیراللہ نے بابا سے پوچھا: ''کیا ہوا ہے؟ آپ بیمار ہیں؟''

بابا نے سر کو ہلایا اور ماں نے کہا: ''ایک مہینہ سے کھانا پانی ہم لوگوں کے حلق سے نہیں اُتر رہا ہے۔ اسی طرح بستر پر پڑے کراہ رہے ہیں''۔

خیراللہ نے پوچھا: ''آپ ڈاکٹر کے پاس نہیں گئے؟''

بابا نے اسی خرخراتی آواز میں جواب دیا: ''ڈاکٹر کے پاس، کہاں جاؤں؟ کہاں جاؤں''۔

''کہیں بھی چلے جایئے۔ ڈاکٹروں کا قحط نہیں ہے''۔

''اب تو کچھ ٹھیک ہوگیا ہوں۔ اگر زندہ رہا تو آئندہ ڈاکٹر کے پاس جاؤں گا''۔

ماں نے کہا: ''کہاں اچھے ہوئے؟ کچھ بھی فرق نہیں آیا ہے۔ میں نے کتنے آلو کھلائے، سوپ بنایا، پیچھ (چاول کا پانی) بھی مانگ کر پلائی مگر کوئی فائدہ نہیں ہے''۔

میں نے کہا: ''کام پر بھی نہیں جا سکتے''۔

خیراللہ نے مجھے دیکھا۔ پھر انھیں جیسے کچھ یاد آ گیا ہو۔ بولے: ''کل صبح اوّل وقت، میں چاہتا ہوں کہ عبداللہ کو اسکول لے جاؤں۔ آپ بھی چلئے۔ اسی کے ساتھ آپ کو بھی ڈاکٹر کو دِکھا دوں''۔

بابا نے لحاف سر سے اوڑھ لیا اور کچھ نہیں بولے۔

خیراللہ نے ملک ناز کو اپنے زانو پر بٹھایا اور اپنی جیب سے کاغذ میں لپٹی دو چاکلیٹ نکالی۔ ایک ملک ناز کو دے دی اور ایک ناصر کو۔ میرا بھی دل چاکلیٹ کھانے کا کر رہا تھا۔

---مدرسہ جا کر کیا بن جائے گا؟ ایک لاأبالی انسان؟ ارے چھوڑو جائے کچھ کام کرے تا کہ کچھ حاصل ہو''۔

بابا اتنا بولے اور دوبارہ لحاف میں منہ ڈال لیا۔ خیراللہ نے کہا: ''لاأبالی کیوں؟ یہ سارے جو کسی مقام پر پہنچ گئے، لاأبالی تھے؟ آپ بھی عجیب باتیں کرتے ہیں!'' اس کے بعد ایک نظر مجھ پر ڈالی اور بولے: ''آپ یہی چاہتے ہیں کہ یہیں حصیر آباد میں لفنگوں کے درمیان رہے، تو پھر کیا ہوگا، یہی نا کہ دلال اور افیونچی بنے گا اور ہیروئن استعمال کرے گا... آپ تو اس کے باپ ہیں۔ چاہیے کہ اس کا حوصلہ بڑھائیں کہ یہ پڑھے نہ کہ اسے جاہل رکھ رہے ہیں۔ انسان کو چاہیے کہ کسی اجنبی شہر میں جائے تا کہ علم کی قدر جانے۔ دو سطر خود لکھوانا ہو تو ہزاروں کی منت سماجت کرنی پڑتی ہے۔ اُن سے خوشامد کرو اور اِن سے...''

بھائی خیراللہ اگر یہ بات نہیں بھی کہتے تب بھی میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ پڑھائی میں کتنی ہی زحمت کیوں نہ ہو چونے کے کارخانے میں کام کرنے کے مقابلہ میں آرام دہ ہے۔

''مدرسہ جاؤ گے تو دیکھو گے کہ مشکل سے مشکل کام یہی ہے کہ احمد مش ابرام کی طرح بیٹھ کر سبق یاد کرو اور خوب مشق کرو کہ بابا نے پانی دیا۔ ماں نے روٹی دی''۔ ''نہ وہ چونا کہ ہاتھ کاٹے اور آنکھوں میں پڑے تو اندھا کر دے اور نہ ہی ٹھیکیدار کے پیچھے بھاگنا کہ شمر کی طرح سر پر سوار ہو اور فحش بکے''۔

میں نے کہا: ''جو بھی ہو مدرسہ مزدوری سے بہتر ہے''۔

کسی نے بھی میری بات نہیں سنی۔ سبھی خیراللہ کے اِردگرد جمع تھے کیونکہ وہ اپنا بیگ کھول رہے تھے اور اس میں سے سامان نکال رہے تھے۔

ہمیشہ جب بھی بھائی خیراللہ بندرعباس سے آتے تھے، خوب سامان لاتے تھے۔ کسی کو بھی نہیں بھولتے تھے۔ ایک بار میرے لیے بچوں کی بدیسی گھڑی لائے تھے جس کا بند سرخ تھا اور میں بچوں کے درمیان اِترا رہا تھا اور اکڑ کر چل رہا تھا۔

اس مرتبہ ماں کے لیے روسری (اسکارف)، حلیمہ کے لیے خوش رنگ ہرا سوئٹر اور ایک سوئٹر بہن کنیز کے لیے اور ایک شال بابا کے لیے، ناصر، ملک ناز اور میرے لیے جوراب۔

ملک ناز بھن بھن کر رہی تھی اور کہہ رہی تھی کہ مجھے وہی سوئٹر چاہیے۔ بھائی خیراللہ ان کے لیے جتنا ہی قربان صدقہ ہوتے رہے اور منانے کی کوشش کرتے رہے وہ راضی نہ ہوئی۔ آخر اسے گود میں لے کر جھونپڑی سے باہر نکل گئے۔ میں بھی پیچھے پیچھے چل دیا۔ ناصر بھی ساتھ لگ لیے۔

باہر اسی طرح جھونپڑیوں کی طرف سے جا رہے تھے، بھائی خیراللہ بولے: ''عبداللہ کل جب کام سے لوٹنا تو گھر جلدی آنا۔ ہم لوگ جتنا جلدی ہو کل ہی اس کام کو کر کے ختم کر دیں۔ ابھی اسی وقت، مگر ڈر ہے کہ دیر ہو گئی ہوگی اور پھر وہ اپنی بات سے پھر جائیں۔ تمھارا نام نہ لکھیں۔

میں نے کہا: ''ٹھیک ہے، ہم لوگ چھ بجے آزاد ہو جاتے ہیں''۔

اس کے کان کھڑے ہو گئے۔ میری طرف دیکھا اور بولے: ''تمھارا کیا خیال ہے عبداللہ؟ کیا تم پڑھنا چاہتے ہو؟''

میں مسکرایا اور بولا: ''کیوں نہیں؟ جو بھی ہوگا چونے کے کارخانے سے تو بہتر ہی ہوگا''۔

اپنا بھاری ہاتھ میرے سر پر رکھا اور محبت سے میرے اُلجھے ہوئے بالوں کو اور بھی بکھیر دیا۔

رات میں کام کے وقت میرا ذہن سوچنے لگتا اور بھول جاتا کہ میں کارخانہ میں کھڑا ہوں۔ مصطفیٰ جو میرے ہی ہم سن تھا اور بغل میں ہی کام کر رہا تھا، بولا: ''کیا ہوا ہے؟ عبداللہ کیا سوچ رہے ہو؟ خدا نہ کرے عاشق واشق تو نہیں ہو گئے؟ پھر کیا بات ہے''۔

میں ہنسا اور بولا: ''بابا تمھیں بھی خوب چہلیں سوجھ رہی ہیں''۔

پھر میں نے بھائی خیراللہ جیسی صورت بنالی اور کہا: ''خوشی کہاں ہے کہ کوئی عاشق ہونے کا حوصلہ کرے''۔

''---پھر ہوا کیا ہے کہ اونگھ رہے ہو؟''

''کچھ نہیں، بھائی خیراللہ آئے ہیں، چاہتے ہیں کہ میرا نام اسکول میں لکھوا دیں۔ یہی سوچ رہا ہوں، کوئی دوسری بات نہیں۔ تم میرے بھائی خیراللہ کو جانتے ہو جو انھیں دِنوں...''

اسی درمیان میری نظر ٹھیکیدار پر پڑی جو دبے پاؤں ہم لوگوں کی طرف آ رہا تھا۔ فوراً میں نے سر جھکا لیا اور جو بوری میرے سامنے بھری ہوئی تھی اسے اُٹھا لیا اور ٹھیلہ پر ڈال دیا۔

صبح تک کم از کم ایک سو بیس بوری مجھے اس ٹھیلے پر رکھنی ہونگی ورنہ چھ بجے کے بعد بھی ہم کو مجبوراً یہاں رُکنا ہوگا اور بقیہ بوریاں اسٹور میں رکھنی ہوں گی۔ میں ہمیشہ مجبوراً چھ بجے کے بعد سے جب رات کی شفٹ والے مزدور جاتے تھے یہیں رہتا تھا۔

آجکل تو مجھے بہت ہی برا لگتا ہے خصوصاً جب بھائی خیراللہ آئے ہوئے ہوں اور وہ میرے منتظر ہوں۔

دوبارہ مجھے مدرسہ، کتابیں، سبق اور استاد یاد آ گئے۔ خان محمد کا نوکر کہہ رہا تھا کہ ہم لوگوں کے نام نہیں لکھتے۔ ہزار بہانہ کرتے ہیں۔ ایک دفعہ کہیں گے کہ تمھارا سن زیادہ ہے۔ ایک دفعہ کہیں گے کہ تم بہت موٹے ہو، ان کی کلاس کے لائق نہیں ہو۔ پتہ نہیں کیا کیا۔ کبھی کہیں گے کہ تم لوگ حاشیہ نشین (جھگی جھونپڑی والے) ہو۔ حاشیہ نشینوں کے نام مدرسے میں لکھوں۔ خلاصہ یہ کہ ہزار مین میکھ، یہاں تک کہ ہم لوگوں کو بھگا دیتے ہیں۔

جب میں بھائی خیراللہ کے بارے میں سوچتا تھا تو میرا دل قوی ہو جاتا تھا۔ خیراللہ کے کاموں میں 'نہیں' کی کوئی گنجائش نہیں تھی، حتیٰ کہ میرے ماں باپ، سبھی جوان اور حلبی آباد کے سبھی بزرگ ان کی بات مانتے تھے۔ جس کام میں ہاتھ ڈالتے تھے، جب تک ہو نہ جائے پیچھے نہیں ہٹتے تھے۔ وہ ہر کام کر لیتے تھے۔ مجھے ہمیشہ خواہش تھی کہ میں انھیں کی طرح بڑا ہو جاؤں۔ ویسے ہی جسم، صورت، شکل، مونچھ، داڑھی سب ہو جائے تاکہ میں بھی شمار قطار میں آ جاؤں۔

''اوہ بچے! سو رہا ہے۔ بوریاں یہاں ڈھیر لگا دیں، کیا ہو رہا ہے؟''

میرے حواس دوبارہ اُڑے ہوئے تھے۔ ٹھیکیدار عین وقت پر آ دھمکا۔ میں تیزی سے کارخانے سے باہر نکلی ہوئی بوریوں کی طرف لپکا، جو ایک پر ایک رکھی ہوئی تھیں۔ ٹھیکیدار بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔

خوف پسو کی طرح میری جان سے چپکا ہوا تھا۔ اگر صبح ٹھیکیدار نے مجھے نہیں جانے دیا تو کیا ہوگا۔ خود ہی سوچنے لگا کہ اگر اس نے مجھے تنگ کیا تو میں کارخانے کی پچھلی دیوار سے بھاگ جاؤں گا۔

آدھا گھنٹہ ہوا تھا، روشنی پھیل چکی تھی، لیکن جب تک چھ نہ بج جائے، میرا دل بجھا ہوا تھا۔ حسن اتفاق آج صبح سے ٹھیکیدار خوش تھا۔ اصلاً لب پر نہیں لایا کہ کل رات میں نے کوئی کام خراب کیا ہو۔

مزدوری لی اور پھر رُکا نہیں۔ کارخانہ کے دروازہ سے سیدھا دوڑتا ہوا اپنی جھونپڑی تک پہنچا۔ میری سانس پھول رہی تھی اور میں ٹھیک سے سلام علیکم بھی نہیں کہہ پایا۔

ماں نے کہا: ''کیا ہے بیٹا؟''

میں نے کہا: ''چاہتا ہوں بھائی خیراللہ کے ساتھ نام لکھوانے شہر جاؤں۔ جلدی جاؤں دیر ہو رہی ہے۔ لوگ اسکول کا گیٹ بند کر دیں گے''۔

خیراللہ چائے بریڈ کھا رہے تھے بولے: ''ایسا بھی نہیں ہے جیسا تم کہہ رہے ہو۔ بیٹھو ایک لقمہ روٹی تو کھا لو۔ پھر چلیں گے''۔

دادی بولیں: ''ابھی تمھارے بابا نہیں آئے ہیں۔ اگر ہو سکے تو راستہ میں اپنی بہن کے گھر بھی ہولینا۔ دیکھتے آنا میری بیٹی کیا کر رہی ہے''۔

بھائی خیراللہ نے کہا: ''کر کیا رہی ہوگی؟ ٹھیک ہے، مجھے غلام علی کی ناک بھنوؤں دیکھنے کا حوصلہ نہیں ہے۔ اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھتے ہیں''۔

میری ماں نے لجاجت سے کہا: ''دادی کی جان ہو اپنی بہن کی خاطر چلے جاؤ میرے لال بری بات ہے۔ تم کو دیکھے گی تو خوش ہو جائے گی۔ صبح سویرے غلام علی نہیں ہوگا۔ وہ کام پر چلا گیا ہوگا''۔

سچ تو یہ ہے کہ ماں پر ترس آ گیا اور اپنی بہن پر بھی۔ کنیز اور اس کے چھوٹے بچے کی یاد آ گئی۔ کئی مہینہ سے انھیں دیکھا نہیں تھا۔ میں نے کہا: ''ٹھیک ہے۔ اگر گئے تو وہاں بھی چلے جائیں گے''۔

ہم لوگ مجبور تھے کہ سڑک تک پیدل ہی جائیں۔ موسم بھی ٹھنڈا تھا۔ ہوا میں ٹھٹھرن تھی، نیند کا ماحول تھا۔ کئی بار لگاتار جمائیاں لیں، بھائی خیراللہ بولے: ''کیا تمھیں نیند آ رہی ہے؟''

میں نے کہا: ''نہیں۔ یہ راستہ بھی کتنا لمبا ہے۔ آخر کون سی مجبوری تھی کہ حلبی آباد کو بیابان میں آباد کیا۔ سڑک کے کنارے نہیں کر سکتے تھے''۔

بھائی خیراللہ چپ رہے۔ گویا میں نے کوئی بات نہیں کی۔ ظاہر ہے جو نیند میں ہوگا وہ اُلٹی سیدھی ہی باتیں کرے گا۔

آدھے گھنٹہ بعد ایک کھٹارا سی بس لخ لخ کرتی ہوئی دُور سے نظر آئی اور خاک سفید بس اڈّے پر پہنچی۔ بھائی خیراللہ نے ٹکٹ ڈرائیور کو دیا اور ہم لوگ بس کے آخر تک چلے گئے۔ تین سیٹیں تھیں۔ دو سیٹ ان دو مسافروں نے جو چالاکی سے ہم لوگوں سے پہلے چڑھ گئے تھے، لے لی تھیں۔ باقی بچی ایک۔ بھائی خیراللہ نے کہا: ''بیٹھ جاؤ!'' خیراللہ کو مجھ سے بحث کرنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ انھوں نے میرا شانہ زور سے دبایا اور سیٹ پر جھٹکے سے بٹھا دیا۔ مجبور تھا خاموشی سے بیٹھ گیا۔ اتنا تھکا تھا کہ اگلے اسٹاپ تک پہنچنے سے پہلے ہی سو گیا۔

''اُٹھو، پہنچ گئے''۔ میٹھی نیند سو رہا تھا کہ خیراللہ کی آواز سے جاگ اُٹھا۔ بس کی سیڑھیوں سے اُتر رہا تھا تب بھی نیند غالب تھی۔ آنکھیں چڑھی چڑھی سی تھیں۔ میرا بدن سست اور صبح کی اس میٹھی نیند کا مزہ باقی تھا۔ جی چاہتا تھا کہ یہیں کول چکر پر سو جاؤں۔ خیراللہ نے کہا: ''نل کے پاس جاؤ، منہ پر پانی ڈالو نیند اُڑ جائے گی تاکہ آگے بڑھوں اور کسی سے معلوم کروں کہ اسکول کہاں ہے؟

نل کا پانی اتنا ٹھنڈا تھا کہ بہ قول بابا، اصحاب کہف پر ڈال دیں تو وہ بھی اُٹھ جائیں۔ پلٹا تو دیکھا کہ خیراللہ ایک ضعیف ریہڑی والے سے جو اخبار سجائے بیٹھا تھا پوچھ رہے

تھے کہ اسکول کہاں ہے؟

بوڑھے نے کہا: ''اسکول؟ کیسا اسکول؟''

''اسکول؛ جہاں بچے لکھنا پڑھنا سیکھتے ہیں''۔

وہ ریہڑی والا بولا: ''اسکول یہاں بہت ہیں۔کون سا؟ پھر میں بتاؤں۔ بھائی خیراللہ نے میری طرف اشارہ کر کے کہا۔ ''کوئی خاص نہیں، چاہتا ہوں اس کا نام لکھوا دوں''۔

پیرمرد نے اپنی آنکھیں سکوڑ کر مجھے دیکھا اور کہا: ''کس کلاس میں؟''

بھائی خیراللہ نے کہا: ''پہلی؛ یعنی ابھی اسکول نہیں گیا ہے۔ چاہتا ہے کہ اسکول میں نام لکھ جائے''۔

مجھے ایکدم شرم آ گئی۔سر جھکا لیا۔ نیچی نگاہوں سے میں نے دیکھا کہ اس نے میرے قدوقامت کو دیکھا اور پھر کچھ رُک کر بولا: ''اسی سڑک سے اوپر کی طرف جاؤ۔ داہنی طرف گلی ہے۔سو قدم بھی نہیں بڑھو گے کہ مدرسہ پہنچ جاؤ گے۔

○

اسکول کا دروازہ کھلا تھا اور ناصر کے ہم سن و سال بچوں کا ایک دستہ اسکول کے صحن میں ایک مونچھوں والے کے ساتھ خوش خوش گیند کھیل رہا تھا۔ ان بچوں کی خوشی کا مجھ پر ایسا اثر ہوا کہ میں تو گویا دوسری دُنیا میں پہنچ گیا۔شوق کا یہ عالم تھا کہ اب بس میں تھا اور یہ بچے اور جی چاہتا تھا کہ جب تک یہ دُنیا ہے میں اسی جگہ رہوں۔ یہیں کھڑا ان کے قہقہے اور ان کے کھیل دیکھتا رہوں۔معلوم نہیں کیسے انتہاء شوق میں مجھے رونا آ گیا اور میرا گلا رُندھ گیا۔

''عبداللہ...عبداللہ، کیوں کھڑے ہو؟ کیا بھونچکے ہو رہے ہو۔حیرت کس بات کی۔ یکبارگی ساری خوشی پر پانی پڑ گیا اور میں بھائی خیراللہ کے ساتھ چل پڑا۔

تین سیڑھی چڑھ کر ایک لمبے برآمدہ (کاری ڈور) میں پہنچے جس کے فرش کا موزیک چمک رہا تھا۔ میں اسی طرح حیرت زدہ فرش، دیوار اور اس پر لگی ہوئی طرح طرح کی تصویروں کو دیکھ رہا تھا اور آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ میں نے کہا: ''اب کہاں جاؤں؟''

خیراللہ بولے: ''انھیں دروازوں میں سے کوئی ایک ہے''۔

ہماری بدقسمتی سے ہر دروازہ بند تھا، ہم سوچ رہے تھے کہ کون سا کھولیں۔

بھائی خیراللہ دبے پاؤں ایک دروازے کے پیچھے گئے۔ پہلے دیکھا بھالا پھر کان لگا کر سننے لگے۔ میں بھی آگے بڑھا اور یہی کرنے لگا۔ کمرے کے اندر سے پڑھانے کی آواز آ رہی تھی۔

پہلے ایک مرد کی بھاری آواز سنائی دی اور شاید ان کا استاد تھا۔ سبق کو پڑھ رہا تھا۔ سبھی بچے تیز تیز آواز سے دہرا رہے تھے۔

استاد نے کہا: ''رات تھی''۔

سب بچے ایک ساتھ بولے: ''رات تھی''۔

''چاند بادلوں کے پیچھے تھا''۔

''چاند بادلوں کے پیچھے تھا''۔

''چاندنی...''، ''چاندنی...''

''زمین کو روشن کیا''۔

''زمین کو روشن کیا''۔

''واہ واہ!''، ''واہ واہ!''

یک بیک دروازہ کھلا۔ میں اور بھائی خیراللہ پیچھے کو ہو لیے۔ وہ بچہ جس نے دروازہ کھولا تھا اس کی بھی حالت ایسی تھی جیسے جن و پری کا سامنا ہو گیا ہو۔ چیخا اور پیچھے کو ہٹ گیا۔

کلاس میں بیک وقت سکوت تھا۔ایک عینک والے صاحب جو کرسی پر بیٹھے تھے، پہلے تو ہم لوگوں کو تعجب سے دیکھا اور پھر کھڑے ہوئے، ہم لوگوں کی طرف آئے۔ میں اس سے نزدیک تھا اس لیے خوف سے میرا پتہ پانی ہوا جا رہا تھا! اگر عینک والے ہمیں بیچ کلاس چھڑی سے سزا دے دیتے تو ہم نے خود کیسی مصیبت اپنے لیے مول لی تھی۔

میں نے آہستہ آہستہ اپنے قدم پیچھے ہٹائے جو لکڑی کی طرح خشک اور بے دَم لگ رہے تھے، تا کہ آمنا سامنا بھائی خیراللہ کا ہو۔بنچوں پر بیٹھے ہوئے بچے کھی کھی، کھی کھی کرنے لگے۔

عینک والے صاحب بولے: ''کہیے کیا کام ہے؟''

بھائی خیراللہ گھبرا گئے تھے، ہکلاتے ہوئے بولے: ''س...سلام...ن...نہیں، سچ تو یہ ہے...جی ماسٹر صاحب، میں چاہتا تھا...''

بیچارے خیراللہ پسینہ پسینہ ہو گئے تھے۔ میں وہاں رہ کر اس طرح بھائی خیراللہ کو شرمندہ دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔

خدا کا شکر کہ عینک والے نے ان کی مدد کی اور کہا: ''بولیے بولیے کوئی بات نہیں جناب!''

خجالت و شرمندگی سے خیراللہ کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔زبردستی مسکرائے اور بولے: ''جی جناب، ہم لوگ یہاں اپنے اس بھائی کا نام لکھوانے آئے ہیں۔ شاید کوئی غلط دروازہ کھٹکھٹا دیا۔معاف کیجیے''۔

عینک والے بہت مہذّب آدمی تھے، بولے: ''کوئی بات نہیں، آپ آفس تشریف لے جائیے، برآمدے کے آخر میں بائیں طرف سے پہلا دروازہ''۔

خیراللہ جلدی میری طرف مڑے، مسکراتے ہوئے بولے: ''عنقریب تھا کہ ہم لوگوں سے کچھ گڑبڑ ہو جاتی۔اچھا ہوا کہ بدحواس نہیں ہوئے''۔

آفس میں دو افسر بیٹھے تھے۔چھوٹی میز پر بیٹھنے والا افسر بولا: ''اس وقت نہیں ہوسکتا۔ایک تو دیر ہوگئی، دوسرے یہ کہ اس کی عمر زیادہ ہے۔ایسی صورت میں جاؤ آقای فیض آبادی سے گفتگو کرو، شاید وہ تمھارا نام لکھ دیں''۔

آقای فیض آبادی کچھ لکھنے میں مشغول تھے۔خیراللہ نے سلام کیا اور کہا: ''معاف کیجیے ہم یہاں پہلی کلاس میں نام لکھوانے آئے ہیں''۔

فیض آبادی نے میرے قد و قامت پر نظر ڈالی۔بال پوائنٹ کا سرا منہ میں رکھ کر سوچنے لگے اور بولے: ''پہلی کلاس؟''

بھائی خیراللہ نے کہا: ''جی ہاں جناب''۔

''دیر سے آئے، اب تو دو مہینہ گذر گیا۔جلدی کیوں نہیں آئے؟''

''جی جناب، اس کی صلاحیت میں کمی نہیں ہے۔تیرہ سال کا ہے، دماغ خوب چلتا ہے''۔

فیض آبادی مسکراتے ہوئے بولے: ''قد کی بات نہیں ہے، اصل تو سن ہے۔ قانوناً ہم اس کا نام نہیں لکھ سکتے''۔

اچانک خیراللہ پر غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔تھوڑی دیر خاموش رہے اور پھر فیض آبادی پر عاجزانہ نظر ڈالی اور کہا: ''سچ تو یہ ہے کہ ہم لوگ حاشیہ نشین (پہاڑ کی تلہٹ کے رہنے والے) ہیں۔تہران پارس کے پاس حلبی آباد میں رہتے ہیں۔اگر وہاں یوں ہی گھومتا رہا تو یا میری طرح ناکارہ ہوگا یا دوسروں کی طرح نشیڑی (نشہ باز) یا اسمگلر۔ یہی تو بنے گا۔آپ ہی بتایئے ہم کیا کریں؟''

فیض آبادی کی نظر مجھ پر تھی۔شاید وہ خیراللہ کے سوال کا جواب میرے ڈیل ڈول میں ڈھونڈ رہے تھے، بولے: ''حلبی آباد...'' اور سر ہلایا پھر بولے: ''واللہ آپ سے کیا کہوں... دیکھیے صرف ایک راستہ ہے؛ وہ یہ کہ آپ اس کا نام کلاسِ شبینہ میں لکھوایئے...اگرچہ اس کے لیے بھی دیر ہوگئی ہے، مگر ٹھیک ہے کچھ کام تو ہو ہی سکتا ہے''۔

پھر میری طرف رُخ کر کے مسکرائے اور کہا: ''تم بھی وہاں راحت سے رہو گے، وہاں سبھی بڑے ہیں، ان کے سن زیادہ ہیں''۔

باوجودیکہ مجھے ان باتوں سے شرم آئی لیکن مسکراتے ہوئے میں نے سر جھکالیا۔

بھائی خیراللہ نے پوچھا: ''شبینہ اسی جگہ ہے یا کہیں اور؟''

''اِسی جگہ ہے، لیکن تمھارا بھائی قول دے کہ وہ ناغہ نہیں کرے گا؛ کیونکہ یہ ابھی ہی اپنے ساتھیوں سے دو مہینہ پیچھے ہے''۔

مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ ایسے مہذّب لوگوں کی گفتگو کا جواب کس طرح دیا جائے؟ یوں ہی کہا: ''بہ سروچشم پرنسپل صاحب...!''

''ٹھیک ہے، تو پھر تم آج ہی سے کلاس میں جاسکتے ہو''۔

میرے پاؤں خوشی کے مارے زمین پر نہیں پڑ رہے تھے، مگر بعد میں میں ڈر گیا۔ ڈرا اس بات پر کہ مجھے کچھ آتا تو ہے نہیں، اگر میں کلاس میں جاؤں اور سب میری اس شکل وصورت کو دیکھ کر ہنس دیئے تو رہی سہی آبرو بھی چلی جائے گی۔ مگر خیراللہ کو دیکھا تو ایسا لگا گویا اس کے کاندھے سے بہت بڑا بوجھ کسی نے اُتار لیا ہو۔ اطمینان کی ایک گہری سانس لی، مجھے دیکھا اور مسکرائے۔

میں نے کہا: ''میں... میں... یعنی جناب آج ہی سے...؟''

فیض آبادی نے کہا: ہاں! آج ہی سے۔ البتہ تم ابھی جاؤ اپنا حلیہ ٹھیک ٹھاک کر کے دوپہر کے بعد ڈھائی بجے یہاں ملو''۔

میں نے سوچا کہ پہلے میں باجی کنیز کے گھر جاؤں، ہاتھ منہ اچھی طرح دھوؤں، ایک پنسل اور ایک کاپی خرید کر یہیں آجاؤں۔

''برائے مہربانی شناخت نامہ...'' شناخت نامہ کا نام سنتے ہی ساری خوشی خاک میں مل گئی۔ سوچا شاید میں نے غلط سنا ہوگا۔ بھائی خیراللہ کو دیکھا۔ انھوں نے کہا:

''شناخت نامہ؟''

''اس کے پاس شناخت نامہ نہیں ہے... یعنی جناب... حلبی آباد میں ہم میں... سے... کسی کے پاس شناخت نامہ نہیں ہے۔

میں نے جلدی سے فیض آبادی کی طرف رُخ کیا کہ دیکھوں آیا بھائی خیراللہ کی بات قبول کی یا نہیں۔ پتہ چلا کہ وہ حیرت سے بولے: ''تم لوگوں کے پاس شناخت نامہ نہیں ہے؟ پھر تم لوگوں کا کام کیسے چلتا ہے؟ اب تو کسی مدرسہ!... جینے کے لیے معاشرہ میں شناخت نامہ چاہیے۔ اگر یہ نہیں ہوگا تو...''

بھائی خیراللہ نے پوچھا: ''اگر شناخت نامہ نہیں ہوا تو کیا آپ اس کا نام نہیں لکھیں گے؟''

''میں نے آپ سے کہا، کہ نہیں ہوگا۔ اگر نام لکھنا ممکن ہوتا تو میں خود ہی لکھ دیتا''۔

''پھر بتایئے میں کیا کروں؟''

''مجھے نہیں معلوم۔ یہ میرے ہاتھ میں نہیں ہے۔ آپ زونل آفس جایئے اور انھیں اپنا مسئلہ سمجھایئے۔ شاید وہ کچھ مدد کریں۔ وہ صرف اتنا لکھ دیں کہ ان کے داخلہ میں کوئی چیز مانع نہیں ہے، تو مجھے کوئی عذر نہ ہوگا''۔

''کس زونل آفس؟''

دوسرا بولا: ''یہی زونل، محکمۂ تعلیم تہران پارس''۔

''یعنی ہم دفتر جائیں؟''

''ہاں تین سڑک آگے۔ اس گلی سے باہر نکلو، تمھارے بائیں طرف تین سڑک آگے''۔

○

پوچھتے پوچھتے محکمۂ تعلیم مل ہی گیا۔اتنی بھیڑ تھی کہ اگر ہم کو دوبارہ یہاں آنا ہوتا تو پھر اسی اسکول کی طرح کسی دروازہ پر کان لگا کر سنتے اور پھر بڑے صاحب نمودار ہوجاتے اور سارے لوگ ہم پر ہنس پڑتے۔

وہیں ایک آدمی چوکیدار کا کپڑا پہنے ہوئے لکڑی کی کرسی پر بیٹھا تھا۔خیراللہ نے اس سے پوچھا: ''نام لکھنے کا دفتر کدھر ہے؟''

''دفتر تو یہی ہے۔بولو کیا کام ہے؟''

''چاہتا ہوں اس کا نام لکھوا دوں، لوگوں نے مجھے یہاں بھیجا ہے''۔

''ٹھیک ہے، دوسری منزل پر جاؤ داہنی طرف چوتھا دروازہ ہے، وہاں کلرک سے ملو''۔

چوتھا دروازہ کھولا تو چشمہ لگائے ہوئے ایک آدمی نے کاغذ سے سر اُٹھایا اور کہا: ''فرمایئے''۔

''سلام...! جناب ہم لوگ اپنے بھائی کا نام لکھوانے آئے ہیں۔ابھی ہم لوگ چوتھی منزل والے اسکول میں پہنچے تو انھوں نے کہا کہ ہم لوگ یہاں آئیں''۔

''خوب! مشکل کیا ہے؟''

''کچھ نہیں جناب، شناخت نامہ نہیں ہے''۔

''حیرت ہے! کسی کے پاس شناخت نامہ نہ ہو اور پھر بھی...تمھارے لیے یہ کوئی مشکل امر ہی نہیں ہے۔ہے نا؟''

''سرکار حلبی آباد میں کسی کے پاس شناخت نامہ نہیں ہے۔ہم حاشیہ نشین لوگ ہیں۔جناب میں نے سوچا ہم لوگ اس کا نام لکھوا دیں تاکہ کچھ پڑھ لکھ لے''۔

''اب تک شناخت نامہ لینے کیوں نہیں گئے؟''

''چونکہ وہ لوگ ہم لوگوں کو شناخت نامہ نہیں دیتے، ہزار طرح کے بہانے بناتے ہیں۔جناب اس میں ہم لوگوں کی بھی کاہلی ہے۔ہم چھوٹے لوگ ہیں، ہمارے طور

طریقے پست ہیں۔پتہ ہی نہیں، ہمارے بزرگوں کو کچھ خبر نہیں کہ دُنیا کس کے ہاتھ میں ہے؟ انھیں نہیں معلوم کہ اپنے یا اپنے بچوں کے لیے شناخت نامہ لیں، تاکہ وہ بھی کہیں آئیں جائیں اور لوگ انھیں بھی انسان سمجھیں۔انھیں کام دیں''۔

''یہ تو کوئی دلیل نہیں ہوئی!''

''کیوں نہیں جناب، میں بتاتا ہوں، جھونپڑوں میں بچے پیدا ہوتے ہیں، کچرا کوڑا کھا کر بڑے ہوجاتے ہیں اور وہیں مرجاتے ہیں۔کوئی کسی کا نہیں ہے۔کہتے ہیں کہ شناخت نامہ کا کیا کام۔اُن کی تہذیب بہت پست ہے جناب! وہ کچھ نہیں جانتے''۔

خیراللہ کی باتیں سن کر تو میرا منہ ہی کھلا رہ گیا۔میں تو چکرا گیا کہ بھائی خیراللہ نے اتنی بڑی بڑی باتیں کہاں سے یاد کرلی ہیں، بالکل پڑھے لکھوں کی طرح بات کررہے تھے۔دل میں سوچا اب اس سرکاری بابو کے پاس کوئی جواب نہیں ہے، اب دے دے گا۔یہ ضرور اپنا کام کررہا ہے۔

''بڑے بابو (آقای معاون) بولے: ''بہرحال...'' تیزی سے کچھ لکھا اور خیراللہ کو دیا۔

''ابھی لے جاؤ بغل والے کمرے میں معصومی صاحب کو دے دو۔دفتر کے بڑے صاحب کو دیکھو وہ کیا کہتے ہیں''۔

بغل والے کمرے میں گئے۔بڑے صاحب نے کاغذ کو پڑھا اور کہا: ''ہاں، آقای اصغری اسی کے بارے میں کہہ رہے تھے۔بہت افسوس ہے ہم کچھ نہیں کرسکتے۔قانوناً ہم اس کا نام کسی اسکول میں نہیں لکھ سکتے۔شناخت نامہ تو ضروری ہے۔یہ تو ہم لوگوں کے لیے ایک دردسر بن جائے گا''۔

''بڑے صاحب! آپ کچھ کرم نہیں کرسکتے۔آپ کہہ دیجیے کہ نام لکھ لیں، ہم شناخت نامہ کے لیے بھاگ دوڑ کرتے ہیں''۔

''کہہ رہا ہوں کہ ہم لوگوں کو اس کی قطعی اجازت نہیں ہے''۔

''بڑے صاحب! کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ یہ اسی طرح آئیں اور کلاس میں بیٹھیں''۔

''کیوں نہیں، یہ ایک آزاد طالب علم کی حیثیت سے بیٹھیں لیکن کسی قیمت پر ان کا شمار ہمارے اسکول کے شاگردوں میں نہیں ہوگا۔ ہم ان کا امتحان بھی نہیں لے سکتے۔

دفتر کے صاحب کی بات میری سمجھ میں تو نہیں آ رہی تھی۔ پتہ نہیں بھائی خیراللہ بھی میری ہی طرح تھے یا نہیں۔ بولے: ''بڑے صاحب پھر کیا کروں؟''

''تم کچھ نہیں کرسکتے سوائے اس کے کہ جاؤ اور شناخت نامہ لاؤ''۔

''بڑے صاحب! کیا آپ مجھے شناخت نامہ نہیں دے سکتے؟''

''میں؟... نہیں بیٹے نہیں۔ تم رجسٹریشن آفس جاؤ جہاں سے شناخت نامہ ملتا ہے۔ میں بس یہ کرسکتا ہوں کہ ایک خط تم کو دے دوں اور ان سے سفارش کردوں کہ وہ تمھارا کام جلد از جلد کردیں۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کرسکتا''۔

''اب یہ دفتر کہاں ہے؟''

''زیادہ دور نہیں ہے، اسی سڑک پر، ختم ہوتے ہی چوراہا پار کرو، پھر دو چوراہے اور چھوڑ کر داہنے ہاتھ پر ایک پرانی اینٹوں کی تین منزلہ عمارت ہے جس پر ایک سفید بورڈ لگا ہوا ہے، اس پر لکھا ہے رجسٹریشن آفس... مگر تم تو پڑھے لکھے ہو نہیں''۔

بھائی خیراللہ نے کہا: ''جی ہاں میرے پاس بھی شناخت نامہ نہیں ہے۔

پھر ہم دونوں بڑے صاحب کے کمرے سے باہر آ گئے۔ سیڑھیوں سے اُترتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ ہر بڑے صاحب کا ایک بڑا صاحب ہوتا ہے، تو سب بڑے صاحبوں کا سب سے بڑا صاحب کیسا ہوگا؟ اس کی شکل وصورت کیسی ہوگی؟

پرانی اینٹوں والی عمارت مل گئی۔ اینٹیں بھی پرانی، کھڑکی دروازہ، کمرہ، سیڑھیاں غرض وہاں کے سبھی لوگ قدیمی، پتلے دُبلے، سب کی آنکھوں پر چشمہ تھا۔ ایسے قدیمی لوگ

جیسے ہم نانی دادی کی کہانیوں میں سنتے ہیں۔ ان افسران میں سے ایک افسر کے سامنے بہت بڑی سی آدھے قد کی کتاب سامنے کھلی پڑی تھی اور اس پر قلم سے کچھ لکھ رہا تھا۔

خدا کا میں نے شکر ادا کیا کہ ان کے ذہن میں یہ بات نہیں آئی کہ شناخت نامہ بھی اتنا ہی بڑا بنائیں۔ اگر ایسا ہوتا کہ شناخت نامہ اتنا ہی بڑا بنے تو اتنا وزن لے کر اِدھر اُدھر جانے میں موت ہی آ جاتی۔ میں نے بہت سوچا کہ اس دفتر میں سارے لوگ اتنے بوڑھے اور ان کی کتابیں بھی بھاری بھرکم اور پرانی کیوں ہیں؟ لیکن میں نہیں سمجھ پایا۔

میں اور خیراللہ دونوں صاحب کی میز کے پاس کھڑے تھے اور ان کے لکھنے کا تماشہ دیکھ رہے تھے کہ انھوں نے سر اُٹھایا اور کہا: ''ہاں!''

خیراللہ نے کہا: ''ہم لوگ شناخت نامہ لینے آئے ہیں''۔

وہ دوبارہ لکھنے میں مشغول ہوگئے۔ کچھ دھیرے سے بولے جسے نہ میں نے سنا اور نہ خیراللہ نے۔

خیراللہ نے کہا: ''جی؟''

پیرمرد نے عینک کے اوپر سے انھیں دیکھا اور اپنے بال پوائنٹ سے ہماری داہنی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ سامنے۔

میں اور خیراللہ ہٹے اور اس کے قلم کی سیدھ میں اُس طرف مڑے جدھر ہماری پیٹھ تھی۔ ایک افسر اُس طرف بیٹھے ہوئے تھے۔ اُن کی شکل وصورت بھی بالکل انھیں جیسی تھی۔ سرمو فرق نہیں تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے ایک سیب کے دو ٹکڑے یا ایک تصویر کے دو رُخ۔ صرف ان کے کپڑوں کے رنگ الگ تھے۔ دونوں آمنے سامنے کی میز پر بیٹھے تھے۔ عنقریب تھا کہ ہم لوگ حیرت سے غش کھا جائیں۔ پلٹ کر پہلے والے صاحب کو دیکھا۔ دل میں سوچا یقیناً یہ تو اَم ہیں، شکلیں بالکل ایک جیسی ہیں۔ آمنے سامنے بیٹھے بھی ہیں اور دونوں ہی شناخت نامہ کا کام کر رہے ہیں۔

''جی ہاں!''

''ہم لوگ شناخت نامہ لینے آئے ہیں''۔

''اُدھر بیٹھو وہاں۔تم لوگوں کو آواز دیں گے''۔

جب ہم لوگ میز کے پاس نرم نرم کرسی پر بیٹھے، دوبارہ اُس دفتر کے افسروں کے بارے میں غور کرنے لگے۔سب کی شکلیں ایک جیسی، سب کے سامنے بڑی بڑی کتابیں رکھی تھیں اور سبھی جلدی جلدی لکھ رہے تھے۔

بھائی خیراللہ سے پوچھا: ''آج یہ لوگ شناخت نامہ دے دیں گے؟''

''پتہ نہیں۔دیکھتے ہیں کہ اب انھیں کیا چاہیے''۔

ہم لوگوں کی بینچ کے نزدیک بیٹھے ہوئے بوڑھے افسر نے سر اُٹھایا۔ہم لوگوں کی طرف رُخ کیا اور بولے: ''ہاں اس کا نام کیا بتایا تھا؟''

میں نے پہلو بدلا اور جلدی سے بولا: ''عبداللہ!''

اور خیراللہ نے کہا: ''خداداد کرم؛ عبداللہ خداداد کرم''۔

پیرمرد نے کہا: ''کون مرگیا؟''

میں نے خیراللہ کو دیکھا اور خیراللہ نے مجھے۔عنقریب تھا کہ ہم لوگ پھر حیرت سے غش کھا جائیں۔آخر ہڑبڑاتے ہوئے میں نے کہا: ''کون؟ میں؟بڑے صاحب، ایسا لگتا ہے کہ میں نے کچھ غلط کہہ دیا ہے''۔

اس کے ڈھیلے دانت آگے پیچھے ہو رہے تھے۔ ہلتے دانتوں سے پوچھا: ''کون مرگیا؟ کس تاریخ کو؟''

خیراللہ نے کہا: ''کوئی نہیں مرا ہے۔شناخت نامہ لینے آیا ہے''۔

پیرمرد نے چشمہ کے اوپر سے ہم لوگوں کو گھورا گویا ہم لوگوں نے اسے فحش بک دیا ہو۔بولا: ''کیوں خرافات بکتے ہو۔کون شناخت نامہ لینے آیا ہے؟''

خیراللہ پسینہ پسینہ ہو رہے تھے، بولے: ''یہ میرا بھائی''۔

پیرمرد کے دانتوں سے دوبارہ چک چک کی آواز آئی اور وہ بولا: ''ماں کس کی مری تھی، کیا ہوا؟''

اس کے بعد غصہ سے تیز آواز میں پکارا: ''کون اپنی ماں کا شناخت نامہ ردّ کرانے آیا تھا؟''

ایک صاحب جو ہم لوگوں کے سامنے کرسی پر بیٹھے تھے آگے بڑھے اور کہا: ''ہاں فرمایئے''۔

''کہاں گئے تھے۔اتنی طاقت نہیں ہے کہ ایک منٹ یہاں کھڑے رہ سکو کہ تمھارا کام ختم ہو''۔

''معاف کیجیے فوٹو کاپی کرانے گیا تھا''۔

''کیا نام بتایا تھا؟''

''ماہ جان؛ ماہ جان محمدی''۔

میں نے راحت کی سانس لی اور خیراللہ کو دیکھا۔ بھائی خیراللہ مسکرائے اور بولے: ''یہاں تو مُردوں کے شناخت نامے کینسل ہو رہے ہیں''۔

میں نے پوچھا: ''کیسے؟''

''کچھ نہیں؛ شناخت نامہ پر خط کھینچ دیں گے اور کہیں گے فاتحہ!''

''کیوں کسی دوسرے کو نہیں دے دیتے کہ شناخت نامہ خراب نہ ہو''۔

نرگس مرگئیں تو صفدر نے ان کا شناخت نامہ خاتون کے لیے رکھ دیا۔

''صفدر کو چھوڑو ان کی سمجھ میں نہیں آئے گا''۔

تب بات سمجھ میں آئی کہ جو لوگ شناخت نامہ کے دفتر میں کام کر رہے ہیں ان کا بوڑھا اور قدیمی ہونا لازم ہے؛ کیونکہ یہ ممکن نہیں کہ ایک آدمی شناخت نامہ بنائے اور

دوسرا اسے کینسل کرے، اس طرح تو سب ہوچ پوچ ہوجائے گا۔ اس طرح جس آدمی نے شناخت نامہ بنایا ہے، چاہیے کہ وہ اتنے دن تک زندہ رہے کہ خود ہی اس کے مرنے کے بعد اس شناخت نامہ کو کینسل کرے ورنہ انسان اور شناخت نامہ سب گڈمڈ ہوجائے گا اور پھر ہر چیز...''

بھائی خیراللہ نے میری فکر کو مکمل نہیں ہونے دیا اور میرے پہلو میں کہنی سے دھکا دیتے ہوئے کہا: ''اُٹھو!''

دوبارہ ہم لوگ بڑے صاحب کی میز کی طرف گئے اور یتیم و یسیر بچوں کی طرح کھڑے رہے۔ انھوں نے کہا: ''کیا چاہیے؟''

خیراللہ نے کہا: ''کچھ نہیں۔ آئے ہیں کہ ان کے لیے شناخت نامہ لے لیں''۔

پیرمرد نے پوچھا: ''کیا ہوا اس کا شناخت نامہ، گم ہوگیا ہے؟''

''نہیں اس کا بنا ہی نہیں ہے۔ یعنی شروع سے بغیر شناخت نامہ کے یہ پیدا ہوا ہے''۔

''خوب لیکن اب کیوں؟ ایک ہی مرتبہ آئے ہوتے جب شادی کا وقت آتا''۔

بھائی خیراللہ نے کہا: ''اس وقت بھی نہیں آتے، یعنی شناخت نامہ کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ کسی کو ہمارے شناخت نامہ سے کوئی سروکار نہیں۔ اس وقت اس لیے آئے ہیں کہ اس کا نام اسکول میں لکھوانا ہے۔ اسکول والوں کا کہنا ہے کہ انھیں شناخت نامہ چاہیے''۔

وہ سفارشی خط جوان کے پاس تھا اسے دیا۔ پیرمرد نے کاغذ پر نظر ڈالی۔ عینک کو ٹھیک کیا اور کاغذ کو آنکھوں کے نزدیک لے جاکر پڑھا اور بولے: ''ہم اس طرح سے شناخت نامہ نہیں دے سکتے۔ اس کا بھی طریقہ ہے۔ ایسا ویسا بے اصول شہر نہیں ہے کہ ایرے غیرے جو آگئے ان کو شناخت نامہ دے دیں۔ ہمیں کیسے معلوم ہو کہ یہ کتنے

سال کا ہے، کون کیا کرتا ہے؟ کون مالک ہے؟ کیا کام ہے؟ ملک کا قانون یوں ہی بیکار نہیں ہے''۔

''مجھے پتہ ہے میں اس کا بھائی ہوں۔ میں اس کا مالک ہوں، ابھی تیرہ سال کا ہے''۔

''تیرہ سال کا ہے اور بس ختم؟ واہ... ہمیں کیسے معلوم ہو کہ تمھیں اس کے بھائی ہو۔ کیا ہمیں اس کا پتہ ہے۔ کچھ خبر ہے؟''

''میں اگر اس کا بھائی نہیں ہوں تو پھر دوسرا کون ہے؟ صاحب میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں''۔

''بہرحال ہم کچھ نہیں جانتے۔ قانون نے ہمارے ہاتھ پاؤں باندھ رکھے ہیں۔ اُس کی برتھ سرٹیفکیٹ لاؤ۔ شاید کچھ کام بن جائے''۔

''بڑے صاحب! ہم لوگوں کے پاس جنم پتری نہیں ہوتی۔ جھونپڑی میں پیدا ہوئے، ماں کسی ڈاکٹر و حکیم کے پاس نہیں گئی کہ ہم سرٹیفکیٹ لائیں''۔

''تو پھر ٹھیک ہے جایئے''۔

''آپ کو آپ کی بزرگی کی قسم ہے، بڑے صاحب کچھ رحم کیجیے۔ یہ ساری عمر بغیر شناخت نامہ کے نہیں رہ سکتا۔ ہم لوگ تو بدبخت ہیں، بس اتنا کافی ہے''۔

''اب اس بات کی اتنی فکر کیوں ہے۔ پہلے ہی کیوں نہیں کی جب پیدا ہوا تھا۔ اب شناخت نامہ کی فکر کر رہے ہو جب شادی کرنے کا وقت آگیا''۔

''اب تو ایسا ہو ہی گیا، بتایئے ہم کیا کریں؟ کوئی تدبیر تو مجھے بتایئے''۔

''گاؤں والوں سے گواہی نامہ لاسکتے ہو۔ ایک گواہی نامہ لو اور محلّہ کے بزرگوں سے اس پر دستخط کرواؤ اور پھر لاؤ شاید کام ہوجائے''۔

''صاحب وہ لوگ پڑھے لکھے نہیں ہیں کہ دستخط کریں''۔

''پھر میں کیا جانوں۔ میں نے بھی کیا غلطی کردی! ٹھیک ہے انگوٹھا لگوا لاؤ''۔

بولے: ''اگر پڑھے نہیں ہیں تو انگوٹھا تو ضرور ہی ہوگا''۔

''صاحب بس ایک زحمت اور گوارا کردیجیے۔ ایک گواہی نامہ لکھ دیجیے۔ ہم لوگ اس طرح کا کام نہیں کرپاتے''۔

''میں؟ میں کیا لکھوں؟ بیٹے میں کیا لکھوں؟ تمھیں لکھوانا ہے، تمھیں دستخط کروانی ہے''۔

''بس اور کچھ نہیں۔ بہت بہت شکریہ۔ آپ کل ہوں گے؟ آپ کے پاس ہی لائیں گے''۔

''ہاں رہوں گا۔ آپ تشریف لائیے، میں رہوں گا''۔

ابھی دروازہ سے باہر نہیں گیا تھا کہ دوبارہ اس پیرمرد نے آواز دی:

''بھولنا نہیں! اپنے محلّہ کے کارپوریشن کے دفتر سے بھی تائید کرالینا ورنہ گواہی نامہ بے وقعت رہے گا''۔

''ہم نے بھی کیا غلطی کی ہے! (اب کہوگے کہ) ہمارے محلّہ میں کارپوریشن کا دفتر نہیں ہے۔ اب یہ دفتر کہاں سے لائیں''۔

خیراللہ مڑا اور ان کی میز کے پاس کھڑا ہوا اور کہا: ''معاف کیجیے صاحب، ہمارے محلّہ میں کارپوریشن کا دفتر نہیں ہے''۔

''کارپوریشن کا دفتر نہیں ہے؟ پھر کیا ہے؟ پھر کہہ دو کہ کچھ ہے ہی نہیں''۔

''...صاحب اس میں ہمارا کیا قصور؟''

''بیٹے کیا یہ ممکن ہے کہ آدمی جہاں رہ رہا ہو وہاں دفتر نہ ہو۔ آخر ایسا کیسے ہوسکتا ہے کہ کارپوریشن کا دفتر نہیں ہوگا؟ سیدھے سے ایک مرتبہ کہہ دو کہ پہاڑ کے پیچھے رہتے ہو اور تم بھی راحت کی سانس لو، بس!''

''جناب میں نے کہا کہ حلبی آباد ہے، وہاں کچھ بھی نہیں ہے۔ آپ کیوں میری بات کا یقین نہیں کرتے؟ وہاں حلبی آباد میں نہ پانی ہے نہ بجلی نہ کھانے کو روٹی نہ دفتر نہ مدرسہ نہ ڈاکٹر نہ گرام سبھا نہ پولیس نہ چوکی... کچھ بھی نہیں ہے۔ خشک و بیاباں؛ خالی خالی اب آپ ہی بتایئے میں کیا کروں؟''

خیراللہ پسینہ پسینہ ہوگیا تھا اور رنگت سفید پڑگئی تھی اور اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ پیرمرد بھی سمجھ گیا کہ خیراللہ کو غصّہ آ گیا ہے۔ بات مختصر کرتے ہوئے بولا: ''اچھا تم وہی گواہی نامہ لاؤ۔ دیکھتے ہیں کیا ہوپاتا ہے۔ جاؤ بابا، جاؤ میری جان''۔

دفتر کی سیڑھیوں سے ہم لوگ اُتر رہے تھے۔ خزاں کی گرم گرم دھوپ سڑک پر پھیلی ہوئی تھی اور بہت بھلی لگ رہی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ بس دھوپ میں سوجائے۔

بھائی خیراللہ نے کہا: ''عبداللہ وہ گل پری، نوروزعلی کی بیٹی ابھی ہے یا سسرال چلی گئی؟

میں نے کہا: ''نہیں ابھی ہے، کیوں کس لیے؟''

''کچھ نہیں۔ یہ گواہی نامہ ہم لوگ اسی کو دے دیں، لکھ دے، ہم لوگ کس کو دیں؟''

''سچ ہے؛ گل پری نوروزعلی محلّہ میں اکیلی لڑکی تھی جس نے نویں تک پڑھائی کی تھی۔ جسے بھی کچھ لکھوانا ہوتا تھا وہ اسی کے پاس جاتا تھا۔ کچھ لوگ تو ہر طرح کا کام اسی کو دے دیتے تھے۔ خواہ سمجھ میں آئے یا نہ آئے''۔

نافتان والے نانبائی تک پہنچتے پہنچتے تو میرے پاؤں سست پڑگئے۔ پیٹ بھی دھنسا جارہا تھا۔ گرم گرم نافتان کی خوشبو پورے فٹ پاتھ پر پھیلی ہوئی تھی۔ میرے جیسے بھوکے کو تو لالچ ہی آجائے کہ وہ نانبائی کی میز سے جاکر روٹی اُٹھالے اور ایک لقمہ کھالے۔ پیٹ میں چوہے کود رہے تھے۔ میں نے کہا: ''بھائی خیراللہ چلئے ایک عدد

روٹی خرید تے ہیں اور کھاتے ہیں''۔

بھائی خیراللہ نے کہا: ''ابھی ہم لوگ بہن کنیز کے یہاں چلتے ہیں۔ اگر بھوک بہت تیز لگی ہے تو تمھارے لیے ایک عدد روٹی خرید دوں''۔

میں نے کہا: ''نہیں، چلئے وہیں چلتے ہیں۔ ضرور کچھ نہ کچھ کھانے کو ملے گا۔

○

جب ہم لوگ محلّہ میں پہنچے تو سورج ڈوب رہا تھا۔ ہم لوگ اتنے تھک گئے تھے کہ جی چاہا کہ سب سے پہلی چال یعنی سلیم خاں کی جھونپڑی کے سامنے وہیں زمین پر ہی سو جاؤں۔

میری ماں مٹّی مل رہی تھی اور اس نے ایک ڈھیر مٹّی بنا رکھی تھی، تاکہ جھونپڑی کے کنارے کنارے کی دیوار جس کے منہ کھل گئے تھے اس میں وہ مٹّی بھر دے کہ اتنے میں ہم لوگوں کو دیکھ لیا۔ اسی طرح اس کی سانسیں پھول رہی تھیں۔ بولی کہ ''اندر ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں گھستی ہیں جھونپڑی گرم نہیں ہو پاتی۔ تم لوگوں نے اتنی دیر کیوں کر دی؟ ایک نام لکھوانے میں اتنا وقت لگتا ہے؟ اندر جاؤ، دیکھو تمھارے باپ بھٹی کی طرح جل رہے ہیں''۔

خیراللہ نے کہا: ''میں نے صبح جانے سے پہلے ہی کہا تھا کہ ڈاکٹر کے یہاں چلئے۔ نہیں تیار ہوئے، ضد کر گئے سنا ہی نہیں۔ اگر آ گئے ہوتے تو دوا ٹکیہ اور شربت تو پی ہی لیا ہوتا۔ کم سے کم کچھ تو طبیعت بہتر ہوتی''۔

بابا نے جھونپڑی میں خیراللہ کی آواز سن لی اور گھٹی گھٹی آواز میں بولے: ''کہاں سے آتا کہ ٹکیہ اور شربت خریدتے؟ چوری کرتے، اسمگلنگ یا ہیروئن بیچتے؟'' پھر کچھ اس طرح بولے کہ سمجھ میں نہیں آیا۔

ماں نے رُندھی آواز میں کہا: ''کچھ فکر کرو بچو، اس طرح کام نہیں چلنے والا ہے''۔

خیراللہ نے کہا: ''مجھے کچھ نہیں، اگر چلتے ہیں تو چلیں۔ میں ابھی ڈاکٹر کے پاس لے چلتا ہوں''۔

میں بری طرح تھک گیا تھا۔ جھونپڑی میں سونے کے لیے گیا۔ بابا کا منہ لحاف میں تھا۔ خرخر کی آواز آئی اور بند ہو گئی۔

خیراللہ نے پوچھا: ''کیا کہہ رہے ہیں؟''

ماں نے کہا: ''کچھ نہیں، کہہ رہے ہیں سویرے''۔

خیراللہ نے کہا: ''صبح ہوگی تو پھر کہیں گے شام...''

حلیمہ اندھیرے میں بیٹھی کچھ سی رہی تھی، پوچھا: ''عبداللہ تمھارا نام لکھ گیا؟''

مجھ میں سوال و جواب کا بھی حوصلہ نہیں تھا، کہا: ''نہیں۔ کہا ہے کل آنا۔ شناخت نامہ چاہیے''۔

بولیں: ''تمھارے مزے ہیں''۔ پھر کیا کہا سمجھ میں نہیں آیا۔ میری آنکھیں نیند سے بوجھل تھیں اور میں سو گیا۔

ابھی آنکھ لگی ہی تھی کہ خیراللہ کی آواز سے میری نیند اُڑ گئی۔

''عبداللہ سوؤ نہیں۔ ایک مرتبہ چلو یہ گواہی نامہ کا بھی کام ختم کر دوں۔ بعد میں سونا''۔

میں نے جمائی لی اور کہا: ''اب مجھ سے نہیں ہوگا۔ آپ تنہا جائیے''۔

''تم آ جاؤ تو بہتر ہے۔ کم از کم تم کو دیکھیں گے تو کوئی بہانہ نہیں بنائیں گے''۔

ہزار زحمت کے باوجود میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ جب خیراللہ کسی بات پر اصرار کریں تو پھر کسی طرح کا بہانہ ممکن نہیں ہوتا۔ مشکل سے اُٹھا۔ حلیمہ نے کہا: ''کم از کم ایک لقمہ روٹی تو منہ میں ڈالتے جاؤ''۔

ماں اپنے ہاتھوں سے خشک مٹی چھڑاتے ہوئے بولیں: ”کچھ ہے نہیں بیٹا، صرف بربری روٹی ہے۔ چائے تم لوگوں کے لیے بناتی ہوں“۔

خیراللہ نے کہا: ”جب تک چائے بنائیے ہم ابھی آتے ہیں۔ زیادہ کام نہیں ہے“۔ پھر حلیمہ سے کہا: ”حلیمہ! اُٹھو ایک منٹ کے لیے گل پری کے یہاں چلتے ہیں اور ابھی آتے ہیں“۔

گل پری کے بابا نوروزعلی کی جھونپڑی ہماری جھونپڑی کے اُس طرف چار جھونپڑی کے بعد تھی۔ اپنی جھونپڑی ایک مٹی کے ٹیلہ کے کنارے بنا رکھی تھی تا کہ جب شمالی بیابانوں سے ہوائیں چلیں تو سردی کی اذیت نہ ہو۔

گل پری نہیں تھی۔ نوروزعلی نے بتایا کہ وہ مشہدی سکینہ کے گھر گئی ہے۔ پھر حلیمہ کی طرف رُخ کیا اور کہا: ”جاؤ اسے آواز دے دو۔ وہاں کچھ کام نہیں ہے۔ اسی طرح دل گھبرایا اور وہاں چلی گئی ہے“۔

حلیمہ گئی تو نوروزعلی نے پوچھا: ”تعجب ہے! اِدھر کیسے۔ کافی دِنوں سے اِدھر نہیں آئے“۔

خیراللہ نے کہا: ”کیا کروں چچا نوروز۔ کم آنے کی بات نہیں ہے۔ آنا جانا مشکل ہوتا ہے“۔

نوروزعلی اپنی خمیدہ کمر سے اُٹھے، جھونپڑی کے کونے سے ایک کالی کیتلی جس میں سے بھاپ نکل رہی تھی، لائے اور میرے لیے تو پیالے میں اور بھائی خیراللہ کے لیے پیالی میں چائے اُنڈیلی۔ دل میں میں نے کہا، اچھا ہے کہ میری چائے پیالہ میں ہے، جلدی ٹھنڈی ہوگی۔

اسی اثنا، گل پری نے جھونپڑی پر پڑے کمبل کے پردے کو ہٹایا۔ اندر آئی اور سلام کیا۔ خیراللہ نے جواب سلام دیتے ہوئے کہا: ”گل پری خانم! ہم لوگ آئے ہیں

کہ تم ایک گواہی نامہ لکھ دو پھر اس پر سب سے دستخط کرالوں“۔

نوروزعلی نے پوچھا: ”کیسی گواہی؟“

خیراللہ نے کہا: ”محلّہ والوں کی گواہی۔ چاہتا ہوں کہ سب کے دستخط ہو جائیں تا کہ عبداللہ کو شناخت نامہ مل جائے۔ دفتر والوں نے کہا ہے کہ گواہی نامہ لاؤ“۔

نوروزعلی نے کہا: ”اس کے بعد تم کس سے دستخط کراؤ گے؟“

”یہی محلّہ کے بزرگوں سے۔ شہر والوں سے تو گواہی نہیں لے سکتے۔ یہیں کے لوگوں سے دستخط کرالوں“۔

نوروزعلی نے کہا: ”یہاں والوں کے دستخط قبول نہیں کریں گے۔ سنو ایک مجھ ہی کو لے لو۔ میرے پاس شناخت نامہ کہاں ہے کہ میں تمھارے گواہی نامہ پر دستخط کروں“۔

خیراللہ نے کہا: ”آپ کو شناخت نامہ کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ تو صرف دستخط کر دیجیے کہ وہ لوگ عبداللہ کو شناخت نامہ دے دیں“۔

نوروزعلی نے کہا: ”ایہہ... تم نے میری بات سنی ہی نہیں کہ میں نے کیا کہا ہے؟ صرف یہی نہیں کہ میں گواہی نامہ پر دستخط کروں بلکہ مجھے خود شناخت نامہ چاہیے، یعنی یوں ہی کوئی کسی کا گواہ نہیں بن سکتا ہے۔ اسے شناخت نامہ رکھنا ہی ہوگا۔ اگر میں سو دستخط بھی کر دوں تب بھی میرے دستخط قابلِ قبول نہیں ہوں گے کیونکہ میرے پاس شناخت نامہ نہیں ہے“۔

خیراللہ نے کہا: ”پھر کیا کروں۔ میں شناخت نامہ والوں کو کہاں سے پکڑ لاؤں؟“

نوروزعلی: ”ہم لوگوں کو بھی گل پری کے شناخت نامہ کے سلسلہ میں اسی طرح کی پریشانی اُٹھانی پڑی۔ مجھے پتہ ہے، میں جانتا ہوں، تم ابھی کچھ معتبر شناخت نامہ والے لوگوں کو ڈھونڈو تا کہ وہ تمھارے گواہی نامہ پر دستخط کریں ورنہ کیوں کر ممکن ہے کہ ایک نفر جس کے پاس خود ہی شناخت نامہ نہ ہو وہ دوسروں کے شناخت نامہ پر دستخط کرے“۔

خیراللہ نے کہا: ''ابھی تو گل پری خانم ایک زحمت برداشت کریں اور اس گواہی نامہ پر لکھیں شاید بات بن ہی جائے اور دفتر قبول کرلے''۔

''ہم اُن سے یہ کہنے تو جا نہیں رہے ہیں کہ دستخط کرنے والے کے پاس شناخت نامہ نہیں تھا۔ اگر دفتر والوں نے پوچھا تو کہہ دیں گے کہ ان لوگوں کے پاس شناخت نامہ تھا''۔

نوروزعلی نے کہا: ''ہونہہ! ہوا ہوائی نہیں ہے۔ سند مانگیں گے، فوٹو کاپی مانگیں گے اور درخواست مانگیں گے، ملک کے کام ایسے ہی نہیں ہیں''۔

خیراللہ نے کہا: ''چچا نوروز! فی الحال ضروری نہیں ہے۔ شاید وہ لوگ قبول کرلیں۔ ہم کیا کریں، مجبور ہیں''۔

نوروزعلی نے کہا: ''کوئی بات نہیں۔ خیر چلو۔ گل پری ابھی آتی ہے تو لکھ دے گی۔ میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ وہ نہ لکھے بلکہ میں نے یہ باتیں صرف اس لیے کہی ہیں کہ یہ سب تمھارے کان میں پڑی رہیں کہ کل کو تم یہ نہ کہو کہ یہ نوروزعلی تجربہ کار ہوکر بھی انھوں نے یہ باتیں نہیں بتائیں''۔

گل پری پہلے تو ایک کاغذ اور قلم لائی اور پھر بعد میں چراغ، اسے جلایا اور اپنے باپ کے بغل میں بیٹھ گئی اور بولی کہ ''کیا لکھنا ہے؟''

نوروزعلی نے کہا: ''کچھ نہیں لکھو:

گواہی دی جاتی ہے کہ عبداللہ خداداد کرم ابن کرم علی سن...''

''سن کیا لکھوں خیراللہ؟''

''مجھے پتہ نہیں۔ واللہ مجھے پتہ نہیں''۔

''اب عبداللہ نے تیرہ سال پورے کیے ہیں۔ بھری گرمی میں پیدا ہوئے تھے۔ سال و مہینہ مجھے یاد نہیں''۔

نوروزعلی نے کچھ سوچا اور بولے: ''کہ... مہینہ میں'' بعد میں اُنگلیوں پر گن کر کہا، ۱، ۲، ۳، ۴، ۵... کہ پانچویں مہینہ میں تیرہ سال پہلے یہ پیدا ہوا تھا۔ شناخت نامہ یہ نہیں رکھتا ہے، اسی لیے درخواست کی جاتی ہے کہ ان کو شناخت نامہ دے دیا جائے۔

گل پری نے جلدی جلدی یہ عبارت لکھی اور کاغذ کو خیراللہ کو دیا۔ خیراللہ نے کاغذ پر نظر ڈالی اور اسے اس طرح دیکھا کہ جیسے بہت پڑھا لکھا ہو اور کہا: ''زحمت ہوئی، شکریہ!''

پھر کاغذ کو نوروزعلی کو تھماتے ہوئے کہا: ''چچا نوروز! آپ کو زحمت تو ہوگی مگر ایک دستخط کردیجیے...''

نوروزعلی نے کہا: ''ٹھیک ہے میں دستخط کردیتا ہوں مگر وہی جیسا کہ میں نے تم سے کہا اس کاغذ کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اس سے تمھیں کچھ فائدہ نہ ہوگا''۔

کاغذ کو اپنے پیر کے پاس رکھا، گل پری سے قلم لیا اور بہت احتیاط سے نیچے کی طرف دستخط کرکے خیراللہ کو دے دیا۔

بھائی خیراللہ باہر گئے اور ان کے پیچھے میں بھی تیز تیز اپنی چائے کو گھونٹتے ہوئے دوڑا کہ نوروزعلی نے مجھے آواز دی: ''عبداللہ... عبداللہ!'' میں مڑا۔ ''آؤ بیٹا، یہ دوات بھی لے جاؤ۔ جو انگوٹھا لگانا چاہے گا اس سے لگالے گا''۔

باہر ابھی اندھیرا نہیں چھایا تھا۔ ایسے موقعوں پر زیادہ تر لوگ اپنی اپنی جھونپڑیوں کے سامنے ہی اکٹھا رہتے ہیں تاکہ ملاقات کریں اور ایک دوسرے کی خیریت لیں اس لیے کہ رات میں کسی کے گھر جانا نہ پڑے اور صاحبِ خانہ کو زحمت نہ ہو اور جو تیل کھانا وغیرہ بنانے کے لیے رکھا ہو وہ بے ضرورت چراغ میں نہ ڈالنا پڑے۔

ابراہیم بیگ بھی اپنے جھونپڑے کے سامنے ایک کنستر پر بیٹھا ہوا ایک مجبور بڑھیا گل بی بی سے جو وہیں سامنے بیٹھی ہوئی تھی باتیں کرنے میں مشغول تھا۔ ابراہیم بیگ

کی حیثیت اگرچہ اتنی بری نہیں تھی لیکن اتنا کنجوس تھا کہ جب تک کہ بالکل اندھیرا نہ ہوجائے اپنے بیوی بچوں کو چراغ روشن کرنے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ چاندنی راتوں میں کہتا تھا کہ جھونپڑی کا پردہ اُٹھا دو تا کہ اندر روشنی جائے اور چراغ جلانے کے لیے مجبور نہ ہوں۔

بھائی خیراللہ نے سلام کیا اور کہا: ''چچا ابراہیم! اس گواہی نامہ پر آپ ایک دستخط کردیں گے؟''

ابراہیم بیگ نے کہا: ''کیسا گواہی نامہ؟ یہ کیا ہے؟''

بھائی خیراللہ نے کہا: ''کچھ نہیں ابراہیم چچا، عبداللہ کے لیے شناخت نامہ کی ضرورت ہے۔ نوروزعلی نے بھی دستخط کردی ہے''۔

''نہیں نہیں خیراللہ بیٹا۔ میں دستخط نہیں کروں گا۔ دستخط ایک ذمہ داری ہے''۔

''اگر ایسا ہی ہوتا تو نوروزعلی نے کیوں دستخط کی''۔

''انھوں نے کیا ہوگا۔ مجھے اور نوروزعلی دونوں کو ایک قبر میں تو نہیں سلائیں گے۔ نہ میں دستخط نہیں کروں گا۔ ذمہ داری کا کام ہے''۔

میں نے کہا: ''ٹھیک ہے ابراہیم چچا دستخط نہ کیجیے انگوٹھا لگا دیجیے۔ انگوٹھا نشانی بھی چلے گی''۔

انھوں نے مجھے گھورا اور کہا: ''انگوٹھا بھی ذمہ داری کا کام ہے۔ دونوں میں فرق ہی کیا ہے؟''

بھائی خیراللہ نے کہا: ''دستخط چھوڑو۔ چلو دورملک کے پاس چلتے ہیں''۔

دورملک مہربان آدمی ہے۔ میرے بابا کہتے ہیں پہلے گڈریا تھا پھر چرواہی کا کام چھوڑ کر حلبی آباد آ گیا۔ اپنا وقت ضائع کیا۔ اس چرواہی کے کام کی نشانی صرف ایک چھوٹی بانسری لایا ہے۔ غروب کے وقت اپنی خالی جھونپڑی کے سامنے بیٹھ کر اپنے

شوق کے لیے بانسری بجاتا ہے۔ بابا کہتے ہیں کہ جب بھی دورملک کی سوزناک آواز سنتا ہوں، پرانے گذرے ہوئے دِنوں کی یاد آتی ہے، وہ بیتے دِن یاد آجاتے، جب ہم لوگ گاؤں میں کام کرتے تھے۔ روئی اور دھان کے کھیتوں کی یاد آتی۔ گرگان کے صحرا و دشت... آہ کیا ہی اچھے دن تھے!

جب ہم لوگ دورملک کی جھونپڑی کے پاس پہنچے۔ دیکھا ہمیشہ کی طرح ایک مٹی کے ٹیلہ پر بیٹھا بانسری بجا رہا ہے۔ میں نے کہا: خدا سلامت رکھے!''

دورملک نے کہا: ''خیراللہ کرم علی سلام علیکم۔ کہاں ہو؟ کیا حال ہے؟ سفر سے کب لوٹے جوانمرد؟''

بھائی خیراللہ نے کہا: ''کل۔ پرسوں چلا جاؤں گا۔ کل اس کا نام اسکول میں لکھوانے جاؤں گا، تا کہ میرے دل کو اطمینان رہے۔ دورملک میں نہیں چاہتا کہ یہ بھی ہم لوگوں کی طرح رہے''۔

دورملک نے کہا: ''کیا کہنا خیراللہ! ایک مسلمان کو جو کرنا چاہیے تم وہ کر رہے ہو۔ خدا تمھیں خوش رکھے۔ تم اپنے گھر کے بچوں کے کام سے غافل نہیں ہو۔ خیراللہ جانتے ہو، یہ بچے میمنہ کی طرح بے گناہ و بے آواز ہوتے ہیں۔ جیسے ہی ان سے غافل ہوئے چیتے بھیڑیوں کے ہاتھ لگ جائیں گے''۔

بھائی خیراللہ نے کہا: ''یہاں ایک نشانی لگادو''۔

''یہ کیا ہے؟''

''کچھ نہیں، عبداللہ کے شناخت نامہ کے لیے گواہی چاہیے''۔

دورملک نے فوراً انگوٹھا بڑھایا، روشنائی میں ڈبویا اور کاغذ پر لگا دیا اور کہا: ''یہ دستخط اب تمھارا مال ہے۔ جاؤ اللہ تمھیں نیکی عطا کرے!'' ہنسا اور بانسری اپنے ہونٹوں میں دبالی اور ایک غمگین دُھن بجانے لگا جو انسان کو کپاس اور دھان کے کھیتوں

کی یاد دلاتی تھی۔ خود ہی گاتا اور خود ہی بانسری بجاتا تھا۔ اتنی دیر تک بانسری بجاتا کہ تھک جاتا تھا۔ کبھی کبھی تو راتوں کو وہیں سو جاتا اور اسے پتہ بھی نہیں چلتا کہ اسے کب نیند آ گئی۔ ایسا لگتا تھا جیسے دور ملک بھول جاتا تھا کہ وہ میمنہ، بکری کے بچوں اور بھیڑوں کے درمیان نہیں بلکہ حلبی آباد کے کوڑے کچرے، لوہوں کے ٹکڑے، پھٹے کپڑوں، جھوٹے پھلوں اور کانچ کے ٹکڑوں کے درمیان بیٹھا ہے۔

جب میں گھر پہنچا تھکن سے مجھے رونا آ رہا تھا۔ اندھیرا ہو چکا تھا۔ ماں نے چراغ روشن کیا اور بابا کے سرہانے رکھ دیا۔ ناصر اور ملک ناز سو رہے تھے اور حلیمہ عورتوں کے ساتھ کوڑے دان کی طرف گئی ہوئی تھی۔ اکثر عورتوں کا یہی کام تھا کہ راتوں میں کوڑے دان پر چلی جاتی تھیں جو ہمارے محلّہ سے دو تین سو قدم اُونچائی پر تھا۔ گھومتی رہتی تھیں کوڑوں کو اُلٹتیں پلٹتیں اور کچھ مل جاتا۔

راتوں کو جب بلدیہ (شہرداری) والے ان کوڑوں کو جلاتے تو ہوا، جلتے ہوئے کوڑوں کی بدبودار سوغات ہم لوگوں کے لیے لاتی لیکن اس کے باوجود یہ ایک اچھا کوڑے دان تھا۔ ماں کہتی تھی کہ خدا کا شکر ہے کہ بلدیہ والوں کی عقل میں یہ بات نہیں آئی کہ اس کوڑے دان کو یہاں سے ہٹا کر کہیں اور لے جائیں۔ ایسی صورت میں ہمارے دن اس سے بھی برے ہو جاتے۔ خدا کا شکر! خدایا تیرا ہزار ہزار شکر!

ماں سچ ہی کہتی تھی، وہاں سے ہمیشہ کچھ نہ کچھ ہاتھ آ جاتا تھا۔ کپڑے، پھٹے پرانے ایسے جوتے کہ پھر بھی انھیں پہنا جا سکتا تھا۔ پلاسٹک کے ٹوٹے پھوٹے برتن کہ اگر استعمال کے لائق نہ بھی ہوں تو انھیں کباڑی کی دُکان پر بیچ کر نقد پیسہ یا اس کے بدلے کوئی کارآمد سامان مل جاتا۔ حتیٰ کہ بعض اوقات کھانے کی چیزیں اور پھل بھی ملتے۔ پھلوں کے ڈبوں میں ایک آدھ اچھا پھل ضرور ہوتا۔ صرف چیل جیسی آنکھ ہو، تاکہ ضرورت کی چیز کو کوڑے میں دیکھ لے اور شکرے کی طرح پنجہ میں دبا کر لے اُڑے۔

خود مجھے بھی جیسے ہی موقع ملتا اور دل خوش ہوتا تو بچوں کے ساتھ کوڑے دان کی طرف چلا جاتا۔ قسمت کی بات تھی، کبھی قیمتی چیز بھی آدمی کی جھولی میں پڑ جاتی۔ ابھی بھی سب کو اس سونے کی انگوٹھی کا افسوس ہے جو رحمان مرزوئی کو کوڑے دان میں ملی تھی۔ بھائی خیراللہ کو کوڑے دان کی طرف جانا بالکل پسند نہیں تھا۔ وہ کہتے تھے کہ بیمار ہو جاؤ گی۔ سِل وغیرہ جیسی بیماری لگ گئی تو مر جاؤ گی۔

کون سننے والا تھا۔ خیراللہ کی موجودگی میں بھی حلیمہ اور ماں دونوں چپکے سے چلی جاتی تھیں۔

رات کے کھانے میں روٹی اور ٹماٹر تھا۔ ماں ٹماٹر وہیں سے لائی تھیں۔ اچھی طرح صفائی سے دھو کر دسترخوان پر رکھ دیا تھا۔ خیراللہ کو خبر نہیں تھی۔ اگر انھیں پتہ چل جاتا تو لڑائی کرتے اور کھاتے بھی نہیں۔ میں بھی اسے کھانے سے ہچکچا رہا تھا۔ جیسے ہی ماں اور خیراللہ باتوں میں مشغول ہوئے میں بابا کے لحاف میں گھس گیا۔ ابھی گرم بھی نہیں ہوا تھا کہ مجھے نیند آ گئی۔ خواب میں وہی اسکول دیکھ رہا تھا جہاں ابھی بچے کھیل رہے تھے اور پھر فوراً کلاس میں چلے گئے اور زور زور سے سبق پڑھنے لگے۔ اس کے بعد یہ بھی دیکھا کہ میں اور خیراللہ دونوں زونل آفس میں پریشان ہیں اور بڑے صاحب کہہ رہے ہیں کہ: ''نہیں ہو سکتا، اگر ہو جاتا تو نام لکھ دیتا''۔ دوبارہ دیکھا کہ تنہا شناخت نامہ کے دفتر میں کھڑا ہوں اور وہ دفتر کے دونوں بڑے صاحب جو جڑواں لگ رہے تھے۔ ان بڑی بڑی سیاہ کتابوں کے ساتھ میرے سامنے کھڑے ہیں اور عینک کے اوپر سے مجھے دیکھ رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ: ''شناخت نامہ لاؤ کینسل کر دوں''۔ میں تنہا تھا، بہت ڈر رہا تھا اور آنکھیں بند کر لیں تاکہ ان دونوں کو نہ دیکھ پاؤں، لیکن وہ میری بند آنکھوں کے پیچھے سے بھی نظر آ رہے تھے اور مردہ کی طرح شکل وصورت بنائے ہوئے میرے پیچھے آ رہے تھے۔ ہر چند میں یہ کوشش کر رہا تھا کہ بھاگ جاؤں

لیکن ایسا نہیں کرسکا۔ اسکول کے بچے مجھ پر ہی ہی ہنس رہے تھے، اور ساتھ ہی پڑھ رہے تھے کہ ''چاندنی نے ہر جگہ کو روشن کردیا...'' یک بیک نیند ٹوٹ گئی۔ پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ ماں اور خیراللہ ابھی بیٹھے ہی ہوئے تھے اور باتیں کررہے تھے۔ بابا میری بغل میں سو رہے تھے۔

دوبارہ میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ میں نے سنا کہ ماں اور خیراللہ میرے ہی بارے میں باتیں کررہے تھے۔ میں نے اپنے کان لگائے۔ خیراللہ نے کہا: ''نہیں اسے نہ جگایئے، گناہ ہے۔ کل رات بھی سویا نہیں، آج بھی بچہ بہت تھک گیا ہے۔ آج اس کی جگہ کام پر میں چلا جاؤں گا''۔

مجھے کارخانہ یاد آ گیا۔ اس بات پر خوش ہوا کہ آج کام پر میرے بدلے بھائی خیراللہ جائیں گے۔ سچ ہے اگر میں جانا بھی چاہتا تو میرے بس کا نہیں تھا۔ میرا سارا بدن ٹوٹ رہا تھا۔ کام پر جاتا بھی تو اونگھتا ہی رہتا۔

ادھر جب میں بھائی خیراللہ کے بارے میں سوچتا کہ یہ پرسوں ہی بندر عباس چلے جائیں گے تو افسوس ہوتا۔ بیچارے کل سے آئے ہیں اور اب تک میرے ہی کام میں لگے ہوئے ہیں۔

ایک دفعہ تو میرا دل اس بات پر بہت کڑھا کہ میں نے انتہائی کم ہمتی کا مظاہرہ کیا ہے کہ خود تو سو رہا ہوں اور وہ جاکر میرے بدلے کام کریں۔ میرا گلہ رُندھ گیا، آنکھیں جلنے لگیں اور دھیرے دھیرے آنسو آ گئے۔ میں نے کہا: ''جہنم میں جائے۔ تھکا ہوں تو ہوں گا۔ جیسے بھی ہوگا میں اُٹھوں گا اور بھائی خیراللہ سے کہوں گا کہ ضروری نہیں کہ آپ کام پر جائیں۔ کیا میں اپاہج ہوں کہ آپ جائیں گے؟ اسی درمیان میں نے چاہا کہ پیر سمیٹوں تو دیکھا کہ اُف اس میں تو ہلنے کی بھی طاقت نہیں تھی۔ طاقت لگا کر کھڑا ہونا چاہا کہ دوبارہ آنکھیں بوجھل ہوئیں اور میں سوگیا۔ میں پھر وہی خواب دیکھنے لگا

کہ وہی دونوں شناخت نامہ نویس آئے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ ''کرم علی مرگئے۔ ہم لوگ ان کا شناخت نامہ کینسل کرنے آئے ہیں''۔ پھر دیکھا کہ اسکول کے بچے آ گئے اور اسی کتاب کو سب نے مل کر پڑھا۔ دور ملک بھی ان کے لیے ٹیلے پر بیٹھا بانسری بجا رہا تھا۔

دوبارہ نیند سے اُٹھا تو دیکھا کہ نہ ماں ہیں اور نہ خیراللہ۔ ناصر اور ملک ناز آرام سے سو رہے تھے۔ ناک بول رہی تھی۔ میں نے سوچا خدا نہ کرے کہیں بابا مر نہ گئے ہوں۔ ڈرتے ڈرتے میں نے انھیں دیکھا۔ خدا کا شکر سانس لے رہے تھے، لیکن سانس کی آواز تیز ہوگئی تھی۔ گل بی بی کی باتیں یاد آ گئیں جو وہ ماں سے کہہ رہی تھیں کہ جب میرا شوہر مرا تو کسی نے قبرستان میں دفن نہیں کرنے دیا۔ ایسے میں مردہ کے ساتھ کیا کیا جائے؟

میرا منہ خشک ہوگیا تھا اور ایسا سوچ کر میری پیاس مزید بڑھ گئی تھی۔ پسینہ بھی چل رہا تھا اور گرمی بھی لگ رہی تھی۔ اُٹھا ایک پیالہ پانی پیا اور دوبارہ لحاف میں گھس گیا۔

ابھی گرم بھی نہیں ہوا تھا کہ مجھے نیند آ گئی۔ مگر بابا نے آواز دی ''عبداللہ... عبداللہ!''

میں نے کہا: ''جی!''

بولے: ''اُٹھو ایک پیالہ پانی دو بیٹا میں پی لوں''۔

بڑی مشکل سے لحاف سے باہر نکلا، ڈبہ کے پاس گیا، ایک پیالہ پانی اُنڈیلا، انھیں تھمایا۔ پانی پی کر پیالہ مجھے واپس دیا اور میں اسے کرسی پر رکھ کر پھر بستر میں گھس گیا۔ اس مرتبہ لحاف میں نے سر پر کھینچا اور ہر طرف سے سمیٹ لیا تاکہ گرم ہوجاؤں۔ دوبارہ میں نے جیسے ہی آنکھیں بند کیں شناخت نامہ نویس اور مدرسہ کے بچے میری نگاہوں کے سامنے گھومنے لگے۔

دوبارہ میں گرم ہو ہی رہا تھا کہ کسی کے پکارنے کی آواز سنی ''عبداللہ!...عبداللہ!''

میں نے آنکھیں کھولیں اور سنا کہ کون ہے۔ بابا ہی تھے۔ سنی اَن سنی کردی اور جواب نہیں دیا۔ دل میں سوچا یقیناً انھیں پھر پانی چاہیے۔

بابا نے دوبارہ کہا: ''عبداللہ بیٹا!... عبداللہ!''

مجھے غصہ آ گیا، لحاف کو پھینکا، اور تیز لہجہ میں بولا: ''اب کیا ہے؟''

بابا آدھے اُٹھ چکے تھے۔ خرخراتی اور گھٹی گھٹی آواز سے جو مشکل سے گلے سے نکل رہی تھی، بولے: ''اس تکیہ کو میرے پیچھے لگا دو۔ بیٹھنا چاہتا ہوں''۔

بہت غصہ آیا۔ دل چاہتا تھا کہ کچھ کہہ دوں۔ لیکن اپنے کو روکا اور بولا: ''آدھی رات میں آپ کو بیٹھنے کی خواہش ہو رہی ہے۔ سو جایئے''۔

بابا نے اپنے اُٹھے ہوئے سر کو دوبارہ لحاف میں چھپا لیا اور بولے: ''کچھ نہیں، کچھ نہیں بیٹا! جاؤ سو جاؤ''۔

اچانک ان کی حالت دیکھ کر میں اُداس ہو گیا۔ میں نے کہا: ''تھوڑا آگے آ جایئے تاکہ میں تکیہ پیچھے لگا دوں''۔

بابا نے سر کے اشارہ سے کہا ''نہیں'' پھر کچھ نہیں بولے۔

آنکھیں جھونپڑی کے بیچ میں لگی ٹُھنی (شہتیر) پر گاڑ دیں اور ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگے گویا آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔ میں شرمندہ ہوا اور اپنے آپ کو ملامت کرنے لگا۔ اُٹھا اور ان کے سرہانے گیا۔

ان کا رنگ چاک مٹّی کی طرح سفید ہو گیا تھا۔ آنکھیں میری طرف پھیریں اور مسکرائے۔ ساری دُنیا کی محبت ان کی آنکھوں میں سمٹ آئی تھی۔ اپنے جھریدار ہاتھوں سے میرا ہاتھ پکڑا، بالکل ٹھنڈا پالا جیسے برف کی سِلّی۔ پوچھا: ''جاؤں ماں کو بلا لاؤں؟''

کچھ نہیں بولے۔ میں اسی طرح انتظار کرتا رہا۔ دوبارہ اپنی آنکھیں اور اپنے ہونٹوں کو آہستہ سے ہلایا مگر کوئی آواز باہر نہیں نکلی۔

اچانک مجھے سردی لگنے لگی اور میں کانپنے لگا۔ ٹھنڈی ہوا نے جھونپڑی کے دروازہ پر پڑے کمبل کے پردے کو ہٹا دیا اور چراغ کی لویں پھٹ پھٹ ہلنے لگیں مگر بجھا نہیں۔ مجھے عجیب وغریب احساس ہو رہا تھا اور ڈر لگ رہا تھا۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیا ہو گیا۔ دیوانہ کی طرح جھونپڑی کا کمبل ہٹایا اور باہر کو دوڑ پڑا۔

ایک سانس میں بے تحاشہ کوڑے دان تک دوڑ گیا۔ ماں اور حلیمہ محلّہ کی طرف ہی آ رہی تھیں۔

ماں نے جب مجھے دیکھا تو ان کے ہوش اُڑ گئے بولیں: ''کیا ہے عبداللہ! کیا ہے؟ تمھیں کیا ہو گیا۔ بیٹا تمھاری رنگت کیوں ایسی ہو گئی؟''

بہت زور دیا کہ کچھ کہوں لیکن صرف اتنا ہی کہہ پایا: ''ماں... بابا... بابا...'' میرا گلا رُندھ گیا۔ ماں نے جو کچھ کوڑے دان سے جمع کیا تھا زمین پر پھینک دیا اور دونوں ہاتھوں سے سر پیٹنا شروع کیا۔ چیختے ہوئے جھونپڑی کی طرف دوڑیں۔ حلیمہ بھی پیچھے پیچھے دوڑیں۔ مجھے تو پتہ چل ہی گیا تھا کہ کیا ہو گیا ہے اس لیے اندر جانے کی جلدی نہیں کی اور اب میرے پاؤں میں طاقت بھی نہیں تھی۔

ماں اور حلیمہ کے رونے کی آواز محلّہ میں گونج رہی تھی۔ جھونپڑی میں جانے کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ وہیں زمین پر بیٹھ گیا۔ ماں اور بہن کے رونے چیخنے کی آواز سن رہا تھا، مگر پتہ نہیں کیوں میری آنکھوں سے آنسو نہیں بہ رہے تھے، یعنی میرا دل یہ ماننا نہیں چاہتا تھا کہ میرے بابا جو ابھی چند منٹ پہلے زندہ تھے مر گئے۔

میری نظر آسمان پر پڑی۔ ستارے ہمیشہ سے زیادہ تیز چمک رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے پانی میں ہیں اور آسمان کے پیڑوں بیچ کانپ رہے ہوں اور اوپر نیچے ہو رہے ہیں۔

محلّہ کی جھونپڑیوں، چالوں سے ایک ایک کر کے لوگ ہماری جھونپڑی کی طرف آ رہے تھے۔

پتہ نہیں لوگوں نے خیراللہ کو کیسے خبر دی۔ جب وہ آئے تو اُن کا چہرہ پھیکا پڑا ہوا تھا، لیکن وہ رو بھی نہیں رہے تھے۔ ملک ناز کو گل پری کے پاس بھیج دیا اور ناصر کو دور ملک کے پاس اور بولے کہ بچوں کا یہاں رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ مجھ سے بھی کہا کہ عبداللہ اُٹھو۔ اس طرح بیٹھے رو رہے ہو۔ اُٹھو دیکھیں کہ کیا کرنا ہوگا۔ آستینیں چڑھائیں اور کام میں لگ گئے۔ کوئی ہے جو مدد کرے، ڈھلوان کی طرف لے چلیں۔ نہلا دیں۔

نوروزعلی اور رحمان حمودی بھی ساتھ ہو لیے۔ ایک ڈبہ پانی ہم لوگوں کے پاس تھا اور دو ڈبے پڑوسیوں سے اُدھار لیے۔ بابا کو ایک لحاف میں لپیٹا اور لے گئے۔ صبح ہونے تک ان کو غسل دے چکے تھے۔ بھائی خیراللہ نے کہا: ''اگر جنازہ کو قبول نہیں کیا تو کیا ہوگا؟''

نوروزعلی نے کہا: ''یہ مجھ پر ہے۔ ہم لوگ بھی آدمی ہیں۔ ہم چار بڑے لوگ وہاں جائیں گے اور ان سے کہیں گے کہ ہم لوگ بھی انسان ہیں۔ یہ ہمارا جنازہ ہے۔ عبداللہ تم فکر نہ کرو۔ انشاءاللہ کام بن جائے گا''۔

صبح کو احمد آغا ایک وانٹ (گاڑی) میں پانی بیچنے کے لیے لائے تھے۔ نوروزعلی نے ان سے کہا: ''ثواب ہوگا یہ جنازہ بہشت زہرا تک پہنچا دو''۔

احمد آغا راضی نہیں تھا، بولا: ''میری وانٹ نجس ہوجائے گی۔ کربلائی نوروز! یہ پانی مسلمانوں کے لیے جاتا ہے، نجس ہوجائے، یہ ٹھیک نہیں''۔

نوروزعلی بولے: ''جنازہ طاہر ہے۔ ہم لوگ غسل دے چکے ہیں''۔

احمد آغا نے کہا: ''بہرحال مُردہ ہے۔ فرق نہیں پڑتا''۔

وہ بعد میں پانی بیچنے کے لیے اپنی وانٹ سے کودا۔

بھائی خیراللہ نے کہا: ''ہم جارہے ہیں۔ سڑک سے ایک وانٹ پکڑ کر لاتے ہیں جب تک میں نہ لوٹوں جنازہ یہیں رہے''۔

بھائی خیراللہ جب تک وانٹ لے کر آئے دس بج گئے۔ ایک وانٹ آئی تو میرے بابا کو ایک صاف لحاف میں لپیٹ کر اس میں رکھا۔ نوروزعلی اور خان محمد آگے، خیراللہ اور دور ملک پیچھے کی طرف یعنی جنازہ کے سامنے بیٹھے۔ میں نے بہت چاہا کہ لوگ مجھے بھی لے جائیں مگر نہیں لے گئے۔

بھائی خیراللہ نے کہا: ''پتہ ہے آؤ گے تو وہاں کیا ہوگا! وہاں ہم لوگوں کو ہزار زحمتوں کا سامنا ہے۔ اصلی بات تو یہ ہے کہ معلوم نہیں ہم لوگوں کو وہاں گھسنے بھی دیں گے یا نہیں اور ایسے میں تم بھی آنا چاہتے ہو۔ مُردہ دفن کرنا بھی کوئی دیکھنے کی چیز ہے! جاؤ بچوں کے پاس جاؤ کہ وہ اُداس نہ ہوں''۔

بابا کو جب لے گئے تو میں اپنی جھونپڑی کی طرف چل پڑا۔ مرد تو اِدھر اُدھر ہوگئے، مگر عورتیں کچھ باہر بیٹھی تھیں اور کچھ ماں اور حلیمہ کے ساتھ جھونپڑی میں۔ اب رونا پیٹنا بند ہوگیا تھا۔ باتیں کر رہی تھیں، کانا پھوسی چل رہی تھی۔ حتیٰ کہ ماں اور حلیمہ بھی نہیں رو رہی تھیں۔ آنسوؤں کے دھبے اُن کے چہروں پر تھے۔ ماں نے جیسے ہی مجھے دیکھا پوچھا: ''لوگ گئے؟''

میں نے کہا: ''ہاں، احمد آغا نامرد مجھے نہیں لے گئے۔ دیکھنا اب ان کے ساتھ کیا کرتا ہوں''۔ اور جھونپڑی سے باہر نکل کر مردوں میں بیٹھ گیا۔

سلیم خاں، یہ بھی چونے کے کارخانہ میں کام کرتے تھے، بولے: ''عبداللہ موت برحق ہے۔ اس طرح دل چھوٹا نہ کرو۔ جاؤ اپنا شناخت نامہ بنواؤ اور پڑھائی کرو۔ اس طرح تمھارے بابا کی رُوح زیادہ خوش ہوگی''۔

بعد میں بولے: ''ابھی اُٹھو! اُٹھو! اس طرح بیٹھ کر سوگ نہ مناؤ۔ چلو ہماری جھونپڑی میں چلو۔ تازہ دَم کی ہوئی ایک پیالی چائے پیو تا کہ دِل ٹھہرے''۔

میں نے کہا: ''نہیں چچا سلیم۔ دل نہیں کر رہا ہے''۔

پھر مسکراتے ہوئے بولے: ''ہماری چائے دیکھتے ہی دل کرے گا۔ اُٹھو، اُٹھ جوان!''

میرا ہاتھ پکڑا اور اپنی جھونپڑی کی طرف کھینچا۔ میں نے کہا: ''سلیم چچا! میں یہیں ٹھیک ہوں۔ دیکھئے کیا ہوتا ہے، دفن کرنے دیتے ہیں یا نہیں''۔

کہا: ''ٹھیک ہے، چلو وہیں ہماری جھونپڑی میں بیٹھو''۔

میں نے دیکھا کہ ضد کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ ان کے ساتھ چل پڑا۔ ناصر بھی کہیں وہیں ٹہل رہا تھا۔ ہم لوگوں کے پیچھے آنے لگا اور اس کے پیچھے ملک ناز بھی آ گئی۔ میں نے ناصر سے کہا: ''تم کہاں آ رہے ہو؟''

سلیم خاں نے کہا: ''نہیں، نہیں، آنے دو۔ آؤ، آؤ بیٹا۔ آ جا بابا کی جان''۔

سلیم خاں کی جھونپڑی میں بیٹھا رات میں جو کچھ گذرا تھا سوچ رہا تھا۔ آخری وقت میں بابا کو کتنی اذیت دی۔ دِل دِل میں کہہ رہا تھا کہ اگر سلیم خاں، خیراللہ یا ماں اور حلیمہ کو یہ پتہ چلے کہ میں نے اُنھیں آخری وقت میں رنجیدہ کیا اور ان کا دِل دُکھایا تو یقیناً وہ لوگ میرے منہ پر تھوک دیں گے۔ کہیں گے لعنت ہے تجھ پر کہ آخری وقت میں تیرا باپ تیری وجہ سے موت کی اذیت سہے اور مر جائے۔

میں نے منّت مانی کہ جب خیراللہ کے اتنا بڑا ہو جاؤں گا تو پیسہ جمع کر کے مشہد امام علی رضاؑ کے پاس جاؤں گا اور دُعا کروں گا کہ بابا میرے گناہ بخش دیں۔ پتہ نہیں کتنی دیر تک میں بیٹھا یہی سوچ رہا تھا کہ گاڑی کی آواز نزدیک آتی ہوئی سنائی دی۔ میں ہڑبڑا کر اُٹھا، بولا: ''وہ لوگ آ گئے''۔ جھونپڑی سے باہر آیا۔ فوجیوں کی جیپ تھی۔ پلاؤ لائے تھے۔ ہمیشہ ہر جمعرات کو فوجی چوکی سے ہم لوگوں کے لیے کھانا آتا تھا۔ ہم لوگ اپنے اپنے برتن لے کر پہلے سے تیار رہتے تھے۔ گاڑی کے سامنے قطار میں کھڑے ہو جاتے۔ وہ ہمارے برتن لیتے اور پلاؤ سے بھر کر ہمیں دے دیتے۔ جمعرات کو تو ہم لوگوں کی عید ہوتی تھی۔

فوجیوں کی پلاؤ کی خوشبو ناک میں پہنچی تو مجھے بھوک لگنے لگی۔ اگر میرا باپ نہ مرا ہوتا تو میں، ناصر اور ملک ناز بھی پیالہ لے کر قطار میں ہوتے۔ لیکن اُس وقت ممکن نہیں تھا کیونکہ ابھی تو بابا مرے تھے اور یہ بھی پتہ نہیں کہ جنازہ پڑھا گیا کہ گذری۔ میں کیسے اس لعنتی پیٹ کی فکر میں پڑ جاؤں۔ ناصر آ کر میری بغل میں کھڑا ہو گیا، بولا: ''عبداللہ جاؤں برتن لاؤں۔ پلاؤ جا کر لے لوں؟''

میں نے کہا: ''پلاؤ کس لیے؟ پیٹو!''

ایک دن اس لعنتی پیٹ کو روک نہیں سکتا۔ دیکھ نہیں رہے ہو کہ بابا مر گئے۔ سب لوگ رو رہے ہیں''۔

ناصر بولا: ''اب رونا بند ہو گیا''۔

سلیم خاں اُن کی باتیں سن رہا تھا، اندر سے بولا: ''کیوں نہیں جائے گا اللہ بخشے وہ تو مر گئے، کیا تم سب ایک ایک کر کے بھوک سے مر جاؤ گے۔ آؤ ناصر، بابا کی جان! یہ لو برتن اپنے لیے اور ملک ناز کے لیے پلاؤ لاؤ اور اسی جگہ بیٹھ کر کھالو''۔

مجھے غصّہ آ گیا۔ اگر بھائی خیراللہ ہوتے تو اچھی طرح ناصر کو سبق سکھاتے۔ مگر میں سلیم خاں کے سامنے نہیں آ سکتا تھا۔ وہ سوچ رہے تھے کہ میں خود چونکہ نہیں کھا پا رہا ہوں تو غصّہ ہوں۔

ناصر اور ملک ناز بیٹھے ایسے جلدی جلدی کھا رہے تھے جیسے کوئی قحط زدہ پلاؤ کھائے۔ اتنے میں خیراللہ کی گاڑی آ گئی۔ میں دوڑ کر وانٹ کے پاس گیا۔ خیراللہ اتنے غصّہ میں تھے کہ لال ہو رہے تھے۔ لوگ وانٹ کے چاروں طرف جمع ہو گئے۔ میرے بابا کا جنازہ واپس کر دیا گیا تھا۔

سلیم خاں نے کہا: ''دفن کیوں نہیں کیا؟... ارے... انھیں لائے کیوں؟''

نوروز علی نے کہا: ''کچھ نہیں، کہتے ہیں کہ شناخت نامہ لاؤ۔ شناخت نامہ نہیں ہے تو جنازہ دفن نہیں ہوگا''۔

سلیم خاں بگڑتے ہوئے بولا: ''اب اس آپا دھاپی میں شناخت نامہ کہاں سے لاؤں؟ تم لوگ کس مصرف کے ہو، گئے کیا تھے؟ ان سے کہا نہیں کہ ہم شناخت نامہ کہاں سے لائیں؟

بھائی خیراللہ کھسیائے ہوئے تھے۔ آواز کانپ رہی تھی: ''بابا ہم لوگوں نے کہا۔ ایک بار نہیں ہزار بار کہا۔ ہاتھ جوڑے، منت کی۔ ان کا ایک ہی جواب تھا۔ نہیں ہوسکتا، بس نہیں ہوسکتا! کہتے ہیں کہ قانونی پیچیدگی ہے۔ غرض کسی طرح نہیں مانے۔ آخر ہم لوگ شناخت نامہ یا مرنے کا سرٹیفکیٹ لینے کے لیے چل پڑے۔ چچا سلیم، آپ دیکھ رہے ہیں ہم لوگ کیسی مصیبت میں گرفتار ہیں''۔

سلیم خاں بولا: ''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مُردے کو شناخت نامہ کی کیا ضرورت؟ مُردہ تو پھر مُردہ، یہ باتیں دماغ میں نہیں سماتیں''۔

میں نے بھی کتنا ہی سوچا مگر سلیم خاں کی طرح میری عقل بھی کام نہیں کر رہی تھی کہ مردہ کے شناخت نامہ سے انھیں کیا فائدہ؟ شناخت نامہ تو قبر میں مُردے کے ساتھ نہیں گاڑا جائے گا۔

آخر سلیم خاں بولے: ''اس طرح تو ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھا نہیں جا سکتا۔ تھوڑی دیر میں جنازے سے بُو آنے لگے گی۔ خراب ہونے لگے گا۔ چلو سوار ہوتے ہیں۔ چلو رجسٹریشن آفس چلیں، دیکھیں کیا بن پڑتا ہے''۔

جنازہ کو سلیم خاں کی جھونپڑی میں رکھا اور لوگ وانٹ پر سوار ہوگئے۔ میں نے بھی خیراللہ سے پوچھا کہ چلوں؟''

''کس لیے آؤ گے؟''

''اسی طرح، چاہتا ہوں کہ میں بھی رہوں۔ اپنا شناخت نامہ بھی لے لوں''۔

خیراللہ جھنجھلائے، منہ پھیر لیا اور بدبداتے ہوئے وانٹ کی طرف چل دیئے۔

میں ان کے پیچھے پیچھے دوڑتا رہا اور بولا: ''خیراللہ میں چلوں؟''

بولے: ''آؤ چلو، دیکھ لو کہ کیا احوال ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ وہاں حلوا خیرات میں بٹ رہا ہے؟ میں اور خیراللہ وانٹ میں پیچھے بیٹھے۔ سلیم خاں اور نوروز علی بھی آگے کی طرف بیٹھے۔ وانٹ نے ایک چکر کاٹا، ہوا میں دھول اُڑائی اور چل دی۔

دوبارہ پھر وہی میں تھا اور خیراللہ تھے اور وہی پرانا آفس۔ نوروز علی اور سلیم خاں آگے آگے، میں اور خیراللہ ان کے پیچھے پیچھے سیڑھیوں پر چڑھ رہے تھے۔

اس مرتبہ ہم لوگ دو شناخت نامے لینے جا رہے تھے۔ ایک اپنے باپ کے لیے جو کل رات گذر گیا تھا اور دوسرا اپنے لیے جو ابھی زندہ تھا۔

OO

دو کچے خربے

میرے بابا نے کہا: ''مجبور ہوں۔ اب مجھ سے کچھ بن نہیں پڑ رہا ہے، کیا کروں؟ ابھی تم ان باتوں کو سمجھو، قبل از وقت ہے، لیکن بڑے ہونے پر تم ضرور سمجھو گے۔ اس وقت اس طرح سے نہیں دیکھو گے اور نہ صرف سوال کرتے رہو گے''۔

میں اگرچہ تیرہ سال کا تھا، پر حقیقت سمجھتا تھا، نہ مجھے غم تھا اور نہ میں انھیں اس طرح دیکھ رہا تھا جیسا کہ بابا مجھے سمجھ رہے تھے۔

بابا پھر بولے: ''ایک دن شاید تم بھی مجبور ہو کر اپنے بچّے کے ساتھ بھی یہی کرو گے''۔

اس کے بعد زور سے بولے: ''پانی لاؤ، اب گرم ہو گیا ہوگا''۔

میری ماں ایک بڑا سا دیگ جس سے بھاپ نکل رہی تھی لائیں اور جھونپڑے کے سامنے رکھ دیا اور وہیں بغل میں بیٹھ گئیں۔

''جلدی کپڑا اُتارو''۔ جب میں نے کُرتے سے سر باہر نکالا تو میری نظر ماں پر پڑی جو بڑے سے دیگ کے پاس وہیں بیٹھی ہوئی تھیں، مجھے ایسے تک رہی تھیں جیسے مُردہ آنکھ، اور دوسرے بھائی بہن جو ابھی ابھی سو کر اُٹھے تھے ایک ایک کر کے آئے اور اس کے چاروں طرف گھیر کر بیٹھ گئے۔

''کیوں اس طرح بیٹھی ہو، اُٹھو، بیری کا پتّا لاؤ''۔ اس کے بعد میرے بابا نے مجھ کو (جیسے بھیڑ کے بچہ کا بال اُتارتے ہیں) دیگ کے پاس کھینچا اور ایک پیالہ گرم گرم پانی میرے سر پر اُنڈیل دیا اور میں چیخ پڑا۔ گویا ایک پیالہ آگ میرے سر پر ڈال دی گئی ہو۔ بابا کا ہاتھ ہل گیا اور میں وہاں سے سرک گیا۔

میری ماں ایک مٹھی بیری کی پتّیاں لے آئیں اور جھونپڑے کے سامنے کھڑی مجھے تک رہی تھیں۔ میں نے کہا: ''میں جل گیا، بہت گرم ہے!''

بابا نے کہا: ''ٹھیک ہے، گرم ہی چاہیے۔ کیا ہے؟ تم اسی طرح ایران شہر جانا چاہتے ہو؟''

ماں نے اشارہ سے کہا: ''ٹھنڈا پانی، ٹھنڈا پانی''۔

میں ان کا مطلب سمجھ گیا۔ وہ کہنا چاہتی تھیں کہ اس میں تھوڑا ٹھنڈا پانی ملا دو۔

بابا نے کہا: ''ٹھنڈا پانی کس لیے؟ اس بچّے کے بدن میں ہزار طرح کے جراثیم چپکے ہوئے ہیں۔ گرم پانی سے بیماریاں ختم ہو جاتی ہیں۔ کھال کے نیچے خون دوڑ جاتا ہے، اور تھوڑا رنگ رُوپ نکھر جاتا ہے''۔

ماں نے بابا کا جواب نہیں دیا۔ خود ہی گئیں اور ایک برتن ٹھنڈا پانی لا کر دیگ میں ڈال دیا۔ بابا نے مجھے غصّہ سے دیکھا اور کہا: ''اب تو آ!''

پھر اُنھوں نے میرا دونوں ہاتھ ایک ساتھ پکڑ لیا اور تین بار میرے بدن کو بیر کی پسی ہوئی پتّی سے دھویا اور اپنی لنگی سے میرے بدن کو خشک کیا۔ ماں جھونپڑے میں گئیں اور وہ سفید کرتا پاجامہ لائیں جسے یا تو عید کے دن یا شہر جاتے وقت میں پہنتا تھا، اور میرے بابا اپنے متفرق سامانوں میں سے ایک ہندوستانی عطر کی شیشی لائے۔ یہ عطر کی شیشی چاہ بہار سے ان کا ایک دوست لایا تھا۔ مجھے عطر لگایا، میری ماں نے میرے بالوں کو سلجھایا، اور ہاتھوں کے اشارے سے کہا کہ اب تو دولہا لگ رہا ہے اور اس وقت دھیرے سے اپنے ہونٹوں کو میری پیشانی پر رکھا اور چوم لیا۔ اگرچہ میرا چہرہ

اس وقت شرم سے تمتما رہا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو دُنیا کا سب سے خوش قسمت لڑکا سمجھا۔ میرا دِل بہت خوش تھا اور ہمارے دوسرے چھوٹے بھائی بہن جو وہیں کھڑے تھے میری اس خوش قسمتی پر انھیں رشک آ رہا تھا۔ میں ہنس پڑا۔

بابا نے کہا: ''بہت خوب! اب اُن جوتوں کو لاؤ''۔ میری ماں وہ چپل لائیں جسے ساواس کہتے تھے اور وہ چھال اور پتوں کی بنی تھی اور انھوں نے خود میرے لیے اُسے بُنا تھا۔ میرے پاؤں میں پہنایا۔ میں نے کہا: ''ساواس کس لیے؟''

بابا نے کہا: ''پہنو تا کہ لوگ یہ نہ کہیں کہ بھوکا اور فقیر ہے''۔

میں نے کہا: ''مجھے ساواس نہیں چاہیے، میں اسی طرح ٹھیک ہوں''۔

انھوں نے کہا: ''پہنو! زیادہ نہ بولو! یہاں سے سڑک تک تین فرسخ راستہ ہے۔ تمھارا پیر آبلہ آبلہ ہو جائے گا۔ بیٹھو اور پہنو!''

میں نے کہا: ''مجھے ساواس پہن کر چلتے نہیں بنتا۔ اُونچے نیچے گڈھے وغیرہ میں میرا پیر پڑ جائے گا تو میرے پاؤں میں موچ آ جائے گی اور میں گر جاؤں گا''۔

بابا نے کہا: ''اس عورت نے صرف تیری خاطر ایک ہفتہ بیٹھ کر ان چپلوں کو بُنا ہے۔ بیٹھو اور پہنو!''

میری ماں میرے سامنے بیٹھ گئیں۔ میرے ایک پیر کو اپنے زانو پر رکھا۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ جوتے ہمیشہ ہی بھاری ہوتے ہیں اور پیر کو کچھ زیادہ ہی زخمی کر دیتے ہیں۔ میں نے اپنا پیر تیزی سے کھینچ لیا لیکن میری ماں نے اپنا سر اُٹھایا اور کچھ اس طرح مجھے دیکھا کہ میرا دِل اُن آنکھوں کو دیکھ کر سہم گیا اور مجبور ہوا کہ ساواس کو پہنوں۔ انھوں نے اس کا بند اچھی طرح سے باندھ دیا۔

اب بابا کا ذہن ساواس کی طرف سے مطمئن ہو گیا اور گہری سانس لی، ساتھ ہی بولے: ''اس کو ایک پیالہ پانی بھی پلا دو۔ موسم گرم ہے، ایران شہر تک پہنچتے پہنچتے شہید ہو جائے گا''۔

میری ماں اُٹھیں اور دوڑ کر مَشک لائیں۔ میں پچھلی رات سے پیاسا تھا۔ میں نے دل بھر کر پانی پیا۔ میری ماں مجھے اس طرح دیکھ رہی تھیں جیسے کبھی مجھے پانی پیتے نہ دیکھا ہو۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مردہ کی طرح میرے پانی پینے کو تکے جا رہی تھیں۔

جھونپڑے سے جب ہم لوگ باہر چل پڑے تو موسم بہت کھلا ہوا اور روشن تھا۔ بھائی بہن وہیں کھڑے دُور دُور تک مجھے تک رہے تھے یہاں تک کہ جان بی بی صبح سویرے اپنے جھونپڑے سے باہر نکل آئیں اور میری ماں کی بغل میں جھونپڑے کی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی رہیں۔ میں اپنی چھوٹی بہن 'ماہ پیشانی' کو عزیز رکھتا تھا، ماں کی گود میں میرے لیے تیز تیز ہاتھ ہلا رہی تھی۔

عبدالستار کے جھونپڑے کے سامنے بستی کے بے کار لوگ جیسے نبی بخش، سہراب اور اسی طرح کے لوگ ریت پر بیٹھے ہوئے ہم لوگوں کو دیکھ رہے تھے۔

نبی بخش نے کہا: ''کہاں؟ انشاءاللہ خدا رحم کرے؟''

بابا کو بات کرنے کا حوصلہ نہیں تھا، بولے: ''شہر...'' اور بقیہ باتیں تو وہ گھونٹ گئے۔ میں مڑا تا کہ ایک بار گھر کو دیکھ لوں۔ اپنی ماں کو میں نے سریک (بلوچی چادر) کی وجہ سے پہچان لیا۔ وہ وہیں ریت پر بیٹھی تھیں اور ماہ پیشانی ابھی تک ہاتھ ہلا رہی تھی اور میرے بھائی اور بہن حیرت میں تھے، گویا اُن کی جان سوکھ گئی تھی اور جب میں نے اپنا ہاتھ اُوپر اُٹھایا تو سبھی تیز تیز ہاتھ ہلانے لگے۔ شاید وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ میں آج بھی ان کے ساتھ یوں ہی کھیل رہا ہوں۔

میرے بابا اس کے بعد کچھ بولے ہی نہیں۔ یہاں تک کہ ہم لوگ صحرا کے بیچوں بیچ پہنچ گئے۔ سورج دھیرے دھیرے بلند ہو رہا تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا چاہِ بہار کی طرف سے چلنا شروع ہوئی اور فضا میں کچھ خنکی آ گئی۔ بابا نے کہا: ''نم بی (وہ ہوا جو جنوب کی طرف سے چلے اور مرطوب ہو) چل رہی ہے۔ خدا کرے کہ بارش ہو جائے...

انھوں نے آسمان کی طرف دیکھا جہاں نہ ایک ٹکڑا بادل تھا اور نہ ایک قطرہ بارش۔ صحرا پرسکون تھا اور نم بی اپنے ساتھ ہمارے جھونپڑوں سے غمزدہ عورتوں کی زہیروک گیت (وہ گیت جو غم انگیز اور فراق و ہجر کے موقع پر گایا جائے) سنا رہی تھی۔

"بھائی یہ سال تو قحط کا ہے۔ میرا اور تمھارا وطن تو فقیر اور نادار ہے۔ دوست! کیا کسی نے خرمے کے جوان پیڑ گرتے دیکھے ہیں۔ اس وقت بارش، پتھر پر دوب اُگانا ہے..."

اور میں بستی کے بچوں کو دیکھ رہا تھا جو صحرا کے اُس طرف کٹیلی جھاڑیاں جمع کر رہے تھے اور مراد ہمیشہ کی طرح قہوئی رنگ کا کپڑا پہنے کبھی جھکتا اور کبھی کھڑا ہوتا تھا، میں نے اسے دُور سے پہچانا اور پکارا: "اے مراد! اے ..مراد!"

مراد سیدھا ہوا، اس نے مجھے دیکھا اور ہاتھ ہلانے لگا۔ بابا نے مجھ سے کہا: "اے بچہ! کیا کر رہا ہے؟" پھر انھوں نے نصیحت کرنا شروع کر دی۔

"اے لڑکے دھیان سے۔ پاجامہ کانٹے اور جھاڑیوں میں نہ اُلجھے، پھٹ پھٹا جائے گا۔ دھیرے دھیرے چلو، پسینہ نہ نکلے نہیں تو بدن سے بدبو آ جائے گی۔ آؤ! میرے سایے میں چلو۔ کیونکہ دھوپ اس ہندوستانی عطر کی خوشبو کو اُڑا دے گی..."

میرا ذہن اُن کُنار، گز اور بلوچستان میں اُگنے والی جھاڑیوں کی طرف تھا جو صحرا میں ہری بھری تھیں۔ میں نے سوچا اگر بستی کے بچوں کے ذہن میں آئے اور وہ اس طرف آ جائیں تو انھیں کتنی بن بیری اور کُنار چننے کو مل جائے۔ میں نے بابا سے کہا: "اگر اس دفعہ کُنار کے پتے چنتے ہوئے تو میں صحرا میں اسی جگہ آؤں گا۔ ذرا اس طرف کُنار کے درختوں کو دیکھئے"۔

میرے بابا نے کُنار کے درختوں پر نظر ڈالی۔ تیز قدم بڑھاتے ہوئے بولے: "سورج سر پر آ گیا ہے۔ قدم بڑھاؤ"۔

○

جب تک کہوری والی سڑک (کہور ایک درخت کا نام ہے) پر پہنچیں گے دھوپ چاروں طرف پھیل چکی ہوگی۔ ساواس چپل نے میرے پیر کو بے کار کر دیا تھا۔ وہ کاٹے جا رہی تھی اور میرے ٹخنے درد کر رہے تھے۔ اگر بابا نہ ہوتے تو میں اسے کب کا صحرا میں پھینک چکا ہوتا۔ بہت دیر تک سرِ راہ کھڑے تھے لیکن کوئی گاڑی نہیں آئی۔ ایک بلوچی بوڑھا اور دو جوان بھی ہم لوگوں کی طرح سواری کے منتظر تھے۔ بوڑھا آدمی سڑک کے کنارے دھوپ میں اُکڑوں بیٹھ گیا اور ایک گھنٹہ تک وہ پکی سڑک کو تکتا رہا۔

میں نے کہا: "چلئے پیدل چلیں۔ اس طرح تو ہم لوگ رات تک یہیں کھڑے رہیں گے اور گاڑی نہیں آئے گی"۔

بابا نے کہا: "کہاں چلیں؟ تم سوچ رہے ہو کہ ایران شہر جان بی بی کا جھونپڑا ہے کہ دوڑے گھوڑے اور واپس آ گئے؟ دس بارہ فرسخ راستہ ہے"۔

میں نے کہا: "پھر ہم لوگ بستی کو واپس لوٹ جائیں..."

بابا نے ایسی قہر آلود نگاہوں سے مجھے دیکھا کہ آدھا جملہ میرے منہ میں ہی رہ گیا۔

ایک بوڑھا آدمی اُٹھا اور بولا: "آ گئی...شاید آ گئی...!"

سڑک پر ایک سرخ رنگ کی گاڑی دھوپ میں چمکتی ہوئی تیر کی طرح ہم لوگوں کی طرف آ رہی تھی۔ جیسے ہی ہم لوگوں کے پاس پہنچی دھیری ہوگئی اور پھر رُک گئی۔ وانٹ (ٹرالی والی ٹیمپو) تھی اور پیچھے اس پر عورت، مرد، بچے سبھی بلوچی بھرے ہوئے تھے۔ بابا نے پہلے میرا ہاتھ پکڑا اور اس میں پھینکا۔ اس کے بعد پھر خود کود کر چڑھ گئے۔

ٹیمپو میں بھی بابا چپ نہ رہے۔ لگاتار بولتے جا رہے تھے کہ جب ہم لوگ وہاں پہنچیں گے تو تم ایسا کرنا، ویسا کرنا، فالتو ہنسنا نہیں، اِدھر اُدھر نہ جانا، آنکھیں مت پھاڑنا، زمیندار کو بھیڑیے کی طرح گھور گھور کر نہ دیکھنا۔ مظلوم کی طرح رہنا؛ ایک معصوم میمنہ کی طرح، مگر دیکھو ہوشیار رہنا، گردن اس طرح ٹیڑھی نہ کر لینا کہ وہ لوگ یہ سمجھیں کہ

اس سے دُنیا کا کوئی کام نہیں ہوسکتا۔ مینڈھے کی طرح خریدار کو تکنا، ہرن کے بچہ کی طرح نہیں"۔

○

میں نے تمام عمر ایران شہر کے اس بازار کو نہیں دیکھا تھا، لیکن میرے بابا نے دیکھا تھا۔ وہ کئی بار اس جگہ آ چکے تھے۔ ایک بار تو چھوٹے موٹے متفرق سامان چٹائی، تھیلا، سگریٹ پائپ، چرس پینے والے پائپ وغیرہ بیچنے کے لیے آئے تھے۔ سگریٹ کے پائپ اور چرس کے پائپ کو بابا اور ماں نے کہور کی لکڑی سے بنایا تھا۔

دوسری بار وہ اس پہاڑی بکری کے بچے کو بیچنے کے لیے آئے تھے جس کی سینگ میں تین پیچ تھا اور نوک آگے کو جھکی ہوئی تھیں۔

جب ہم لوگ بازار میں پہنچے تو دوپہر ہوچکی تھی اور میں پسینہ پسینہ تھا۔ عطر کی خوشبو بھی کم ہوگئی تھی، میرے پاجامہ کی مہری بھی مٹی سے اَٹ گئی تھی اور میں چاہتا تھا کہ یہ باتیں بابا سے بتادوں کہ اسی وقت انھوں نے کہا: "مضبوطی سے مجھے پکڑ لو، گم نہ ہوجانا!"

میں جب بازار پہنچا تو پہلے یہ سمجھا ہی نہیں کہ بازار یہی ہے۔ میں نے دیکھا پیچ در پیچ گلیوں میں ہم لوگ ہیں جن میں سے کچھ گلیاں تو بے حد تنگ ہیں اور کچھ کشادہ ہیں۔ آدمی سب گلیوں میں بھرے ہوئے تھے۔ ہر شخص کچھ نہ کچھ سامان لایا تھا اور بیچ رہا تھا اور سبھی چیخ چیخ کر آوازیں لگا رہے تھے اور اپنے سامان بیچ رہے تھے۔

کوچوں میں تِل رکھنے کی بھی جگہ نہیں تھی۔ اگر کوئی چاہتا کہ ایک کونہ میں کھڑا ہوجائے تو نہیں ہوسکتا تھا۔ مجمع خود ہی اُن کو دھکا دے رہا تھا۔ میں ڈر گیا کہ اگر بابا کا ہاتھ چھوٹ گیا تو میں اس بھیڑ میں گم ہوجاؤں گا اور کوئی دوسرا اپنے بچہ کے بجائے مجھی

کو بیچ دے گا اور بابا غصہ بھی ہوں گے اور خالی ہاتھ گھر لوٹیں گے۔

ایسا لگتا تھا کہ اُن لوگوں نے اوّل وقت صبح سے ہی اپنے لیے جگہ لے لی ہے اور ہم لوگ معطّل پھر رہے تھے کہ کون سا گوشہ ملے کہ جہاں کھڑے ہوسکیں۔

میں بولا: "اتنی بھیڑ میں خریدار کہاں سے ملے گا"۔

انھوں نے کہا: "آگے آؤ۔ ابھی پہنچتے ہیں"۔

اس گلی میں جہاں زیادہ تر غیر ملکی سامان بکتے تھے ہم لوگ وہاں پہنچے اور ایک کشادہ گلی میں بھیڑ قدرے کم تھی۔ اس کی دیواریں لپی پتی تھیں مگر گلی بہت گندی تھی اور گوبر کی مہک آ رہی تھی۔ جگہ جگہ گھوڑے، بیل، بھیڑ بکری اور دیگر جانوروں کی لید اور ان کے بال وغیرہ پڑے ہوئے تھے جسے لوگوں نے اپنے پیر سے کچل ڈالا تھا اور اسی پر سے گذر رہے تھے۔ گلی کی زمین دلدلی ہوگئی تھی۔

میرے بابا نے ایک بلوچی آدمی کو، جس نے اپنی دو سرکش بھیڑیں بجلی کے کھمبے سے باندھ رکھی تھیں، سلام علیکم کہا اور وہ بلوچ بولا: "آخر اسے لے ہی آئے"۔

میرے بابا نے سر ہلا دیا۔ بلوچ نے میری طرف نظر ڈالی اور کہا: "ماشاء اللہ تم پہلوان ہو!"

بابا نے کہا: "میرا خیال ہے تیرہ کا ہوگا"۔

بلوچ نے کہا: "کارواں سرا کی طرف جاؤ۔ خریدار آیا ہے۔ میں اُسے تمھاری طرف بھیجتا ہوں"۔

تھوڑی ہی دُور چلے تھے کہ بابا نے کہا: "تمھیں یاد ہے نا! میں نے تم سے کیا کہا تھا؟ خریدار کو آنکھ پھاڑ کر نہ دیکھنا۔ میٹھی میٹھی بات کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ جب میں اشارہ کروں تب بولنا۔ یہ بھی نہ ہو کہ منہ بند۔ دیکھتے رہنا کہ میں کیا کر رہا ہوں"۔

میری نظر ایک دُبلے، کمزور بکری کے بچہ پر تھی جس کا پگہا (رسّی) ایک بوڑھے کمرخمیدہ شخص کے ہاتھ میں تھا۔ اس کی آنکھوں میں میں نے بغور دیکھا۔ میں نے دیکھا، اس کی آنکھیں اُس طرح کی نہیں تھیں جیسی بابا کہہ رہے تھے۔

ہماری بکری اسی کے ہاتھ بیچی تھی اور اب یہ چاہتا ہے کہ مجھ بد بخت گھوڑے پر تلوار چلائے۔

میرے بابا نے زمین پر تھوکا اور میں نے ایک آدمی کو دیکھا جس نے اہلِ فارس کی طرح کُرتا اور شلوار پہن رکھی تھی اور کمر میں ایک مضبوط سی بیلٹ باندھے ہوئے تھا۔ وہ ایک قہوئی سفید پیشانی والے گھوڑے کے دانتوں کو دیکھ رہا تھا۔

میں نے پوچھا: ''کیا وہ گھوڑا خریدنا چاہتا ہے؟''

بابا نے کہا: ''میں تم سے کہنا بھول گیا کہ تم اپنے دانتوں کو نمک سے صاف کر لیتے، کھولو دیکھوں...''

میں سوچنے لگا دانت کس لیے؟ میں نے منہ کھولا۔ بابا نے میرے دانتوں کو اوپر نیچے خوب اچھی طرح دیکھا اور کئی بار نفی میں سر ہلایا اور بولے: ''دیکھو نا کتنا پیلا ہے، کئی میں تو کیڑے بھی لگ گئے۔ جمیلہ نے نمک سے کیوں نہیں دھلوایا''۔

میں نے پوچھا: ''دانتوں کو کس لیے؟''

○

پہلا خریدار جو آیا اپنے ہاتھوں سے میری ٹھُڈی پکڑی، میرا سر اُوپر اُٹھایا، میری صورت کو دیکھا۔ اُس کا چہرہ بھرا بھرا تھا۔ موٹے موٹے ہونٹ اور آنکھیں ڈراؤنی۔ میں نے جلدی سے اپنی نظریں جھکالیں۔ وہ بولا: ''منہ کھولو!''

میں پھر سوچنے لگا! منہ کیوں؟ کہ اتنے میں اپنی انگلیوں سے میرے منہ کو دبا کر کھول لیا۔

''اُف اُف... اُف اُف۔ یہ تو سب کیڑا کھا گیا ہے''۔ اور اس نے میری ٹھُڈی چھوڑ دی، اور میرے منہ کو بابا کی طرف موڑ دیا۔

''کیا ہے؟ مالک صرف ایک دانہ کالا ہے، باقی تو سبھی سالم ہیں۔ اکتیس پورے کے پورے''۔

''نہیں ہم شہری! دانت ٹھیک نہیں ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ دانت موتی کی طرح چمکدار ہوں۔ ان دانتوں کو میں نے دیکھا۔ ان میں جان نہیں ہے۔ یہ دو دن میں ہی ٹپک پڑیں گے''۔

آدمی آگے بڑھ گیا۔ میں نے جرأت کی۔ سر اُوپر اُٹھایا اور اسے جاتا ہوا دیکھنے لگا۔

''یہ کہیے کہ خریدنا نہیں ہے، ورنہ اتنے صحیح سلامت دانت...''

مرد نے بابا کی باتیں نہیں سنیں اور پھر کارواں سرا کی طرف جاتے ہوئے اُس نے ایک دوسرے بچہ کی ٹھُڈی پکڑی اور اس کے دانتوں کو دیکھنے لگا۔

میں بولا: ''جیسے دانت وہ چاہ رہا ہے اسے کہیں بھی نہیں ملے گا''۔

میں نے پیچھے سے جھک کر اس بچہ کو دیکھنا چاہا جس کے دانتوں کو وہ دیکھ رہا تھا، چونکہ آدمی موٹا تھا اس لیے میں بچہ کو نہیں دیکھ پا رہا تھا۔ میں ذرا آگے بڑھ کر اسے دیکھنا چاہتا تھا کہ بابا بولے: ''آگے پیچھے کیا ہو رہے ہو۔ ایک جگہ کھڑے رہو''۔

میں کھڑا ہو گیا اور اس مرد کو یقینی طور پر دوبارہ کالے اور کرم خوردہ دانت دیکھنے کو ملے۔ آگے بڑھا اور چلا گیا۔ تب میں دیکھ سکا کہ وہ بچہ ایک لڑکی تھی، جس کے دانتوں کو وہ مرد دیکھ رہا تھا۔

وہ اپنی ٹھُڈی مَل رہی تھی اور اس کا چہرہ سہما ہوا تھا۔ وہ پتھر پر اس بوڑھے آدمی کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی جو اسے لایا تھا، معلوم نہیں وہ اس کا باپ تھا یا دادا۔

میرے بابا نے کہا: ''تو اِدھر اُدھر مت کر، دیکھ وہ مظلوم کی طرح بیٹھی ہے۔ اس طرح اس کے پاس خریدار زیادہ آئیں گے''۔

لڑکی اسی وقت ہم لوگوں کی طرف مڑی اور اس کی نظر سے میری نظر ٹکرائی، مگر فوراً شرما کر سر جھکالیا۔ اس کی آنکھیں بھی حقیقتاً مینڈھے کی طرح تھیں۔ جیسا کہ بابا کے قول کے مطابق ہونی چاہیے تھیں۔ اس کی نگاہیں شرمیلی تھیں اور وہ انسانوں سے کترا رہی تھی۔

میں نے بابا سے کہا: ''اس کی آنکھیں بھی تو مینڈھے کی طرح نہیں ہیں، ہرن کی طرح ہے، اسی وجہ سے خریدار ادھر جارہے ہیں''۔

میرے بابا نے گھور کر مجھے دیکھا اور کہا: ''چپ رہو خریدار آرہا ہے''۔

وہ مرد جو دھیرے دھیرے ہم لوگوں کی طرف آرہا تھا اپنے حلیہ سے ظالم قجر یوں (قاچاریوں) کی طرح دِکھائی دے رہا تھا۔ میں نے دیکھا اور فوراً بابا کی بات یاد آتے ہی نظریں نیچی کرلیں۔ میں اس وقت نیچی نگاہوں سے اس لڑکی کو دیکھ رہا تھا جس کا سر، ابھی بھی جھکا ہوا تھا۔ ڈھیلا پیراہن بنفشئ رنگ کا تھا اور اس کے مقنع پر بڑے بڑے سبز پھول تھے۔

اس قجر مرد کی آواز بہت کرخت تھی۔ میرا دل نہیں چاہا کہ ایسا مالک مجھے لے جائے جس کی آواز اتنی کرخت ہو۔ اس کے جوتے عربی صندل کے تھے اور اس کی شلوار پیلی اور سفید پگڑی بندھا ہوا تھا اور اس کی آستین کچھ چھوٹی تھی، اس کے بازو موٹے اور روئیں سے بھرے تھے۔

''کھڑا ہو، تجھے دیکھوں!''

اور میرے بابا نے جلدی سے کہا: ''سہراب کھڑے ہو''۔

قجر نے پوچھا: ''اس کا نام سہراب ہے؟''

''ہاں؛ مگر آپ جس نام سے اسے پکاریں مانوس ہوجائے گا۔ آپ جو چاہیں نام رکھ لیں''۔

''تمھارا اپنا بیٹا ہے؟'' بابا نے سر جھکالیا اور منتظر رہا۔

''بھئی میں نے کہا اٹھارہ ہزار!''

''اٹھارہ ہزار کیسے؟ ابھی دو مہینہ پہلے اپنے چچا کے بیٹے کو بیس ہزار میں بیچا ہے، دس سال سے زیادہ اس کی عمر نہیں تھی۔ آدھی جان کا کمزور سا تھا۔ اس میں کیا عیب ہے؟''

مرد نے میرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لیا، دیکھا اور کہا: ''نہیں، وہی جو میں بولا... گن دوں؟''

میرے بابا تندی سے بیٹھ گئے۔ سر کو جھٹکا دیا اور بولے: ''نہیں دوں گا مالک، آپ کو خریدنا نہیں ہے!''

قجر آگے چل پڑا اس بوڑھے آدمی اور لڑکی کے پاس۔

لڑکی سمٹ گئی۔ قجر کھڑا اس بوڑھے سے باتیں کرنے لگا اور وہ لڑکی کی قیمت کے بارے میں مول بھاؤ کرنے لگا۔ مگر جلدی ہی آگے بڑھ گیا۔

میں نے کہا: ''آیا تھا یوں ہی جگہ جگہ مول بھاؤ کرے اور چلا جائے''۔

لڑکی نے اپنے سر کو اُٹھایا اور میں نے اس کی آنکھوں کو دوبارہ دیکھا پھر مجھے اطمینان ہوگیا کہ اس کی آنکھیں بالکل ویسی ہی تھیں جیسی کہ میں نے سوچی تھیں۔

اس نے دوبارہ اپنی آنکھیں جھکالیں اور پھر اوپر دیکھا۔ میرا جی چاہا کہ میں اس پر عاشق ہوجاؤں، اگر میں عاشق ہوجاتا تو میں اپنی ماں کی عقیق کی چاندی کی انگوٹھی چپکے سے اُٹھا لاتا اور اس کو دے دیتا۔ میرا دِل چاہتا تھا کہ جان بی بی کی چھپّر کے بجائے ہماری چھپّر کے بغل میں اسی کی ہوتی اور میں ہر رات جب روٹی پکتی تو اسے لے جاکر دیتا۔ عشق یوں ہی پروان چڑھتا رہتا اور ہم ساتھ میں جو کی روٹی کھاتے رہتے۔

''اس گرمی میں تجھے نیند آگئی؟ کھڑا ہو۔ اس طرف سایے میں چل''۔

میں کھڑا ہوا۔ بابا اُدھر گئے اور ایسا لگا جیسے انھوں نے دُنیا میری جھولی میں ڈال دی۔ میں نے دیکھا کہ بوڑھے آدمی اور اس کی بیٹی کے مقابل میں ہی سایہ سب سے زیادہ تھا۔ میں نے کہا: ''چلئے سایہ اُدھر ہی زیادہ ہے''۔ اور میں نے دل میں خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔

اب ہم لڑکی کے بالکل سامنے تھے۔ بوڑھے آدمی نے اپنا انگوچھا زمین پر بچھایا اور جو کی روٹی اور خرمہ کھانے لگا۔ میں نے پھر ایک بار سوچا کہ اگر اُن کی چھپّر ہمارے بغل میں ہوتی...

یکا یک میں نے دیکھا کہ پہلے اس بوڑھے آدمی نے میری طرف اشارہ کیا اور پھر لڑکی نے مجھے دیکھا۔ فوراً اُٹھی اور ہماری طرف دوڑتی ہوئی آئی۔ اس کے ہاتھ میں دو عدد خرمہ تھا جسے اس نے میری طرف بڑھا دیا۔ لیکن میں حیرت زدہ تھا اور میرے ہاتھ گویا سوئے ہوئے انسان کی طرح بے جان تھے۔

''اُس سے لے لو...''

بابا نے خرمہ اس سے لیا اور لڑکی اپنے باپ یا دادا کے پاس بھاگ گئی۔ بابا نے دونوں خرمے مجھے دے دیئے باوجودیکہ پچھلی رات ماں کی دی ہوئی جو کی روٹی میں نے شکم سیر ہوکر کھائی تھی پھر بھی میں اتنا بھوکا تھا کہ میں نے دونوں خرمے جلدی جلدی کھا لیے اور اس کی گٹھلی تھوکنا مجھے اچھا نہیں لگا۔ یہاں تک کہ ایک دوسرا خریدار آ گیا۔ میں اسی طرح گٹھلیاں چوس رہا تھا اور اپنے سامنے کی طرف اس بوڑھے کو دیکھ رہا تھا جو لنگی باندھے ہوئے اُکڑوں بیٹھا تھا، اس کے دونوں زانو پیٹ سے چپکے ہوئے تھے اور اونگھ رہا تھا۔

لڑکی کبھی مجھے دیکھتی تھی اور کبھی نظریں چُرا لیتی۔ بابا کا ذہن میری طرف بالکل نہیں تھا وہ اپنی دُنیا میں گم کسی پیسے والے خریدار کا انتظار کر رہے تھے۔

دل ہی دل میں میں نے سوچا کہ اس کا نام میری ماں کی طرح جمیلہ ہوتا مگر وہ اس کی طرح کوئی نہ ہوتی اور باتیں بغیر اشارے کے کر لیتی۔ میرے پاس اگر مرید خاں کا دل گردہ ہوتا تو میں اس پر ضرور عاشق ہو جاتا اور میں دلال کی طرح خوب پیسے جمع کرتا اور اس کے باپ یا دادا سے اسے خرید لیتا تا کہ کوئی دوسرا اسے نہ خرید سکے۔

''---سہراب اُٹھو! کھڑے ہو سہراب''۔

نئے خریدار آئے ہوئے تھے۔ تین عدد تھے، دو جوان اور ایک بزرگ، زرق برق۔

بزرگ کے ہاتھ میں چاندی کے دستہ والی چھڑی، آنکھوں پر عینک اور جیب والی گھڑی جس کی زنجیر صدری پر اس طرح چمک رہی تھی جیسے کہ وہ سونے کی ہو۔ قیافہ سے رحم دل نظر آ رہے تھے۔ ایک بار تو میرے دِل نے چاہا کہ خدا کرے یہی مجھے خریدیں۔ اُن کے رکھ رکھاؤ سے لگتا تھا کہ ان کے پاس کئی مکان اور گاڑیاں ہوں گی، اگر کوئی اُن کے ساتھ جانا چاہے تو وہ مفت چلا جائے پیسہ بھی نہ لیں۔

میری نظر اس لڑکی پر پڑی۔ میں نے دیکھا کانپ رہی تھی۔ شاید اسے یہ پسند نہ تھا کہ یہ نئے خریدار مجھے خرید لے جائیں اور وہ کارواں سرا میں تنہا رہ جائے۔

آنے والے بزرگ نے پوچھا: ''کیا عمر ہے؟''

''تیرہ برس۔ اگر تیرہ نہیں تو بارہ تو ضرور ہے''۔

''پڑھا لکھا ہے؟''

''نہیں جناب!''

اُن خریداروں میں سے ایک نے کہا: ''بن ماں باپ کا تو نہیں لگتا''۔

میرے باپ نے تند لہجہ میں کہا: ''نہیں، میرا بیٹا ہے، میرا اپنا بیٹا''۔

بزرگ خریدار نے کہا: ''کتنے میں اسے دو گے؟''

میرے باپ نے کہا: ''اس کا چچیرا بھائی دس سال کا تھا، کمزور اور مردہ جیسا۔ اس کا بیس ہزار ملا۔ ابھی دو مہینہ پہلے کی بات ہے''۔

اُن آنے والوں میں سے ایک نے کہا: ''مجھے اس کے خالہ ماموں کے لڑکے سے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔ تم بتاؤ کہ تم اس کا کیا لو گے؟''

بابا نے کہا: ''میرا اپنا بیٹا ہے۔ اس کی ماں نے اسے بڑی ناداری کی حالت میں پالا ہے۔ میں جانتا ہوں اسے کیا کھلایا ہے اور کیا نہیں کھلایا۔ چاروں انگ سلامت ہیں۔ کچھ تو مروّت رکھئے۔ آپ خود ہی انصاف کیجئے''۔

ان میں سے ایک بولا: ''دیکھو! ہم اسے اسمگلنگ کے لیے نہیں لے جا رہے ہیں، نہ تو ہم اسے سرحد کے اس پار شیخوں کے پاس بھیجیں گے اور نہ ہم اس سے مزدوری کرائیں گے۔ ہم تو اسے اپنے گھر لے جائیں گے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے گھر میں کام کرے اور اپنے مالک کی طرح زندگی گذارے۔ کھائے پیئے، سوئے جاگے۔ اس کا مستقبل اچھا رہے گا... بولو کتنا؟''

بابا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا بولیں۔

دوسرا بولا: ''پندرہ ہزار۔ یہ آخر ہے۔ منظور ہے؟''

بابا اپنی ٹھڈی کھجلانے لگے۔

بزرگ پھر بولے: ''مطمئن رہو۔ کم از کم تم کو یہ اطمینان رہے گا کہ تمھارا بچہ کسی غلط جگہ نہیں ہے''۔

بابا بولے: ''بیس ہزار...''

جوانوں میں سے ایک آگے بڑھ گیا اور پھر دوسرا بھی۔ بزرگ بولے: ''خوب اچھی طرح سوچ لو۔ بچہ کا مقدّر ہر کس و ناکس کے ہاتھوں میں نہ سونپو۔ ہم تمھارا برا نہیں چاہتے ہیں''۔

تینوں اب اس لڑکی کے پاس کھڑے ہو گئے اور اس کے دادا سے باتیں کر رہے تھے۔ وہ لڑکی کبھی سر اُٹھاتی تھی اور کبھی ان خریداروں کے درمیان سے مجھے دیکھ لیتی۔

اللہ میں بھی مُعطل رہا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں؟ میں بھی ڈر رہا تھا کہ کہیں اسے زیادہ قیمت دے کر خرید نہ لیں۔ دل میں دُعائیں کر رہا تھا کہ میرے بابا اور اس لڑکی کے دادا راضی ہو جائیں اور ہم دونوں کو ایک ہی جگہ بیچ دیں۔ میں نے دیکھا کہ اس لڑکی کا دادا بھی ان کے سامنے کھڑا ہے اور ان خریداروں میں سے ایک تیز تیز پیسے گن رہا تھا۔ میں بولا کہ: ''شاید اسے خرید لیا ہے''۔

بابا نے کہا: ''میں رہ گیا''۔

میں نے کہا: ''تم مجھے بھی اُنھیں کے ہاتھوں بیچ دو۔ بابا یہ لوگ اچھے لوگ ہیں''۔

ان لوگوں نے لڑکی کے دادا کو پیسے دِلائے۔ لڑکی کانپ رہی تھی اور مجھے دیکھ رہی تھی۔ میرا دِل اس پر فدا ہو گیا تھا۔ بالکل مرید خاں اور ہانی کی کہانی کی طرح اور دل چاہا کہ مرید خاں کی طرح جو 'ہانی' کا عاشق تھا بازار میں کھڑے شتری سفید پیشانی والے گھوڑے کو اُٹھاؤں اور لڑکی کو ان تینوں خریداروں سے چھین کر گھوڑے پر اپنے پیچھے بٹھا کر بھاگ جاؤں۔

بابا نے کہا: ''اب دیر ہو گئی''۔ وہ لڑکی ان تینوں خریداروں کے ساتھ کارواں سرا سے گلی میں مڑ گئی اور اس کا دادا پیسوں کو اپنی لنگی کے کونے میں لپیٹتا ہوا آہستہ آہستہ ہمارے سامنے سے گذر گیا۔

ہم لوگ سورج ڈوبنے تک اسی طرح انتظار میں کھڑے رہے اور اب اسی پتھر پر بیٹھے ہوئے تھے جہاں وہ لڑکی اور اس کا دادا بیٹھا تھا۔

آخری خریدار دو غیر ملکی تھے۔ دونوں ''لی جینس'' پہنے ہوئے تھے اور ان کا قد میرے بابا کے قد سے بھی اُونچا تھا۔ اُن کے بال سنہرے تھے اور ولایتی عینک لگائے

ہوئے وہ چنگم چبا رہے تھے۔ پہلے تو انھوں نے میرے بالوں کو دیکھا پھر اچھی طرح گھور کر آنکھیں، اس کے بعد انھوں نے میری پسلیوں پر ہاتھ پھیرا اور بولے:

''سانس لو! سانس لو...''

اور میں نے تیز تیز سانس لی۔ پھر انھوں نے میری گردن پیچھے سے دیکھی یہاں تک کہ اُن کو میرے باپ سے شرم و مروّت بھی نہ آئی۔ بے حیا تھے بے حیا۔ ہمارے پورے بدن کا جائزہ لیا اور تیز تیز اپنی زبان میں سر ہلا ہلا کر باتیں کر رہے تھے۔

میرے بابا نے کہا: ''جناب آپ نے دیکھا؟ دیکھا آپ نے؟ میں غلط نہیں کہہ رہا ہوں۔ بالکل صحیح سلامت ہے۔ تل برابر بھی کوئی بیماری اس کے بدن میں نہیں ملے گی''۔

نہیں معلوم کیوں ان لوگوں کو میں اچھا نہیں لگا۔ جب یہ لوگ آگے بڑھ گئے، میرے بابا نے زمین پر تین بار تھوکا اور کہا: ''تف ہے تم خارجیوں پر''۔

جنگل میں اب شام ہونے لگی تھی اور ہوشاک (شمال مشرق سے چلنے والی ہوا جسم کے لیے تکلیف دہ، نیز پھولوں اور کھیتوں کے لیے نقصان دہ ہوتی ہے) چل رہی تھی۔ لُو اور بگولے اپنے ساتھ ریت اور گرد و غبار لیے ہوئے، صحرا، مجلوں کے جھاڑ جھنکاڑ اور گز کے درختوں کے گرد گھوم رہے تھے۔

میں بالکل تھک چکا تھا۔ میرے ساواس جوتے کے بند نے میرے ٹخنے زخمی کر دیئے تھے اور میں بری طرح پسینہ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس ہندوستانی عطر کی خوشبو کا کوئی پتہ نہ تھا۔ میرا سفید پاجامہ اور پیراہن دونوں دھول سے اَٹے ہوئے تھے۔

بابا نے کہا: ''غروب کے وقت تو ہوشاک کم ہی چلتی ہے۔ خدا رحم کرے''۔

میں نے کہا: ''رات تک ہم لوگ کیا گھر نہیں پہنچ پائیں گے؟''

بابا نے کہا: ''بزرگ تو یہی کہتے ہیں کہ ہوشاک بہشت سے چلتی ہے لیکن جہنم پر سے گذرتی ہے تبھی یہ اتنی گرم ہو جاتی ہے۔ ہوشاک جب چلتی ہے تو کھجور کے پیڑوں

پر خرمہ باقی نہیں رہتا۔ سبھی کو جلا دیتی ہے۔ خدا رحم کرے!''

پھر اس نے اپنے انگوچھے کو سر سے کھولا اور میرے سر و گردن اور ناک تک کو چاروں طرف سے لپیٹ دیا اور پھر قدم تیز کر دیا۔ اور وہ اسی طرح اپنے آپ سے کہتا رہا کہ ہمیں اس کی قیمت گھٹا دینی چاہیے تھی۔ نہیں معلوم لوگ اس کی شکل و صورت میں کیا عیب دیکھتے ہیں کہ اسے قبول نہیں کرتے۔ مجھے چاہیے کہ کل یعنی آئندہ اس کی قیمت گھٹا دوں۔

○○

صنوبر کے اُس پار

اُس کی آنکھیں کھلی تھیں اور وہ چھت پر ٹکٹکی لگائے اس ہلکے نارنجی ہالہ کو دیکھ رہی تھی جو زمین پر جلتی ہوئی آگ کا عکس تھا۔۔۔گرم تھی، اتنی گرم جیسے خوشگوار گرمی کی راتیں، جس میں آرام سے صبح تک سویا جا سکتا ہے۔مگر اسے سردی لگ رہی تھی۔ یہاں تک کہ سلیپنگ بیگ میں ہونے کے باوجود ٹھنڈک کا احساس جوں کا توں باقی رہا اور نیند اس سے کوسوں دُور تھی۔

والدین سو رہے تھے۔اسے اپنے باپ کے سانس کی پھوں پھوں اچھی طرح سنائی دے رہی تھی۔والدین کی اُس گفتگو نے کہ، کچھ بدشگونی ہونے والی ہے اس کے انجانے اسکیموئی احساس کو خوفزدہ کر دیا۔اب وہ سوچنے لگی کہ کل جب قطبی سورج ہمیشہ کی طرح اپنی سحرانگیز دلکش نورانی کرنوں کے ساتھ طلوع ہوگا تو اسی وقت یہ اتفاق ضرور پیش آئے گا۔

اس کی کوشش تھی کہ وہ کل کے بارے میں نہ سوچے بلکہ اپنے دادا کے بارے میں، وہ بھی ان پیروں کے بارے میں جو چل نہیں سکتے، زیادہ تر ان کے ہاتھوں کے بارے میں سوچے جو آج بھی جوان ترین اسکیمو مردوں کے پنجوں کی طرح ایسے قوی ہیں کہ دریائی شیر کی کھال بغیر اسے زخمی کیے کھینچ لیں، پھر بارہ سنگھے کی سنہری سینگ پر چڑھا کر سیاحوں کے لیے دُنیا کا بہترین مکھوٹا بنائیں۔

سلیپنگ بیگ میں پہلو بدلا۔اب وہ ہلکے نارنجی رنگ کا ہالہ اُس کی نگاہوں کے سامنے نہیں تھا کہ اسے کل کے اُگتے ہوئے سورج کی یاد دلائے۔اب وہ اپنے باپ کے اس چہرہ کو دیکھ رہی تھی جس کی قہوئی گھنی داڑھی کے نیچے شکاریوں کا ہمیشہ باقی رہنے والا غرور چھپا تھا مگر اب کہیں گم ہوگیا تھا۔اور اس کے بجائے اس کے چہرہ اور اس کی داڑھی پر ایک خاکستری رنگ کی تہہ جم گئی تھی، یہ وہ احساس تھا کہ ان دِنوں وہ جب بھی اپنے باپ کے چہرہ پر نظر ڈالتی اسے ایسا ہی لگتا۔ یہاں تک کہ وہ خاکستری رنگ کی رگیں بھی اپنے باپ کی آنکھوں میں دیکھ سکتی تھی۔ان ساری باتوں کو اس نے فالِ بد مانا اور قطبی دیوتاؤں کو برا بھلا کہنے لگی کہ خزاں کے موسم کو اتنا جلدی اُن کے گاؤں میں بھیج دیا۔برف کے دیوتا جیسے ہی آئے سبھی پرندے، باقر قرہ، قطبی ابابیلیں، برفیلی چڑئیں، بارہ سنگھے اور بھینسوں کے جھنڈ سبھی کو بھگا دیتے۔گھڑیالوں اور دریائی شیروں کو اوقیانوس کی گہرائیوں میں ڈھکیل دیتے اور ہفتوں بعد اسکیمو شکاری اپنے گاؤں لوٹتے تھے تو چند چھوٹی مچھلیوں، چار پانچ لاغر پرندوں اور کچھ سفید خرگوشوں کے علاوہ سردی کا کوئی ذخیرہ اُن کے پاس نہیں ہوتا تھا۔

سوچنے لگی کہ کل جب سورج نکلے گا تو دادا کے پاس جائے گی اور رُوح بزرگ کے طلسم کو ختم کر دے گی۔یہ طلسم حتماً مٹھ کے اِردگرد کے دیوؤں کو بھگا دے گا۔

دادا اور کل کے سورج کے نکلنے کی یاد نے ایک بار پھر اُن سب باتوں کو یاد دلایا۔

اس کے باپ نے اِسی طرح سلیپنگ بیگ میں لیٹے لیٹے پوچھا: ''تم نے آج اُن سے کہا؟''

اس نے سوچا، شاید یہ جملہ اس نے خواب میں سنا ہوگا۔باپ کی آواز خواب آلود اور گرفتہ تھی اور ماں اسی طرح خاموش سو رہی تھی۔

باپ نے دوبارہ پوچھا: ''نہیں کہا؟''

''نہ، میں نہیں کہہ سکی، میں نہیں کہہ...''

پھر دونوں خاموش ہو گئے۔ وہ اُن کی سانسوں کی آواز سن سکتی تھی۔

''آخر کیوں؟ اُن سے کہہ دینا چاہیے تھا۔ میرے لیے یہ بہت سخت ہے۔ تمھیں ہی ان سے کہنا چاہیے تھا''۔

''میں نہیں کہہ سکتی... میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں کیا کہوں''۔

''تم نہیں چاہتی کہ ان سے کچھ کہو! ہمارے بوڑھے خود ہی ہر چیز جانتے ہیں، یہ ایک پرانی رسم ہے، ہمیشہ سے رہی ہے۔ شروع سے، جب سے اسکیمو کی زندگی کا آغاز ہوا۔ اگر صرف کہہ دیتی کہ اب ان کا وقت آ گیا ہے تو وہ خود ہی ساری باتیں سمجھ جاتے۔

''اگر بچوں نے سمجھ لیا تو؟''

''تو م کیا بغیر ان کے رہ سکتی ہے؟ تم خود جانتے ہو کہ وہ ان سے کس قدر مانوس ہے''۔

''کہہ دو کہ سفر پر گئے ہیں۔ واپس آ جائیں گے... اس طرح ٹھیک ہے... یہ بتانا ضروری نہیں ہے کہ وہ کہاں گئے ہیں۔ ہم لوگ اس وقت کچھ نہیں کر سکتے۔ یہ سردی جو سر پر کھڑی ہے...

تم خود انھیں لے جاؤ گے''۔

''میں؟ نا... نہیں کر سکتا، میں نے کہا نا ابن سمور آئے گا''۔

''کب؟''

''کل سورج نکلتے ہی چل پڑیں گے۔ خرجی (یعنی برف بند چمڑہ کا بقچہ) تیار کر دیا؟''

اس پرانی خرجی کی یاد دلائی جسے دادا نے میری پیدائش سے پہلے بارہ سنگھے کی کھال سے بنایا تھا۔ شام کو میں نے دیکھا تھا کہ ماں کاٹھ کباڑ میں سے نکال کر لائی تھیں اور ایک پیہ سوز (چربی سے جلنے والا چراغ) دو برف سے جمی ہوئی مچھلیاں اور کچھ چھوٹی موٹی

چیزیں اس میں رکھی تھیں۔ جو اتفاق پیش آنے والا تھا یقیناً کسی نہ کسی طرح خرجی سے اس کا تعلق ہے۔ اگر وہ خرجی کو درمیان سے ہٹا سکے یا اسے کہیں چھپا سکے تو شاید اس امر اتفاقی کو ہونے سے روک سکے۔

اپنے سلیپنگ بیگ کا منہ کھولا اور آہستہ آہستہ باہر نکلی ماں باپ پر ایک اُچٹتی ہوئی نظر ڈالی، دونوں سو رہے تھے، خرجی مٹھ کے کونے میں رکھی تھی۔ بارہ سنگھے کی رنگ اُڑی کھال بھی تہہ کر کے وہیں کنارے رکھی تھی۔ قدم دبا کر اس چبوترے سے جس پر بستر تھا نیچے اُتری۔ خرجی کو اُٹھایا۔ اپنا جوتا پہنا، والدین پر ایک نظر ڈالی۔ بغیر کسی آواز کے مٹھ سے باہر نکل گئی۔

موسم تاریک، ٹھنڈی ہوائیں شائیں شائیں چل رہی تھیں اور منہ پر تھپیڑے لگ رہے تھے۔ چاندنی کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ ہواؤں کی صرصر اور گاؤں کے بھوکے کتوں کی بھوں بھوں کے سوا کچھ کان نہیں پڑ رہا تھا۔ وہیں بیٹھ گئی۔ چاہا کہ خرجی سے شکار کرنے والا چاقو نکال کر گڈھا کھودے۔ جیسے ہی اس نے خرجی کا سامان اُلٹا دوبارہ کسی نزدیک کی مٹھ سے کتے کے بھونکنے کی آواز بلند ہوئی۔ کتے کی بھونک سے گاؤں کے سبھی لوگ اُٹھ سکتے تھے۔

یک بیک اُس کے ذہن میں آیا کہ وہ سیدھی دادا کے پاس جائے۔ خرجی بھی ساتھ لے جائے۔ یقیناً دادا کو پتہ چل جائے گا کہ کل کیا پیش آنے والا ہے۔ وہ طے شدہ امر کیا ہے جو کل ہونے والا ہے۔ اس خیال سے بہت خوش ہوئی کہ اگر دادا کو معلوم ہو گا تو وہ ضرور اس کی فکر کریں گے۔

دوڑتی دوڑتی دادا کی مٹھ کے پاس پہنچی۔ ان کی کھانسی کی آواز اُس نے باہر سے سنی۔ اپنے آپ کو مٹھ میں پہنچایا۔ دادا ابھی جاگ رہے تھے۔ آگ کے پاس بیٹھے ہوئے چلم پی رہے تھے۔ پوتی کو دیکھتے ہی گھبرا گئے۔ آدھا اُٹھتے ہوئے پوچھا: ''کیا ہوا؟

بولو، بولو! پتہ تو چلے کیا ہوا تو م؟"

خرجی دادا کے سامنے رکھ دی اور بولی: "کچھ نہیں... دادا! یہ خرجی لائی ہوں"۔

"خرجی؟ تو اس طرح کیوں؟ تو م اس وقت رات میں کیوں؟ تُو دیوانی تو نہیں ہوگئی ہے؟"

دادا کی آنکھوں اور چہرے کو دیکھا۔ بالکل لاغر لاغر بوڑھے بارہ سنگھے کی کھال کی طرح خشک اور جھرّی دار تھا۔

"دادا کل طلوعِ آفتاب کے بعد آپ سفر پر جائیں گے؟"

"سفر؟"

"دادا آپ کا وقت آ گیا، یعنی..."

دادا مٹھ میں جلی ہوئی آگ کو کچھ ایسا گھورنے لگے کہ وہ اپنا سوال بھی بھول گئی۔

"دادا آپ کب لوٹیں گے؟"

دادا اپنے آپ زیرلب گنگنانے لگے: "کل جب سورج نکلے گا..." یہ کسی سوال کا جواب نہیں تھا، بلکہ ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی لمبی تھکا دینے والی دُعا کا کوئی آخری جملہ گنگنا رہے ہوں۔ پھر پوتی کو دیکھا اور بولے: "یہ خرجی بھی میری ہے" اور مسکرا دیئے۔ ان کے ہونٹ سفید ہو چکے تھے، بہت ہی سفید۔ تو م تو ڈر گئی لیکن دادا نے پھر مسکرا کر اس کو اپنی طرف کھینچا۔ اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرا اور اس کی پیشانی چوم لی۔

"تو م کچھ نہیں ہے تم ڈرو نہیں۔ کوئی بات نہیں ہے۔ تمھارے بابا نے کہا ہے نہ کہ میں سفر پر جا رہا ہوں؟... ہاں تو م، صحیح کہا ہے، میں سفر پر جا رہا ہوں۔ یہ خرجی میری ہے۔ ہاں؟ تو م تم مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہی ہو؟ آخر میری پیاری گڑیا، میں ایک دن لوٹ آؤں گا... شاید میں لوٹ آؤں... میرے بیٹے نے تم سے یہی تو کہا ہے کہ ہم لوگ کل صبح سورج کے نکلتے ہی چلیں گے"۔

وہ کون سا رونما ہونے والا مقرّرہ اتّفاق تھا۔ لڑکی کو اس سے وحشت ہو رہی تھی۔ یہ وہ اتّفاق تھا جس نے دادا کو بھی لرزا دیا اور ان کی زبان کو لکنت ہوگئی۔ ایک ثانیہ کے لیے اس کی وحشت بڑھ گئی۔ وہ سوچنے لگی کہ اس نے یہ کیوں کیا۔ کاش! وہ اس مٹھ میں ہی رہتی۔ شاید اچھا ہوتا کہ وہ اپنے ماں باپ کی بات ہی نہ سنتی...

"اُٹھو، جاؤ جا کر سو جاؤ میری جان! تمھارے بابا اُٹھیں گے تو کہیں گے کہ میری بیٹی کہاں چلی گئی؟ وہ پریشان ہوں گے۔ تو م اُٹھ جاؤ۔ اب تم بیٹی اتنی بڑی ہوگئی ہو کہ بہت سی چیزوں کو خود سمجھ جاؤ گی! اب تم ہر لحاظ سے ایک اسکیموئی عورت ہو۔ او... اگلے دو سال میں تم سسرال چلی جاؤ گی۔ تمھیں سمجھنا چاہیے کہ سفر کا مطلب کیا ہے۔ یہ جاننا چاہیے کہ کلبۂ مرگ (موت کا مٹھ) کہاں ہے۔ میری بیٹی جانتی ہے"۔

تو م حیرت زدہ اپنے دادا کو دیکھ رہی تھی۔ وہ کہنا چاہتی تھی کہ وہ سفر کا مطلب ہی نہیں جاننا چاہتی۔ وہ کلبۂ مرگ کا معنی نہیں جاننا چاہتی۔

"تو م یہ ایک ایسی چیز ہے کہ ہم لوگ نہیں جانتے۔ یعنی میں بھی نہیں جانتا۔ تمھارا باپ بھی نہیں جانتا۔ شاید تم بھی کبھی نہ جانو۔ شاید کبھی تم کو معلوم ہو جائے کہ ایسا کیوں ہے"۔

دادا نے آگ کو کریدا۔ اسے گھورتے ہوئے کہا: "تو م! یہ آگ، جانتی ہو مجھے کس چیز کی یاد دلاتی ہے؟ ٹھیک پچاس ساٹھ سال پہلے، ایسی ہی ایک رات تھی۔ میں نے اپنے بابا کی مٹھ کی آگ بجھائی اور ہم دونوں ساتھ ساتھ چل پڑے تھے۔ ہمارے محلّہ میں ایک بوڑھا تانترک رہتا تھا۔ تم نے اسے نہیں دیکھا ہے، وہ مر گیا اور اسے مرے ہوئے بھی کئی برس ہوگئے۔ مجھ سے بولا پسر خورشید! تمھارا باپ اب بوڑھا ہوگیا ہے، اس سے راستہ چلتے نہیں بنتا۔ اگر بوڑھے راستہ نہ چل سکیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اب ان کا وقت آ گیا ہے۔ جلدی سے اس کام کو کر ڈالو۔ سردی کا موسم آنے والا ہے۔

اگر ان کا وقت پورا ہوگیا تو گاؤں والوں کے لیے اچھا شگون نہیں ہے۔ شیطان اس کے جسم میں اپنا اڈّہ بنالیں گے اور پھر ہمارے گھروں کے چاروں طرف رینگیں گے اور پھر اسکیمو کے گاؤں میں بلائیں نازل ہوں گی۔ میں نے کہا ٹھیک ہے، اسی رات اُن کی خرجی تیار کی اور چل پڑے۔ ڈیڑھ دن چلے ہوں گے کہ پھر ان سے چلتے نہ بنا۔ مجبور ہوگئے کہ سامان اُتار دیں۔ کچھ توقف کیا اور قطب ستارہ کے غروب ہوتے ہوتے ہم لوگوں کو جہاں پہنچنا تھا وہاں پہنچ گئے۔

تم کو معلوم ہے جب میں نے بابا کو نیچے اُتارا تو ہم ان کے چہرے پر نظر نہیں ڈال سکے۔ مجھے شرم آرہی تھی، مگر انھوں نے مجھے بوسہ دیا۔ وہ شجاع تھے اور ایک سچّے اسکیمو۔ انھوں نے کہا: ”جاؤ بیٹا جاؤ۔ خدا کرے تم کو کبھی یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہو... چھوڑو، ایک بات تم کو بتاؤں جسے آج تک میرے اور تمھارے سوا کوئی دوسرا نہیں جانے گا۔ تم جانتی ہو، بابا کو اُس رات یوں ہی خدا کے سپرد کر کے چھوڑ دوں یہ میرے بس کا نہ تھا۔ اس رات کے بعد میں کئی بار اُن کے پاس گیا۔ مگر یہ بات میں نے کسی کو بتائی نہیں۔ یہ میں کسی سے کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔ ایسا لگتا ہے گویا ابھی کل کی بات ہے۔ آج میں خود اس مقام پر پہنچ گیا جہاں ایک دن میرا باپ تھا۔ جب سے دُنیا شروع ہوئی تب ہی سے یہ رسم ہے۔ یہ اس وقت سے ہے جب پہلا اسکیمو بوڑھا ہوا۔

○

تمام رات برف گرتی رہی اور صبح ہوتے ہی جادو کی طرح برف بند ہوگئی۔ قطبی سورج سبز چمکدار روشنی کے ساتھ طلوع ہوا اور شفاف سفید دشت میں اپنی سحر انگیز فیروزی اور سبز کرنوں سے رنگ بھر دیا۔

ایک مرموز (پراسرار) آواز سے لڑکی کی نیند ٹوٹ گئی اور مٹھ سے باہر آ گئی۔ اسے اس اسرار آمیز رنگ کی کچھ خبر نہ تھی۔ اب دشت میں صرف صبح کا دُھندلکا اور حنائی

رنگ کی چمک تھی۔ مٹھ میں کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ گھبرا کر باہر نکل پڑی۔ سفید دشت کے کنارے پر اس نے اپنے کمر خمیدہ دادا کی پرچھائیں کو پہچان لیا، جو ایک بوڑھے زخمی بارہ سنگھے کی طرح لنگڑاتا ہوا دور ہوتا جارہا تھا اور اس سے بھی دور ابن سمور کو دیکھا جو بھورے رنگ کے بھالو کی طرح جھکا ہوا تیز تیز آگے آگے بھاگا جارہا تھا۔

غیر ارادی طور پر چند قدم ان کے پیچھے پیچھے دوڑی اور دادا کو اُونچی آواز میں پکارا۔ پھر نا اُمید ہوکر کھڑی ہوگئی اور ان دونوں کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتی رہی۔ پھر اسے خیال آیا کہ کہیں وہ غلط تو نہیں ہے۔ دادا اندر ہی بیٹھے نہ ہوں اور صبح سویرے کے وقت کی چلم پی رہے ہوں۔ پھولتی ہوئی سانسوں کے ساتھ وہ مٹھ میں داخل ہوئی۔ مٹھ ٹھنڈا اور تاریک تھا۔

دادا اپنے ساتھ فرش پر بچھی ہوئی کھال بھی اُٹھا لے گئے تھے۔ مٹھ میں دادا کا نام ونشان تک نہ تھا۔ صرف مٹھ کی دیوار پر ایک طلسم لٹک رہا تھا جو ہمیشہ لٹکا رہتا تھا۔ ایک دریائی گھڑیال کا چھوٹا سا سفید مجسمہ تھا جسے انھوں نے خود بارہ سنگھے کی سینگ سے بنایا تھا۔

وہ مٹھ سے باہر نکل کر وہیں سامنے کھڑی تھی۔ دادا کی سیاہ پرچھائیں اتنی دیر تک تکتی رہی کہ آنکھیں پانی سے بھر گئیں۔ ان کے سایے کانپتے ہوئے دشت کے اس کنارے پر صبح کے دُھندلکے میں غائب ہوگئے۔

اسکیمو بچے صبح سویرے خوشیاں منا رہے تھے، لیکن اس کا دل اصلاً کھیل کی طرف راغب نہیں تھا۔ واپس مٹھ میں چلی گئی۔ بستر جو ابھی بچھا ہوا تھا اسے سمیٹا اور چبوترہ پر اس کی جو مستقل جگہ تھی وہیں رکھ کر اس بجھی ہوئی آگ کے پاس بیٹھ گئی۔ اس کی ماں کو یہ بالکل پسند نہیں تھا کہ دادا کے جانے کے وقت وہ وہاں رہے۔ اس نے سوچا، اس کی ماں نے اس کے بھائی کو بھی یقیناً جگا دیا ہوگا اور اپنے ساتھ لے کر چلی گئی ہوگی تاکہ وہ دادا کو جاتے ہوئے نہ دیکھے۔ چونکہ وہ جلدی نہیں اُٹھ پائی تھی اس لیے اسے اپنے

آپ پر غصہ آ رہا تھا، اگر جاگتی ہوتی تو حتماً وہ کسی کو اجازت نہیں دیتی کہ دادا کو لے جائے۔

اسے دادا کا اَدھ سِلا ڈولفن کی کھال کا اوورکوٹ یاد آ گیا جسے وہ کئی دن سے سی رہی تھی کہ دادا اسے سردی میں پہنیں گے۔

اپنے آپ سے بولی: ''اگر مجھے معلوم ہوتا تو کم ازکم میں اس اوورکوٹ کو کل رات تک سی ڈالتی کہ صبح کو وہ پہن لیتے۔ اس طرح کم ازکم ان کا سینہ اور پیٹھ تو گرم رہتی''۔

سامان کی تلاش میں گئی ادھورا اوورکوٹ لائی، اس کے زرد رنگ پر چاندی جیسی سفیدی تھی۔ صرف آستینیں باقی تھیں۔ اس نے سینا شروع کر دیا۔

ابھی چند ہی پھندے ڈالے تھے کہ ماں آ گئی۔ روئی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں سے ظاہر تھا کہ وہ روئی ہے۔ اپنی بیٹی کو دیکھا تو پہلے تو وہ ٹھٹک گئی، گھبرا سی گئی پھر وہ کچھ سوچ کر مسکرائی۔ پوچھا: ''توم کیا کر رہی ہو؟'' کچھ نہیں بولی، اپنی ماں کی طرف دیکھا اور دوبارہ سینے لگی۔

''دادا کا اوورکوٹ سی رہی ہو؟''

توم نے سر ہلایا۔

ماں پہلے تو سنگی چراغ کی طرف بڑھی پھر پیہ سوز (چربی کا چراغ) کے پاس گئی۔ اسے دیکھا اور غیر ارادی طور پر بولی: ''اس کا بھی تیل ختم ہو گیا ہے۔ اس میں تیل نہیں ڈالا؟''

اپنے آپ کو اس کے ساتھ مشغول رکھتے ہوئے کہا: ''کاش! یہ کل پورا ہو گیا ہوتا۔ راستے میں ان کے لیے اچھا تھا۔ گرم رکھتا۔ تم کو معلوم ہے... تمھارے دادا آج چلے گئے...''

سوئی ڈولفن کی کھال میں اُلجھ گئی۔ باہر نکالنے کی اس نے کوشش بھی نہیں کی۔ اس نے اپنے کان ماں کی باتوں پر لگا رکھے تھے۔ منتظر تھی ''آج صبح چلے گئے تم سو رہی تھی''۔

توم بڑی مشکل سے صرف یہ پوچھ سکی کہ وہ کہاں گئے؟ دادا کے غم میں اس کی آواز اتنی رندھی تھی کہ اس کی ماں اپنے کو روک نہیں پائی۔ اس کی طرف مڑی اور بیٹی کو

ایک نظر دیکھا۔

''واپس آ جائیں گے میری گڑیا واپس آ جائیں گے، کہیں دور نہیں گئے ہیں...''

''بابا کے ساتھ گئے ہیں؟''

''ہاں... نہیں تمھارے بابا صبح جلدی شکار پر چلے گئے''۔

''کب لوٹ کر آئیں گے؟''

''کون؟ بابا یا دادا؟''

''دادا!''

''شاید سردی ختم ہونے پر لوٹیں۔ شاید جلدی آ جائیں لیکن بابا تمھارے جلد ہی آ جائیں گے۔ دو تین دن میں لوٹ آئیں گے''۔

توم دوبارہ اوورکوٹ میں مشغول ہو گئی۔

''تم اسے سی ڈالو۔ اگر تمھارے دادا نہیں آئے تو اپنے بابا کو دے دینا پہن لیں گے''۔

توم نے سر اُٹھایا، ماں کو دیکھا۔ یہ نظر اس کی ماں کے لیے بہت تیکھی اور بیگانہ تھی۔

''ماں! یہ دادا کا سامان ہے، دادا کا!''

ماں اس شعلہ گون رنگت کو جو اس کی آنکھوں اور رخساروں کو تمتما رہے تھے سمجھ نہ سکی۔ اپنا ہاتھ بیٹی کی پیشانی پر رکھا، گرم گرم تھی۔

''توم تم نے کیا کیا؟ تم تو بخار میں جل رہی ہو۔ باہر نہ جانا۔ یہیں بیٹھو اور اپنا کام کرتی رہو۔ ایک پیالہ گرم گرم سوپ پیوگی تو طبیعت ٹھیک ہو جائے گی''۔

اب اس کا ہاتھ اوورکوٹ سینے کے لیے نہیں اُٹھ رہا تھا۔ کیا فائدہ اگر دادا اُس کو نہیں پہنیں گے! جیسے ہی ماں مٹھ سے باہر گئی اُس نے اوورکوٹ اُٹھایا اور ایک کونے میں ڈال دیا۔ مٹھ سے نکل گئی۔ مٹھ کے بچے ابھی بھی برفیلی مٹھوں کے سامنے اُچھل کود مچا رہے تھے۔ اس کا چھوٹا بھائی اپنے ہم سن بچوں کے ساتھ چھوٹے چھوٹے برف کے گالوں سے

گھروندے بنا رہا تھا۔ اس کے بھائی نے جیسے ہی اسے دیکھا بہت شوق سے اسے پکارا کہ وہ آ کر اس کے برف کا گھروندہ دیکھے۔ لیکن اسے اس کا بھی حوصلہ نہیں تھا۔ وہیں مٹھ کے سامنے ایک برف کے ٹیلے پر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھیں برف پر بنے ہوئے نقشِ قدم پر تھیں۔ نقشِ قدم جو دادا کے کلبے کے سامنے سے شروع ہوئے تھے اور شرقی اُفق کے حاشیہ کی طرف وہاں سے آگے بڑھتے جا رہے تھے جہاں دادا اور ابن سمور آنکھوں سے اوجھل ہوئے تھے۔

وہ اُٹھی اور نقشِ قدم کے نزدیک جا کر بیٹھ گئی اور بڑے شوق سے اس نشان کو دیکھتی رہی۔ ایک نقش بڑا تھا اور برف پر اس کے گڈھے گہرے تھے اور دوسرا چھوٹا اور چھچلا تھا۔ تو اُٹھی اور چل پڑی۔ اسے اس بات کی فکر تھی کہ وہ اس نقشِ قدم کو دیکھتی رہے کہ وہ کہاں تک چلتے چلے گئے۔ تھوڑا آگے بڑھی۔ مٹھ سے دُور ہو کر اسے اپنے دادا کے نقشِ قدم کو پہچاننا بہت ہی آسان تھا کیونکہ گاؤں والوں کی آمدورفت سے وہ مٹے نہیں تھے۔ اگر برف نہیں گرتی تو اُفق کے اس شرقی راستہ تک وہ پہنچ جاتی جہاں اس کے دادا کو لے گئے تھے۔ وہ چلی جا رہی تھی کہ کسی نے اس کو آواز دی۔ پلٹ کر دیکھا تو اس کا بھائی دوڑا دوڑا اس کی طرف آ رہا تھا۔ ایک بار اس نے ٹھٹکی باندھ کر اس نقشِ قدم کو دیکھا اور گاؤں کی طرف چلی گئی۔

اپنے بھائی کا بھی انتظار نہیں کیا اور سیدھے مٹھ میں داخل ہوئی۔ مٹھ کے فرش کے گڈھے کی آگ کو دوبارہ روشن کیا۔ بارہ سنگھے کی سوکھی مینگنیوں کے کچھ ٹکڑے آگ میں ڈالے۔ آگ جل گئی تو خود اس کے پاس بیٹھ گئی اور دادا کے چاندی جیسے سفید اوورکوٹ کو سینے لگی۔

○

وہ آدھی رات تک جاگتی رہی۔ جب اسے اطمینان ہوگیا کہ اس کی ماں سوگئی ہے، دھیرے سے اُٹھی۔ کل رات جس خرجی کو تیار کیا تھا اسے اور دادا کے اوورکوٹ کو اُٹھایا، ایک نظر ماں پر ڈالی۔ ایسا لگتا تھا گویا گرمی کی نیند ہے۔ جوتوں کے بند مضبوطی سے باندھے اور دھیرے سے مٹھ سے سرک گئی۔ مطلع صاف اور چاند کے گرد ایک ہالہ تھا۔ زمین برف سے ڈھکی ہوئی چاندنی میں شیشہ کی طرح چمک رہی تھی۔ موسم کی شفافیت کو نیک فال سمجھتے ہوئے خود سے بولی قطبی دیو بھی سوگئے ہیں۔

دادا کے کلبہ کی طرف گئی۔ گھڑیال کا طلسم اُٹھایا اور چل پڑی۔ چمکتی ہوئی چاندنی میں دادا کے نقشِ قدم کو اچھی طرح پا سکتی تھی۔ جب وہ بستی سے دُور ہوئی تو کچھ کتوں کے بھونکنے کی آواز سن کر اس کے پاؤں جم گئے مگر وہ جلدی ہی چپ ہوگئے۔ مڑی اور ایک بار پھر ان مٹھوں کو جو برف کے تودوں سے ڈھکے ہوئے تھے دیکھا۔ وہ سوچنے لگی اُن مٹھوں کے بارے میں، صبح کے بارے میں، جب اس کی ماں اس کا بستر خالی پائے گی، اپنے دادا کی خالی مٹھ اور پھر کلبۂ مرگ جس کے بارے میں بستی کے بچوں سے کچھ کھسر پھسر سنا تھا، لیکن اس نے کبھی یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ لوگ کسی دن اس کے دادا کو کلبۂ مرگ میں لے جائیں گے۔

نقشِ قدم ایک برفیلی پہاڑی سے ڈھلوان کی طرف جا رہے تھے اور پھر وہ دوسری پہاڑی کی طرف گھوم گئے اور پھر اچانک غائب ہوگئے۔ اب تو بستی کے کلبے بھی نظر نہیں آ رہے تھے۔ کتوں کی آواز بھی نہیں سنائی دے رہی تھی۔ بہت دور شاید مدارِ قطبی کے اُس طرف سے بہت ہی ہلکی ہلکی آواز جیسے بھیڑیوں کے گلّے کی تھی جو چاندنی میں خوش ہو کر مستی میں آوازیں نکال رہے تھے۔

وہ بھی سرشار ہوگئی۔ ایک بار تو اس کا بھی دل چاہا کہ بیابان میں دوڑے اور جوان بھیڑیوں کی طرح آوازیں نکالے۔ اس نے اپنا سر اُٹھایا، گردن کو اُوپر کی طرف کھینچا،

ٹھنڈی اوپر اُٹھائی۔ جب چاندنی اس کی آنکھوں پر پڑی تو اس نے بھی ویسی ہی آواز نکالی اور نقشِ قدم کی طرف اُچھلتی کودتی دوڑ پڑی۔

نقشِ قدم برف سے ڈھکے ساحل کے متوازی پوربی شمال کی طرف مڑ گئے۔ ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگیں اور طرح طرح کی مبہم آوازیں برفیلے سمندر سے ہوا کے جھونکوں کے ساتھ آ رہی تھیں۔ بہت کان لگایا مگر سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیسی آوازیں ہیں۔ کہاں سے آ رہی ہیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے مدارِ قطبی کے اُس طرف سے شیشہ کے پہاڑ کے ٹوٹنے یا چاند کے کولے سے بارہ سنگھے کی کھال کے بنے ہزاروں طبل کے پیٹے جانے کی آواز یا دور کے گاؤں کے کلبوں سے برف کے تودوں کے ٹوٹنے کی جھنکار...

وہ جس قدر غور و فکر کرتی تھی کہ کلبۂ مرگ کو گاؤں سے اتنا دُور کیوں بنایا گیا ہے وہ سمجھنے سے قاصر تھی۔ سوچنے لگی شاید اس لیے کہ کوئی ان بوڑھوں کی مدد کو نہ جائے، پھر خیال آیا کہ ممکن ہے اس لیے کہ خبیث روحیں اسکیموؤں کے جسم میں گھر کر لیں اور اس کے بعد وہ کہیں گاؤں میں داخل نہ ہو جائیں۔

اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ قطبی روحیں دادا کے جسم میں اپنا مسکن بنائیں گی۔ کل رات ہی تو اس نے دادا کو دیکھا تھا، ان سے باتیں کی تھیں۔ کل رات دادا نے اس کی پیشانی چومی تھی۔ نہیں اس کے دادا کے ہاتھ تو اتنے قوی ہیں کہ دریائی شیروں (سیل مچھلیوں) کے دانت توڑ دیں۔ ان کی وہ کوتاہ پیشانی جس پر سات باریک شکن ہیں اور تین موٹے، اُن کی وہ چمکدار آنکھیں کہ گاؤں کے اس پار سے موشِ عنبر کو دیکھ لیں اور ان کے سینہ میں قدیم شکاریوں کے قصّے بھرے پڑے ہیں، کیسے ممکن ہے کہ وہ قطبی رُوحوں کو اپنے اندر گھسنے دیں گے۔

تو م ان سے ملنے کے لیے بے چین تھی۔ وہ اپنی آنکھوں سے اپنے دادا کو اپنے ہمیشہ والے دادا کو انہی ہاتھوں، انہی آنکھوں اور اسی سینے کے ساتھ دیکھ رہی تھی۔

اگر وہ مل جاتا تو وہ پوری سردی اس کے کلبہ کی آگ کو گرم و روشن رکھتی۔ اس کے لیے اس کی پسند کا کھانا بناتی، اسے سیل مچھلی کی سانسوں سے بنے برف کے گڈھوں کی پہچان تھی۔ وہ اپنے ہاتھوں سے بنائے ہوئے جال میں برفانی چڑیوں اور سفید خرگوشوں کا شکار کرتی۔

قطبی ستارہ کی چمک بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ بلند ہوتا جا رہا تھا اور چاندنی پھیکی پڑ رہی تھی۔ آدھی رات گذر چکی تھی۔

○

دادا قطبی ستارے سے اپنی آنکھیں نہیں ہٹا رہا تھا۔ اس نے اسکیموئی پرانی رسم کے مطابق اپنے دونوں ہاتھ بلند کیے، ہتھیلیوں کو قطبی ستارے کی طرف کرتے ہوئے اس چمکدار راہنما کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔

کلبہ میں اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ بار بار کروٹیں بدل رہا تھا۔ اِدھر سے اُدھر ہو رہا تھا، لیکن نیند اس کی آنکھوں میں نہ آئی۔ کلبہ بڑا بھی نہیں تھا۔ گاؤں کے پہلے والے کلبہ سے تھوڑا چھوٹا اور کسی حد تک اس کے مقابلہ میں تاریک بھی تھا۔ ساتھ ہی ایک انجانی سی مہک اسے پریشان بھی کر رہی تھی۔ جیسے ہی مٹھ میں داخل ہوا تھا اسی وقت اسے یہ بو محسوس ہوئی تھی۔ مرد نے پوچھا: ''کیسا ہے؟ کلبہ برا تو نہیں معلوم ہوتا''۔

دادا نے کہا: ''نہیں، ابن سمور ٹھیک ہے''۔ وہ سوچنے لگا جیسے بھی ہو اس کلبہ سے اس بُو کو دور کرنا ہے۔ جب وہ مرد وہاں سے چلا گیا تو اجنبیت کا احساس اور دونا ہو گیا۔ اسکیمو آبا و اجداد کی رسموں کا پابند ہونا یا زندہ رہنے کے ایک سادہ احساس پر دل دے دینا...

کئی بار دل ہی دل میں سوچا کہ یہ کہہ دے کہ ”ابن سمور مجھے یہاں سے لے چلو، میں یہاں نہیں رہوں گا“۔ لیکن وہ چپ رہا۔ اسکیموئی غرور نے اس بات کی اجازت نہیں دی کہ وہ اپنی اس آخری خواہش کو زبان پر لائے۔ کچھ دیر تک کھڑا اس مرد کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ جب وہ برفیلے ساحل کے گھنے کہرے میں غائب ہوگیا تو وہ ایک گہری آہ بھرتے ہوئے کلبہ میں واپس آ گیا۔ تھوڑی دیر زمین پر بیٹھے ہوئے اس کلبہ کے در و دیوار کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہا جس میں اسے روز و شب گذارنے ہوں گے۔ برسہابرس پہلے یہ گھر برف کے تودوں سے بنایا گیا تھا جس میں سونے کے لیے کئی ایک چھوٹے چبوترے اور وہیں نزدیک آگ جلانے کے لیے ایک چھوٹا گڈھا اور دیوار پر چند طلسم کے علاوہ کچھ نظر نہیں آ رہا تھا... بوڑھا اپنے ساتھ بارہ سنگھے کی دو بڑی کھال لایا تھا اور اسے فرش پر بچھا دیا، لیکن چراغ نہیں جلایا کیونکہ اسے سردی کی لمبی راتوں کی فکر تھی۔ اگر سردی کے بھوتوں سے بچنا چاہتا ہے تو ابھی سے ہر کام حساب کتاب سے کرنا ہوگا۔

بقچہ یعنی خرجی سے ایک ایک سامان باہر نکالا۔ ایک چھوٹی دیا سلائی کی ڈبیہ، ایک اس کا اپنا پرانا شکار کا چھرا، دو برف آلود مچھلیاں، اگر بہت کفایت سے بھی کام لیتا تو صرف دو ہفتہ اپنے کو زندہ رکھ سکتا تھا۔ اس کا وہ پرانا چھرا جس سے جوانی میں پوری سردی شکار کرتا تھا اور گاؤں کے سبھی بھوکے بچوں کا پیٹ بھرتا تھا مگر اب تو بڑھاپے میں بس اپنے ہی کو زندہ رکھ سکتا ہے۔ بہرحال خدا کا شکر ہے۔ وہ بھی زمانہ تھا جب بارہ سنگھے کی سینگوں اور ہڈّیوں سے اپنی پوتی کے لیے سامان اور اپنی بہو کے لیے تحفہ اور بیٹے کے لیے قطبی بھالو کا طلسم بناتا۔ اس نے کئی بار کہا بھی تھا۔ کسی نہ کسی دن اس کی برف گاڑی ضرور ادھر سے گذرے گی۔ اُس دن کے بارے میں سوچنے لگا۔ بچوں کی خوشیاں سوچ کر اس کی رُوح کو آرام ملتا تھا۔

یہ سب سوچ کر اسے کچھ گرمی کا احساس ہوا مگر پھر کانپنے لگا۔ نہیں، اس طرح خزاں کا موسم نہیں گذارا جا سکتا۔ ڈولفن کی کھال کا وہ اوورکوٹ جو اس کی پوتی اس کے لیے بنا رہی تھی یاد آ گیا اور وہ مسکرا دیا۔ اوورکوٹ کے خیال نے اس کے احساس کو گرم کر دیا۔ چونکہ صبح نکلتے وقت وہ اپنی پوتی سے مل کر خدا حافظ نہ کہہ سکا تھا۔ اس کا دل ملنے لگا۔ اس کی پیشانی کا ایک بوسہ ساری دُنیا کی خوشیاں اس کی جھولی میں ڈال دیتا۔

نہیں، اس طرح کی باتیں سوچنا اس کے لیے بہتر نہیں تھا۔ اسے اُٹھنا اور ٹہلنا چاہیے اس طرح کچھ گرم ہو جاتا۔ وہ کلبہ کے چاروں طرف گھوم کر اس کا معائنہ کر سکتا تھا یا کھڑا کھڑا اسی طرح سفید دشت کو دیکھتا...

کلبہ کے باہر موسم بہت ٹھنڈا تھا۔ ساحلی ہوائیں چل رہی تھیں۔ سورج گھنٹوں پہلے ڈوب چکا تھا اور اب روپہلی چاندنی کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ وہ قطب کی جادوئی چاندنی راتوں کی آوازیں پہچانتا تھا۔ ہمیشہ اپنی پوتی سے کہتا تھا کہ چاندنی راتوں میں برف کے بھوت سو جاتے ہیں اور قطبی فرشتہ پورے دشت میں پھیل جاتے ہیں۔ مدارِ قطبی سے آنے والی نرم نرم آوازیں انھیں فرشتوں کی ہوتی ہے۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر تم ایک سچی اسکیمو ہوگی تو تم فرشتوں کے بازو پھڑپھڑانے کی آواز سن لوگی۔ اگر تم اچھی طرح دیکھوگی تو ان کے شفاف بازوؤں کو چاندنی میں دیکھ سکوگی۔

اپنی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کئی بار پورے بیابان کو دیکھا۔ بیابان کے پوربی اُفق میں کالے کالے گہرے بادل کا مرغولہ بیابان کے سینہ پر تیر رہا تھا۔ اور نزدیک ہوتا جا رہا تھا۔ اپنے آپ سے بولا: ”یہ دیو بھوت یقیناً جاگ چکے ہیں۔ برف گر رہی ہے! تم کو پتہ ہے برف گر رہی ہے آج رات ضرور برف باری ہوگی“۔

کلبہ میں واپس جا کر دیا روشن کر دیا۔ کلبہ بہت جلدی گرم ہوگیا۔ اب اس پر لرزہ طاری نہیں تھا، لیکن بھوک بہت لگ رہی تھی۔ اس کا دل چاہا کہ مچھلی کا ایک چھوٹا ٹکڑا

کھالے۔ اپنے بقچہ سے ایک مچھلی نکالی۔ اسے دیکھا، چھوا اور بولا: ''ہیں ابھی بہت جلدی ہے...''

دوبارہ اسے بڑے احتیاط سے بقچہ میں رکھ دیا۔ اپنی بھوک کو بھلانے کے لیے اس نے چاقو اُٹھایا اور مٹھ کے کونے میں برف کو کھودنے لگا۔ اگر وہ یہ چاہتا ہے کہ کئی مہینوں تک سردی کی لمبی راتوں میں زندہ رہے تو کئی کئی روز تک بھوکا رہنے کی عادت ڈالے۔ اس کا جی چاہا کہ وہ بھالوؤں، لومڑیوں اور دوسرے قطبی جانوروں کی طرح پوری سردی سوتا رہے۔

اپنے آپ سے بولا: ''کتنا اچھا ہوتا انسان بھی دوسرے جانوروں کی طرح ہوتا''۔ پھر سوچنے لگا: ''بہتر ہوتا کہ مرد بھالو ہوتے اور عورتیں لومڑی یا خرگوش، اس طرح سردی بہت آرام سے گذر جاتی''۔

چھوٹا سا زمینی فریج جلدی سے تیار ہوگیا۔ مچھلیوں کو اسی گڈھے میں ڈال دیا اور کھدی ہوئی برف سے اسے ڈھک دیا۔ اس طرح اسے اطمینان ہوگیا کہ اب جب بھی اس کی نظر بقچہ پر پڑے گی کم از کم مچھلی کھانے کی خواہش تو اسے نہیں ہوگی۔ اب مجبوری یہ تھی کہ کل صبح سے ہی اسے غذا کی فکر کرنی ہوگی۔ اگر کوئی ایک موٹا تازہ جانور شکار کرلیتا تو سردی کے موسم کے خاتمہ تک نہ اسے روز گوشت کی فکر ہوتی اور نہ کمرہ گرم رکھنے کا غم۔

اپنے دل میں سوچا: ''کیا فرق پڑتا ہے اگر میں ایک سنہرے رنگ کا بارہ سنگھا یا ایک نیلی تندرست سیل مچھلی شکار کروں، معلوم نہیں کیوں جانور بوڑھوں سے زیادہ مانوس ہوتے ہیں۔ شاید اس لیے کہ ان کو اپنے بڑھاپے کی فکر ہوتی ہے''۔

پھر وہ خودرو بید کے بارے میں سوچنے لگا کہ جب وہ جوان تھا تو جب بھی اِدھر سے گذرتا تھا یہ درخت اس کے لیے اچھے مواقع فراہم کرتے تھے اور کچھ نہ کچھ ضرور

اس کے ہاتھ لگ جاتا تھا۔ وہ سوچنے لگا، اگر اب بھی میں وہاں چلا جاؤں تو مجھے یقین ہے کہ اچھا ہی ہوگا۔ میں جانتا ہوں زیادہ دُور بھی نہیں ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ برف کے اس ٹیلے کے پیچھے ہی ہوگا۔

یہ سوچ کر اسے ہنسی آ گئی کہ اس کے ماتواں پیر اسے برف کے ٹیلے کے اُس پار بید کے درختوں تک پہنچا ہی دیں گے۔ ایک تلخ مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی اور وہ اپنے آپ سے بولا: ''خودرو بید... چھوڑو... بے گناہ جانور بید و صنوبر کے درختوں کے نیچے سردیوں کی مستیاں کرتے ہیں، سورج کی اولاد!... اور آہ کھینچا۔

دوبارہ اُٹھا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی آواز آئی۔ وہی قطبی فرشتوں جیسی جن کے بارے میں ہمیشہ سوچا کرتا تھا۔ آواز صاف نہیں تھی۔ برف آلود اور ہواؤں کے جھونکے کے ساتھ کبھی دھیمی اور کبھی تیز آواز کی گونج بارہ سنگھے کی پیٹھ پر بندھی قندیلوں کے بجتے ہوئے گھنگھرو کی طرح تھی، چھوٹے چھوٹے فرشتوں کے قہقہوں کی طرح تھی۔ جلدی سے مٹھ کے باہر گیا۔ بیابان میں گھپ اندھیرا اور ہلکی ہلکی برف باری شروع ہوگئی تھی۔

○

وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے دل میں کوئی برا خیال آئے، لیکن جب ایسا ہوا کہ شمالی تیز ٹھنڈی ہوائیں تیز تر ہوگئیں، تیز تر ہوائیں اپنے ساتھ برف کا طوفان لائیں، اور جب برف باری کم ہوئی تو تم نے اپنے آپ سے کہا: ''یقیناً دیو بھوت جاگ گئے ہیں... میں جانتی ہوں، جانتی ہوں تم لوگ بیچ راستہ میں بیٹھے ہو، اور نہیں چاہتے کہ میں دادا تک پہنچوں''۔ اس کے بعد اس نے اچھی طرح دور و نزدیک کی آوازیں سنیں۔ ناامید ہوگئی۔ بھوتوں کے بھاری بھاری قدموں کی آواز سنی جو اس پار برف سے ڈھکے سمندر سے آ رہی تھیں۔ برف کے ٹوٹنے اور پھر بحرِ اوقیانوس میں گرنے، پانی کے تلاطم

اور جمی ہوئی برف کے نیچے سے سمندری گھڑیال کی چنگھاڑ کو سن کر سوچا کہ تیز تیز چلنا چاہیے، بلکہ دوڑنا چاہیے۔ قبل اس کے کہ دیو پہنچ جائیں اور دادا کے قدموں کے نشان برف سے ڈھک جائیں۔ مجھے اپنے آپ کو مٹھ تک پہنچانا ہے۔

دوڑنے لگی، سانس پھول رہی تھی مگر وہ دوڑ رہی تھی۔ برف باری پل پل بڑھتی جارہی تھی۔ اب تو تھوڑی ہی دُور تک نظر آ رہا تھا۔ چند قدم چلتی تھی اور رُک جاتی تھی، نقشِ قدم کو ڈھونڈتی تھی اور پھر دوڑنے لگتی تھی۔ آخر وہی ہوا جو ہونا تھا۔ برفانی دیوؤں بھوتوں نے اپنا کام کر ڈالا اور برف نے سارے نقشِ قدم بالکل چھپا دیئے تھے۔ اپنے اندر کی آواز کے سہارے کچھ دُور تک گئی... نہیں اس طرح کوئی فائدہ نہیں۔ کیسے پتہ چلے گا؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ اُٹھتا ہوا قدم دادا کے نقشِ پا سے دُور کرتا جائے۔

بیٹھ گئی اور اس اُمید میں کہ نقشِ قدم کا پتہ چلے برف کی تازہ جمی ہوئی پرتوں کو ہٹانے لگی۔ اسے پہلے سے ہی یہ معلوم تھا کہ اس کام کا کوئی فائدہ نہیں، اگر آسمان صاف ہوتا، اگر قطبی ستارہ غروب نہ ہوا ہوتا اگر دوسرے ستارے نظر آتے تو ضرور راستہ مل جاتا۔ کم سے کم گاؤں کا ہی راستہ مل جاتا۔ لیکن اب وہ کس طرح اس برف وطوفان سے چھٹکارا پائے، کوشش کی کہ شمالی ہوا جو اس کے منہ پر برف کی بوچھار کر رہی تھی اس کی مدد سے سمت کا پتہ لگائے لیکن ہوا بھی جیسے چکرائی ہوئی تھی۔ چکرائی، دیوانہ کی طرح اپنے ہی چاروں طرف گھوم کر شائیں شائیں کرتی ہوئی برف کے تازیانے کبھی دائیں سے کبھی بائیں سے اور کبھی سامنے سے اس کے چہرے پر لگا رہی تھی۔

یک بیک اس کے ذہن میں آیا کہ آوارہ لومڑی کی طرح برف میں ہی سوراخ کرے اور جب تک یہ طوفان تھم نہیں جاتا اس میں دُبکی رہے۔ فوراً گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گئی اور دیوانے بھیڑیے کی طرح دونوں پنجوں اور ناخنوں سے برف کھودنے لگی۔ جلد ہی برف کی سخت تہہ تک پہنچ گئی۔ پاگلوں کی طرح تین بار برف پر گھونسہ مارا۔

شدید برف باری ہو رہی تھی اور ہوائیں مٹھی مٹھی برف اس کے سر اور منہ پر پھینک رہی تھیں۔ ایسا احساس ہوا کہ کوئی اسے آواز دے رہا ہے: تو...م...ت...و...

کھڑی ہوگئی اور دوبارہ سننے لگی۔ ہوا اب داہنی طرف سے چل رہی تھی اور تو م اپنے چاروں طرف کچھ دیکھ نہیں پا رہی تھی۔

ہوا تو میرے شانہ کے اس طرف سے چل رہی تھی۔ کیسے اچانک راستہ بدل دیا؟ ہوا بھی تو پاگل ہوگئی ہے... ہوا پاگل ہوگئی ہے... یا میں؟...

قطبی جانوروں کی طرح اسکیموئی قدرتی طاقت کا استعمال کرنا چاہیے۔

گھٹنوں کے بل وہیں زمین پر بیٹھ گئی اور قطبی لومڑی کی طرح زمین کو سونگھنے لگی۔ اس نے اپنے چاروں طرف سونگھا، اس نے محسوس کیا اس کہر آلود ہوا کے تار تار میں کوئی جانی پہچانی مہک ہے، ایک آشنا مہک۔ شاید کسی شکاری اسکیمو کی مہک یا کسی گاؤں والے کی برف گاڑی کی بُو، یا اس ابن سمور کے قلّی کھال کے جوتے یا دادا کے بارہ سنگھے کے چمڑے کے جوتے...

میں جانتی ہوں، میں جانتی ہوں یہ تو میرے دادا کے جوتے کی مہک ہے۔ تو م غلطی نہیں کر سکتی۔

اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور گرم گرم خون اس کی رگوں میں دوڑنے لگا۔ کھڑی ہوئی۔ اس وقت وہ ایک مغرور بھیڑیے کی طرح کھڑی ہوئی۔ دوبارہ اس نے اپنا چہرہ اُوپر اُٹھایا، برف کے موٹے موٹے دانے اس کے چہرے اور آنکھوں پر گرے مگر یہ اولے... یہ اولے اس کے لیے گرم اور ہیجان آور تھے۔

گرمی کا احساس ہوا اور خوشی میں دل کی گہرائی سے ایک چیخ ماری۔ وہ چیخ جو قطبی بھیڑیوں کے جوان ہوتے ہوئے بچے انتہائی خوشی اور مستی میں نکالتے ہیں۔ ایسی چیخ جو دادا کے قول کے مطابق فرشتوں کے قہقہوں کی یاد دلائے۔ قہقہہ لگایا۔ چیخی اور پھر قہقہہ۔

یکبارگی بے مقصد دوڑنے لگی۔ آنکھیں بند کر کے دوڑ رہی تھی۔ اپنے پیر کو زبردستی برف میں گھساتی اور نکالتی تھی۔ جہاں تک اس کا دَم ساتھ دے رہا تھا دوڑ رہی تھی۔ گاؤں کے سب سے زیادہ دور مٹھ کے فاصلے کے برابر۔ اسکیموئی دو گاؤں کے برابر کی دوری طے کی تھی کہ سانس ٹوٹنے لگی...

اب وہ اپنے چاروں ہاتھ پیر سے برف پر گھسٹنے لگی۔ ایک مرتبہ دشت کے اندھیرے میں اسے ریس والی گاڑی کے چلنے کا احساس ہوا۔ نہیں... نہیں، اسے یقین نہیں ہوا یہ یقیناً خواب و خیال تھا۔ وہ جہاں برف کے گڈھے میں چھپی ہوئی تھی، گرم گرم نیند اور روشنی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ رُک گئی اور اپنی آنکھوں اور چہرے پر لگی ہوئی برف کو جھاڑ کر دوبارہ اس گاڑی کو دیکھنے لگی۔ وہ حیران تھی کہ نارنجی رنگ کی ہلکی روشنی دُور دشت میں ہل رہی تھی اور اس کو اپنی طرف بلا رہی تھی...

تو م کے تحت الشعور میں ایک سہانا منظر، ناقابلِ یقین شیریں خواب کی طرح ہمیشہ محفوظ رہتا تھا جسے کوئی دوسرا واقعہ کبھی محو نہ کر سکا:

بیابان کے گہرے اندھیرے میں شاید اوقیانوس کے مستقل برفیلے علاقہ میں ایک چھوٹی سی تنہا مٹھ تھی اور تیز ہوا سے کسی دیئے کی کانپتی ہوئی لو روشنی بکھیر رہی تھی۔ ایک کمر خمیدہ بوڑھا اس دیئے کے نارنجی ہالہ میں کھڑا تھا اور تو م کو وہ بوڑھا فرشتہ یاد آ گیا جو کانپتے ہوئے بادلوں پر کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے شفاف بازو اتنے بڑے تھے کہ اگر وہ کھول دے تو پورے دشت کو چھپا لے۔ اور محبت سے ہزاروں خرگوشوں اور روئیں دار جانوروں کو اپنے بازوؤں میں لے لے۔ تو م اپنی چند برسوں کی زندگی کے اس شیریں خواب کا مزہ اپنے دادا کی آغوش میں محسوس کر رہی تھی۔

وہ جاگ گئی، مگر اسے نہیں دیکھ رہی تھی، لیکن دادا کو اس بات کا احساس تھا کہ وہ جاگ چکی ہے۔ وہ بغیر متوجہ ہوئے اس کی پیٹھ کی طرف ٹفن سے کھانا نکال کر چکھ رہا تھا۔

مٹھ کے اندھیرے میں اسے اپنی پوتی کی کھلتی ہوئی آنکھ کا احساس ہوا۔ پھر کروٹ کا بدلنا اور بارہ سنگھے کی پرانی کھال کی سرسراہٹ، اس کے بعد اس نے لڑکی کی نگاہوں کا وزن اپنے شانوں پر محسوس کیا۔ لیکن اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ کوشش کی کہ نیچی نگاہوں سے دیکھے۔ مگر ایسا نہ کر سکا اور سوچنے لگا کہ لڑکی شاید کسی آواز سے جاگ گئی ہے یا کھانے کی خوشبو یا کسی اور چیز سے غرض اسے ابھی سوئے رہنا چاہیے کیونکہ رات میں اس نے لمبا راستہ طے کیا ہے۔

دوبارہ اس نے غذا کو چکھا، اس لیے نہیں کہ وہ اس کا ذائقہ لے بلکہ اس لیے کہ لڑکی کی نگاہوں کا وزن باقی رہے اور اسے موقع مل جائے کہ وہ کچھ سوچ سکے۔

''دادا! کیا پکا رہے ہیں؟''

بوڑھے کو کھانسی آ گئی۔ شاید سوپ کی گھونٹ ہوا کی نلی میں چلی گئی اور اسے کھانسی آ گئی۔ کئی بار کھانسا اور جب کھانسی رُکی تو مڑا۔

''---سلام!''

''---سلام تم جاگ گئی؟''

تو م نے دادا کی آواز میں ہلکی خشکی کا احساس کیا۔ بے ساختہ سوال کیا: ''دادا یہ کون سی جگہ ہے؟''

''یہاں...؟''

اگر تو م دیر سے جاگتی تو وہ اس سے وہ تمام باتیں کر لیتا جو تو م سے اسے کرنی تھیں۔ وہ سوچ لیتا اور ان تمام سوالوں کے جواب جو وہ اس سے کر رہی تھی پہلے سے ہی وہ اس کے کیسہ میں ڈال دیتا

''دادا آپ نے آنے سے پہلے مجھے جگایا کیوں نہیں کہ میں آپ سے خدا حافظ کہتی''۔

''خدا حافظ؟...''

"نہیں۔ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں"۔ (وہ خود سوچنے لگا) کہ چھوٹی بچی سے ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔اس طرح تو خود اس کے لیے اور اس کی پوتی کے لیے مشکل بڑھ جائے گی۔تو م اگر ایک لفظ، صرف ایک لفظ بول دیتی تو پھر وہ آدھی رات سے صبح تک جو بھی سوچ رہا تھا زبان پر لا نہیں سکتا تھا"۔

اپنی چلم میں اس نے آگ بھری اور ایک گہرا کش لیا۔

"---نہیں، مجھے چھوڑنا نہیں چاہیے۔اپنی جگہ میرے دِل میں وہ بنا لے گی۔ مجھے اس کے سامنے ہنسنا نہیں چاہیے۔اسے یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ جگہ اس کے لیے نہیں ہے۔اسے چاہیے کہ وہ بھول جائے کہ اس کا کوئی دادا بھی ہے۔اس طرح میرے لیے بھی راحت ہے۔مجھے اس سے کہہ دینا چاہیے کہ وہ لوٹ جائے۔ابھی اور ابھی وہ بستی کو لوٹ جائے"۔

اور چاہا کہ کہے: "تو م، تجھے لوٹ جانا چاہیے، تم سمجھی! ابھی واپس ہو جانا چاہیے"۔

لیکن کہا: "تو...تو م...تمھیں پتہ ہے میری بیٹی تم یہاں نہیں رہ سکتیں۔نہیں رہ سکتیں"۔

اس نے یہ دیکھا کہ وہ اپنے جملہ کو پورا نہیں کر پا رہا ہے۔جو بات اس نے اپنے دِل میں سوچی تھی اس طرح ان باتوں کو وہ کہہ نہیں سکا۔

"---کیا میں نہیں رہ سکتی؟ کیوں؟ مگر دادا جان میں یہاں رہنے کے لیے آئی ہوں..."

دادا، درد کو اپنے سینہ میں روکے ہوئے اسے دیکھتا رہا۔کاش وہ اپنی پوتی کو نہ پہچانتا اور یہ سوچتا کہ کوئی لڑکی آئی ہوگی تو اسے زیادہ تکلیف نہ پہنچتی۔وہ اس لیے آئی ہے کہ اسے آخر عمر میں بے قرار کر کے چلی جائے، پھر اپنے آپ سے بولا: "کاش! وہ نہ آئی ہوتی تو میں سکون سے تنہائی میں مر سکتا تھا"۔

اس نے کڑک دار آواز میں پوچھا: "تو م تم یہاں کس لیے آئی ہو؟"

پوتی کے جواب کو اس نے نہیں سنا۔وہ اپنے سخت رویہ پر بہت مطمئن تھا: "یقیناً اس لیے آئی ہے کہ مجھے نصیحت کرے یا اس لیے آئی ہے کہ میں اپنے ارادہ سے باز آ جاؤں اور میں اس کی خدمت گذاری اور ناز برداری کا محتاج رہوں کہ کوئی آئے اور میرے لیے کھانا بنائے۔مگر مجھے زندگی میں لطف اس وقت آتا ہے جب میں اپنے ہاتھوں سے شکار کرتا ہوں۔جب میں برف میں کسی بڑے بارہ سنگھے کا شکار کرتا ہوں تو اپنے کو خوش قسمت سمجھتا ہوں۔ایک بچی کے ہاتھ سے شکار کیے ہوئے گوشت کو کھانے میں مجھے مزہ نہیں آتا اور نہ ہی میرا خون اور گوشت اس سے بڑھے گا۔مجھے ایسا لگتا ہے کہ جیسے کوئی میرے ذاتی امور میں مداخلت کر رہا ہے... مجھے اچھا نہیں لگتا کہ بچّے ہم بوڑھوں کے معاملہ میں دخل دیں اور وہ بھی لڑکیاں...اسکیمی بچوں کو بوڑھوں کی بزرگی کا خیال رکھنا چاہیے خاص کر اس وقت جب وہ بوڑھے ہو کر گاؤں سے دُور تنہائی میں مرنے کے لیے چلے جائیں"۔

"---تو م! تم نے کیا کسی کو بتایا نہیں کہ تم تلاش میں جا رہی ہو؟"

"---دادا! کوئی نہیں جانتا کہ میں یہاں ہوں۔ماں بھی نہیں جانتی"۔

"---نہیں جانتی! کیسے نہیں جانتی...وہ لوگ بچے نہیں ہیں۔تمھاری تلاش میں آئیں گے اور یقیناً وہ کہیں گے کہ بوڑھے نے پوتی پر جادو کر دیا ہے۔تو م کیا اس کے سوا کچھ اور سوچیں گے؟ تم نے اپنے باپ کے بارے میں بھی نہیں سوچا کہ وہ گاؤں کے دوسرے شکاریوں کے درمیان سر نہیں اُٹھا سکتا...

اس نے دیکھا کہ پوتی کا گلا رُندھ گیا۔اس کے ہونٹ نیلے پڑ گئے اور آنکھیں حیرت زدہ۔رُک رُک کر سانس لے رہی تھیں۔وہ اپنی سخت گفتگو پر شرمندہ ہوا اور اسے یقین ہوا کہ جب انسان بوڑھا ہوتا ہے تو ضرور ان میں کچھ کمی آجاتی ہے۔ان کی فکر میں جلا نہیں رہتی۔دماغ بند ہو جاتا ہے۔اسکیموں کو حق ہے کہ وہ بھاگ جائیں

اور گاؤں کے کاہن کو یہ حق ہے کہ وہ یہ کہے کہ گاؤں سے دُور چلے جاؤ۔ پھر وہ اپنے دل میں بولا: ''تو م کاش تم نہ آئی ہوتی تا کہ میں تنہائی میں مرسکتا''۔ اور پھر بلند آواز میں بولا: ''تو م آؤ ناشتہ کرلو۔ تمھارے لیے ہم نے مچھلی کا سوپ بنایا ہے۔ تو م آؤ''۔

لڑکی نے صرف اسے دیکھا۔ تمام غم جو برف کے بھاری کولہ کی طرح گلوگیر تھا عنقریب تھا کہ پھٹ جائے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ گڑبڑ کہاں ہے۔ اصلاً اُن دِنوں کوئی کام ٹھیک نہیں ہورہا تھا۔ کوئی بھی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا جس سے خوشی نصیب ہو۔ حتماً برف کے دیو اور بھوتوں کا عمل درپیش ہے یا کوئی بزرگ رُوح گاؤں میں بھٹک رہی ہے۔ جو بھی ہو اسکیموئی نگاہوں سے عجیب وغریب چیز دِکھائی نہیں دے رہی تھی لیکن تبدیلی رونما ہورہی تھی... شاید وہ سمجھ سکے کہ وہ کیا چیز ہے۔ وہ اس بارے میں سوچنے لگی مگر اسے کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔

دادا کی طرف اس نے دیکھا تا کہ اپنے دادا کے چہرہ میں اس تبدیلی کے اثرات تلاش کرے۔ نہیں! دادا تو وہی ہمیشہ والا دادا تھا، وہی دُبلے پتلے خشک چہرہ والا، وہی کوتاہ پیشانی جس پر تین موٹی موٹی سلوٹیں اور سات چھوٹی چھوٹی شکنیں، وہی چہرے کا رنگ جو سبھی اسکیموؤں کا ہوتا ہے قہوئی رنگ جسے قطبی سردی نے جلا دیا تھا اور... اس کی آنکھیں لیکن... لیکن اس کی آنکھیں ایسا لگتا ہے جیسے بدل گئی ہوں۔ یقیناً اُس کی آنکھوں کے گوشہ میں رازوں نے چھپ کر گھر بنالیا تھا۔ اس کی پھٹی پھٹی آنکھیں گویا اس اَنہونی کو کہہ رہی ہوں جو ہونے والی ہے۔ اصلاً اب نہ وہ جوان رنگ باقی تھا اور نہ وہ ہمیشہ والی شادابی۔ مٹھ کا کالا رنگ بھی اس پر چڑھ گیا تھا، اور اس کی سانسوں میں بھی مٹھ کی بو بس گئی تھی۔

تو م جب سے اُٹھی تھی اس مہک کا احساس کررہی تھی۔ یہ مہک اس آخری دن کی مہک جیسی تھی جب قطبی سورج غروب ہوگیا تھا یا یہ مہک اس بڈھے بھیڑیے کی

سڑی لاش کی طرح تھی جسے گاؤں کے کتے نوچ چکے تھے...

یکبارگی اسے گھٹن محسوس ہوئی۔ وہ فوراً اُٹھ کھڑی ہوئی اور چبوترے سے تیزی سے نیچے آئی، گلے تک ہول کا احساس ہوا، جلدی سے مٹھ کے باہر چلی گئی تا کہ قے کرے اور تازہ ہوا لے۔ مٹھ کے دروازے پر لٹکے کھال کے پردے کی طرف دوڑی۔ دادا پریشان ہوکر بولا: ''تو م! تو م'' اور جھکا جھکا اس کے پیچھے دوڑا۔

تو م نے پردہ کو ہٹایا۔ مٹھ کے باہر برف سے ڈھکی زمین پر لیٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ دادا کا دل پسیج گیا، اس کے بغل میں بیٹھا۔ ''تو...'' اس کی آواز ٹوٹی ہوئی تھی۔ تو م نے سوچا: ''بہار کے سورج کے طلوع کے بعد جھیل میں برف یوں ہی ٹوٹتی ہے''۔

خود دادا نے سوچا کہ جس طرح سے کسی اسکیمو شکاری کا نیزہ کسی بوڑھی سیل کی پیٹھ میں گھستے ہوئے ہڈّیوں کو توڑتا ہے اور پھر اس نے سوچا کاش کہ تو م نہ آئی ہوتی۔ ہاتھ اس کے شانہ پر رکھا: ''تو م!'' تو م نے سر اُٹھایا اور آنسو بھری آنکھوں سے دادا کو دیکھا۔

''---یہاں بہت سردی ہے تو م۔ اُٹھو اندر چلیں۔ تمھارے لیے مچھلی کا سوپ بنایا ہے''۔

''اگر میں چاہوں تو لوٹ جاؤں...''

اور دادا نے یہ سوچا: ''میں اتنا بے نیاز کیوں ہوں؟ آخر میں نے اس کے ساتھ ایسا کیوں کیا۔ کیا اس لیے کہ غرور اور خودغرضی نے مجھے اس بات کی اجازت نہیں دی کہ میں اس پر ظاہر کروں کہ اس کے آنے سے میں کس قدر خوش ہوں یا اس لیے کہ میں ایک احمق اور خودغرض بوڑھا ہوں...''

''دادا! میں کب چلی جاؤں؟'' اور دادا حیرت زدہ نگاہوں سے اپنی پوتی کو بغور دیکھنے لگا۔ اس نے اپنے آپ کو جواب دیا: ''ان میں سے کچھ نہیں۔ بات صرف یہ ہے

کہ میں ابھی بھی ڈرتا ہوں۔ ایسی بہت سی چیزیں ہیں جن سے میں ڈرتا ہوں۔ میں گاؤں کے کاہن سے ڈرتا ہوں، میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ لوگ کہیں گے کہ میری کھال میں شیطان گھس گیا ہے۔ میں ڈرتا ہوں کہ لوگ کہیں گے کہ پسر خورشید نے اپنی پوتی پر جادو کر دیا ہے، اگر یہ سب نہیں ہے تو پھر میں اپنی کمسن پوتی سے ایسا کیوں کر رہا ہوں۔ وہ سب صرف اس لیے کہ میں یہ کہوں کہ مجھے ڈر نہیں ہے۔ مجھے موت سے مقابلہ کرنے میں ڈر نہیں لگتا۔ میرے اندر یہ جرأت ہے کہ میں قدیم اسکیموؤں کی رسم کی پیروی کروں...اور میرے ہاتھ اور میرا دل کانپتا ہے...''

تو م کا شانہ دادا کے ہاتھوں کے نیچے کانپ رہا تھا۔

''تو م تم کانپ رہی ہو۔ یہاں بہت سردی ہے۔ اٹھو میری بیٹی ہم لوگ اندر چلیں''۔

تو م ایک پالتو اور فرمانبردار کتے کی طرح اُٹھی اور دادا کے ساتھ چل پڑی۔ دادا نے اس کو آگ کے پاس بٹھایا اور وہ خود چبوترے کی طرف چلا گیا۔ بارہ سنگھے کی کھال لاکر اس نے شانوں پر ڈال دی۔ ''گرم ہو جاؤ گی تو پھر تم نہیں کانپو گی۔ یہ سوپ پی لو، جان آ جائے گی''۔

پیالہ کو اس کے پاس رکھا: ''ممکن ہے زیادہ خوش مزہ نہ ہو مگر تمھارے لیے اچھا ہے کہ یہ تم کو گرم کر دے گا''۔

''تم سوچ لو کہ ذائقہ دار ہے پھر بھی اگر اچھا نہ لگے تو تمھارے منہ سے اس میں ذائقہ آ جائے گا تو م! دُنیا میں نہ تو کوئی چیز خوش مزہ ہے اور نہ ہی بدمزہ۔ نہ تو کچھ اچھا ہے اور نہ برا... یہ انسان بڑے خیالی ہیں۔ سوچتے ہیں کہ ہر چیز کا ایک مزہ ہوتا ہے، مگر تیرا دادا ایسا نہیں سوچتا۔ تم بھی ایسا نہیں سوچتی؛ تو م ٹھیک کہا نا''۔

تو م نے بہت کوشش کی کہ وہ دادا کے سنائے ہوئے قصّوں میں اس پہلے کاہن کا نام یاد کرے جس نے کلبۂ مرگ کی رسم ڈالی تھی لیکن ہر مرتبہ اس کے ذہن میں ایک

شجاع شکاری 'او پیکودن' ہی کا نام آتا مگر اس لعنتی رسم کے ڈالنے والے پہلے کاہن کا نام اسے یاد نہیں آیا۔

''تو م! تم یہاں تک کیسے پہنچی؟''

''آپ کے نقشِ قدم کے سہارے آئی''۔

''نقشِ قدم؟ رات میں؟''

''چاندنی تھی''۔

''چاندنی...تو م تم جانتی ہو...''

اُٹھا اور دھیرے دھیرے دوبارہ پلیٹ فارم (چبوترہ) سے تمباکو کی تھیلی لایا اور آگ کے پاس بیٹھ گیا۔

''تمھیں میرے پیچھے نہیں آنا چاہیے تھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ بوڑھے اپنے ساتھ ساتھ شیطان کی برف گاڑی کھینچتے ہیں۔ شیطان کو اپنے ساتھ اِدھر اُدھر لیے پھرتے ہیں... پتہ نہیں، شاید یہ بات سچ ہو۔ شاید ابھی بھی میرے ساتھ یہاں پر کوئی شیطان ہو۔ کوئی تمھیں یہاں دیکھ نہ لے۔ آج کل میں، اسکیمو تمھاری تلاش میں یہاں آئیں گے۔ اگر نہیں تو تمھارا باپ جب شکار سے لوٹے گا اور جب اُدھر سے وہ گذرے گا تو میں تم کو اُس کے ساتھ بھیج دوں گا۔ ہاں تو م تمھیں بھیج دینا چاہیے''۔ چلم کے تمباکو کو دوبارہ تھیلی میں ڈال لیا اور اُٹھ کر جھکا جھکا مٹھ کے سامنے پردہ کی طرف گیا۔ تھوڑی دیر وہاں رُکا اور پھر کھال کے پردہ کو ہٹایا مگر باہر نہیں گیا۔ دوبارہ پلٹ کر آگ کے پاس بیٹھ گیا۔

''---تو م ہم لوگ مل کر ایک اور مٹھ بنائیں۔ دوسری مٹھ اسی مٹھ کی بغل میں''۔

''---دوسری مٹھ! کس لیے؟''

''---ہاں ایک دوسری مٹھ بنا سکتے ہیں۔ کیوں نہیں بنا سکتے۔ میں اپنے ساتھ ہنسیا لایا ہوں، دوسرے شکاری جب کلبۂ مرگ میں آتے ہیں تو ایسے بے سروسامان

ہوتے ہیں کہ اگر گاؤں کا کاہن بھی آجائے تو ان کے پاس اس سے کہنے کے لیے الفاظ نہیں ہوتے"۔

"---لیکن دادا آخر میں..."

"یعنی تو م تم سوچتی ہو کہ کہنے کو کچھ ہے؟ نہیں تو م تم مطمئن رہو یہ مٹھ سب کا منہ بند کردے گی۔ تم اس وقت تک یہاں رہو کہ وہ لوگ یہاں آئیں اور تم کو لے جائیں"۔

"مگر دادا! میں نہیں چاہتی... میں رہنا نہیں چاہتی۔ میں اکیلے نہیں رہ سکتی، میں چاہتی ہوں..."

بوڑھے نے مٹھ کا پردہ ہٹایا اور باہر کا منظر دیکھ رہا تھا۔ ہم لوگ اس طرف مٹھ بنا سکتے ہیں تا کہ جب شکاری آئیں تو پہلے ان کی نظر تمھارے چہرے پر پڑے، اس طرح بہت ہی اچھا ہوگا۔ اتفاق سے سورج بھی تمھاری مٹھ کی طرف سے طلوع ہوگا اور یہ تمھاری مٹھ کے لیے بہت نیک فال ہے۔ میں تمھاری مٹھ کے لیے موش عنبر کی کھال سے ایک طلسم تیار کر دیتا ہوں۔ ہر طرف چوہوں کی بلیں کھدی پڑی ہیں۔ ایک عدد لوں گا"۔

بوڑھے نے مٹھ کے سامنے سے پردہ ہٹا دیا تھا لیکن وہ اپنے اس خیال پر بہت خوش تھا۔ وہ یہ نہیں دیکھ پایا کہ مٹھ کے باہر معجزاتی طور پر مطلع بالکل صاف اور روشن ہے اور سورج اُفق سے بلند ہو کر چمکدار برف سے ڈھکے ہوئے دشت کا نظارہ کر رہا تھا۔ بوڑھا اس وقت اپنے خیال سے چونکا جب لڑکی اس کے بغل سے گذرتی ہوئی مٹھ کے باہر گئی۔

"تو م تم دیکھ رہی ہو۔ اتفاق سے آج موسم بہت اچھا ہے۔ ایسے موقع پر جب سورج اُفق پر اس طرح نظر آئے تو اسکیموؤں کے لیے یہ دن بہت اچھا ہوتا ہے۔ آج شکاری اسکیمو ضرور جشن مناتے ہیں۔ کوئی بھی شکاری ایسے دن میں اپنے گھر میں نہیں بیٹھتا۔ قدیم شکاریوں کو یہ بات معلوم ہے کہ ایسے دنوں میں کوئی بھی پرندہ اور خرگوش اپنے آشیانہ میں نہیں رہتا۔

قطبی صبح کے اس روشن منظر نے دادا کو بھی جوش سے بھر دیا اور پوتی کو بھی اس منظر سے مسحور کر دیا۔ گاؤں کے بارے میں سوچنے لگی۔ ان گھروں کے بارے میں جو ایسے موسم میں ہمیشہ خالی رہتے ہیں اور ان بچوں کے سلسلہ میں جو اپنے گھروں کے سامنے میدان میں دوڑتے ہیں اور برفانی موش عنبروں کی بلوں کو کھودنے میں تھکتے نہیں۔

"یہ بات تو طے ہے کہ مجھے یہاں سے چلنا ہے تو کیا میں شکار پر جا سکتی ہوں۔ بس آج اور ابھی..."

بوڑھا چونک کر بولا: "شکار! کس طرح؟ تو م! شکار کے لیے سامان چاہیے۔ چوہے دان، جال، چھری..."

"دادا، میں سارا سامان چمڑے کے تھیلے میں رکھ کر لائی ہوں"۔

"دادا آج موسم بہت اچھا ہے۔ دیکھئے! سورج کو دیکھئے!

"سورج؟ آؤ... تو م مجھے ڈر لگ رہا ہے، آج موسم اچھا ہے، بہت اچھا ہے، حتماً دشت میں جانور گھوم رہے ہوں گے۔ جہاں سے کوئی بھیڑیا، بھالو....."

"دادا میں دُور نہیں جاؤں گی یہیں اِردگرد رہوں گی..."

"تو م..."

تو م اپنے دادا کو اچھی طرح پہچانتی تھی۔ وہ سمجھ گئی کہ اب کام ختم۔ اب اسے مٹھ میں واپس جانا چاہیے۔ تھیلے سے سارا سامان اُنڈیل کر صرف شکار والے سامان ہی لینے ہیں... تم، تو م جانتی ہو..."

تمھارا دادا جب پہلی بار شکار کے لیے گیا تھا تو اسے اچھی طرح یاد ہے کہ وہ بہار کا دن تھا اور وہ اُس وقت آج کی تو م سے بھی چھوٹا تھا اور میرے دادا نے میرے باپ سے کہا: "میں تنہا جانا چاہتا ہوں"۔

اس نے سوچا کہ اس وقت کے باپ اچھے ہوا کرتے تھے۔ شکار اُن کے لیے مقدس تھا۔ شکار کا جب نام آجاتا تھا تو وہ اپنے بچّوں کے ساتھ سختی نہیں کرتے تھے۔ اس دن وہ تنہا گیا اور اندھیرا ہونے سے پہلے ہی ایک سنہرے رنگ کی چمکدار قطبی لومڑی لیے ہوئے گھر لوٹا۔ اب اگر یہ پیر ساتھ دیتے تو شکار کے لیے اب بھی جاتا اور وہ اپنی پوتی کے ساتھ جا کر اس کو پرانے شکاریوں کے طور طریقے سکھاتا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ پوتی کے پہلی بار شکار کرنے کے وقت اس کے سامنے وہ خود ہوتا اور اس کے جوان چہرے کے خطوط میں دوبارہ اپنے بچپن کی خوشی کو دیکھتا...

تو م اپنا سامان لے کر باہر نکلی اور دادا کے سامنے کھڑی تھی۔

''تو م! تم جانتی ہو؟ شکار کوئی بھی ہو، ایک اصلی اسکیمو کے لیے قابلِ احترام اور مقدس ہے۔ شکار کے تقدّس کی ہمیشہ حفاظت کرنی چاہیے۔ اسکیمو جانور ہم انسانوں کے بھائی بہن ہیں اسی لیے جب وہ مرجاتے ہیں تو اُن کی روحیں ہماری مٹھوں کی حفاظت کرتی ہیں۔ تو م! کبھی بھی کسی شکار کو ستانا نہیں، یہ بات تم ذہن نشین کرلو اور یہ بھی یاد رکھو کہ شکار کوئی خشک اور خالی برف کا ٹکڑا نہیں ہے کہ ایک گوشہ میں کھڑا ہوا اور تم جا کر اس کا شکار کرلو۔ جانوروں کے پاس شعور ہم انسانوں سے زیادہ ہوتا ہے۔ وہ ہمیشہ اگر ہم انسانوں کے ہاتھوں شکار ہوجاتے ہیں تو وہ اس لیے کہ ہم انسانوں کے مقابلہ میں اُن کے پاس خود کو بچانے کے مواقع کم ہیں اور یہ اُن کی تقدیر ہے کہ وہ ہمارے ہاتھوں شکار ہوتے ہیں اور کوئی اپنی سرنوشت سے فرار نہیں کرسکتا۔

''دادا، کاش! آپ بھی آج میرے ساتھ آتے''۔

''ہاں بیٹا، کاش! میں آسکتا۔ کاش میں کم از کم لنگڑاتے ہی لنگڑاتے اپنے کو تمھارے پیچھے کھینچ سکوں''۔

''ہاں تو م، تم جاؤ۔ اگر تم آج خالی ہاتھ لوٹیں تو نا اُمید نہ ہونا۔ کوئی بھی جانور خود سے کسی کا شکار نہیں ہوتا۔ جب تک کہ وہ بھوکا نہ ہو۔ یہ بات بالکل سچ ہے... تو م تم سمجھیں!''

○

''میں شرمندہ ہوں
میں ڈرپوک اور تھکی ہوئی ہوں
دادی نے مجھے جب بھی بھیجا
کسی قیمتی شکار کے پیچھے
کتنی آوارہ لومڑیوں کے پیچھے لگایا
مگر افسوس!
ایسا نہ ہو کہ جو بھی میں ڈھونڈوں
اسے خود ہی بھگادوں...

میں نے انگلیوں کی ایک ایک پور کے بہ قدر دعائیں پڑھیں اور اب تو کوئی انگلی بھی نہ بچی کہ اس پر کچھ اور پڑھ کر دَم کروں''۔

لڑکی نے اپنے ہاتھ اور پیر کی انگلیوں کے بہ قدر شکاریوں والی تمام دعائیں پڑھ لیں اس کے باوجود خرگوش کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ وہ بدبدائی کہ خرگوش پوری عمر تو یہاں رہے گا نہیں۔ آخر کو کبھی باہر آئے گا۔ جب بھوک لگے گی تو باہر آئے گا ہی۔

پھر بولی: ''صبح ہوگی تو جال ڈالوں گی۔ ابھی تو اس کا کہیں پتہ نہیں''۔

اس کے بعد اس نے سوچا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ایک لحظہ کے لیے توجہ ہٹے اور وہ اس کا فائدہ اُٹھا کر کہیں گھس جائے اور اس نے کوشش کی کہ اچھی اچھی باتیں سوچے۔

چونکہ اسے معلوم تھا کہ اگر کوئی برے اتفاقات کے بارے میں سوچے تو وہی رونما ہوجاتا ہے اور اس نے خیال کیا کہ کیوں نہ وہ اپنے مٹھ کے بارے میں سوچے جو باہر کے مقابلہ میں گرم تھی اور اس کی شمالی ٹھنڈی ہواؤں سے حفاظت کرتی تھی مگر پچھم کی طرف سے سردی آرہی تھی اور دھیرے دھیرے اس کے کھال کے کپڑوں کے اندر گھس رہی تھی۔

تو م کو اس بات کا یقین آرہا تھا کہ شکار کرنا اسکیمو مَردوں کا کام ہے۔عورتوں کے بس کی بات نہیں۔ وہ صرف مرد اسکیمو کے شکار کیے ہوئے گوشت کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے محفوظ کردے۔لڑکیاں صرف یہ جانتی ہیں کہ برفیلی مٹھ میں آگ کے پاس بیٹھی رہیں، کھانا پکائیں، جانوروں کی کھالوں سے کپڑا سلیں۔

وہی تمام باتیں جو اس نے اسکیمو جوانوں سے عورتوں اور لڑکیوں کے بارے میں سنی تھیں اسے یاد آگئیں۔ یہاں تک کہ گاؤں کا بوڑھا کاہن بھی لڑکیوں کو موذی ارواح کا آشیانہ سمجھتا تھا کہ جب وہ گاؤں کے مردوں کے شکار گاہ کے نزدیک ہوتی ہیں تو جانوروں کو بھگا دیتی ہیں۔

''ایسا نہ ہو کہ میں بھی جانوروں کو دادا کی مٹھ سے دُور بھگا دوں''۔

اس کا دل بھاری ہوگیا اور سوچا کہ یقیناً دادا بھی ان باتوں کو جانتے ہیں تبھی اسے پسند نہیں ہے کہ میں اس کے پاس رہوں اور یقیناً اسی لیے وہ دو دن پہلے خالی ہاتھ اپنی مٹھ میں لوٹے تھے۔اُس نے خود ہی اپنے کو سمجھایا کہ ایسا دو دن اس لیے نہیں تھا کہ میں لڑکی تھی بلکہ اس لیے تھا کہ میں نے ناشتہ کرلیا تھا اور جانور مجھ سے بھاگ جاتے تھے۔لیکن آج جب میں نے ناشتہ نہیں کیا ہے تو جانور بھی نظر آرہے ہیں۔

آج میں نے ناشتہ کیوں نہیں کیا۔ کیا یہی وجہ ہے کہ آج جانور دِکھائی دے رہے ہیں۔

مغرب کی طرف اس نے نظر ڈالی اور دیکھا کہ سورج ڈھل چکا ہے اور اُفق پر صرف اس کی ہلالی پیشانی نظر آرہی ہے۔ نیلے آسمان پر زرد بادلوں کا حسین امتزاج تھا۔ ابھی سورج ڈوبنے میں کچھ وقت باقی تھا اور اس وقت تک خرگوش یقیناً باہر نکل آتا، اس نے سوچا کہ اگر باہر نہیں آیا تو شاید سورج کے ڈوبتے ہی باہر نکل آئے اور اگر پھر بھی نہیں آیا تو شاید رات ہوجائے تب نکلے۔ میں اس وقت تک رُکوں گی۔ میں ٹھہر سکتی ہوں۔سردی ابھی میرے بدن کو پوری طرح ٹھٹھرا نہیں پائی ہے۔ابھی میں دو رات، دو دن تک بیٹھ کر اس سوراخ کی نگرانی کرسکتی ہوں۔ میں اپنے اندر اتنا حوصلہ پاتی ہوں۔خرگوش! میں تم کو نہیں جانتی، میرے دادا کہتے تھے کہ جانوروں میں انسانوں سے زیادہ شعور ہوتا ہے۔تمھیں باہر آنا چاہیے۔اگر چاند نظر آتا تو مجھے کوئی فکر نہ ہوتی۔ میں اپنے دادا پر یہ ثابت کرنا چاہتی ہوں کہ میں بھی دوسرے اسکیموؤں کی طرح شکار کرسکتی ہوں۔وہ بھی ایک موٹے تازے خرگوش کا!

گڈھے کے کنارے کی برف گرگئی۔اس نے اس کی فکر بھی چھوڑ دی اور سانس کو روک کر اتنی ساکت ہوگئی کہ وہ بل میں خرگوش کی حرکت کو سن سکے۔خرگوش بار بار آتا تھا اور واپس چلا جاتا تھا اور بل کے پاس کی برف کو ہلا کر اندر بھاگ جاتا تھا۔اس نے سوچا ''اپنے کو بالکل آمادہ رکھوں اور مجھے نیند نہیں آنی چاہیے اور اپنے ہاتھوں کو بھی اچھی طرح جانچ لوں۔ایسا نہ ہو کہ جب خرگوش باہر نکلے تو انگلیاں سن ہوچکی ہوں اور پھر جال کی رسّی کھینچ نہ سکیں''۔اپنے ہاتھوں پر نظر ڈالی اور کئی بار انگلیوں کو کھولا اور بند کیا اور پھر اطمینان کی سانس لی اور پھر جال پر نظر ڈالی۔اس کا دل اس خرگوش کے لیے پریشان ہوا جو بہت گھبرایا ہوا تھا۔ وہ سوچنے لگی: ''یقیناً پہلی بار ہے کہ وہ جال میں پھنسے گا ورنہ اتنا پریشان نہ ہوتا اور میرے لیے خوشی کی بات یہ ہے کہ یہ بھی تو میرا پہلا ہی شکار ہے۔ممکن ہے اسے کئی بار اس اتفاق کا سامنا کرنا پڑا ہو ورنہ وہ اس سے بھی زیادہ

گھبرایا ہوا ہوتا۔ ممکن ہے ان موقعوں پر کسی ناتجربہ کار اور کم حوصلہ شکاری کا سابقہ پڑا ہو"۔

پھر اس نے سوچا یہ خرگوش بہت جوان ہوگا۔ شاید یہ مادہ ہوگی اور اس کا دل اس مادہ خرگوش کے لیے مچلنے لگا کہ یقیناً سبھی خرگوش یہ سوچتے ہوں گے کہ سفید خرگوش میں کوئی خاصیت نہیں ہوتی اور حتماً خرگوش کے کاہن یہ سوچتے تھے کہ مردہ خرگوشوں کی موذی روحیں اس کی کھال میں گھس جاتی ہیں کہ شکاریوں کو اپنے اِردگرد لبھاتی ہیں، پھر اس کا دل اس مادہ خرگوش کے لیے کچھ زیادہ ہی بے چین ہوا مگر اس نے دیکھا کہ اگر وہ اس طرح زیادہ سوچے گی تو ممکن ہے اُسے رحم آ جائے اور اسے شکار کرتے ہوئے شرم آئے۔

وہ بدبدائی: ''اے خرگوش! مطمئن رہو، اس بار کے شکار کی یہ خوبی ہے کہ تم کسی بے رحم اسکیمو کے ہاتھ نہیں لگو گی بلکہ ایک ایسی لڑکی کے قبضہ میں آؤ گی جو تمھاری طرح...'' اور اُونچی آواز میں بولی: ''اگر دادا کی ضرورت نہ ہوتی تو میں تمھارا شکار بھی نہ کرتی۔ میں تمھیں چھوڑ دیتی کہ تم باہر آؤ اور خرگوش کے کاہن کے پاس جا کر یہ ثابت کرو کہ تم ایک صحیح و سالم خرگوش ہو، میری باتوں کو سمجھ رہی ہے تو اے مادہ خرگوش!''

اسے وہ صبح یاد آ گئی جب بید کے چھوٹے چھوٹے درختوں کے کنارے اس نے ایک خرگوش دیکھا تھا بالکل برف کے گولہ کی طرح سفید جو برف پر لوٹتا تھا اور چلتا تھا۔ پہلے اسے یقین نہیں ہوا اور سمجھا کہ شاید وہ فکرمند ہے۔ اس نے ناشتہ نہیں کیا ہے اس لیے اس کی آنکھوں سے نظر نہیں آ رہا ہے۔ زمین پر بیٹھ گئی اور دھیمے دھیمے کھسک کھسک کر آگے بڑھی اور ایک برف کے تودہ کے پیچھے چھپ گئی۔ سفید خرگوش تندرست تھا۔ اس کی تھوتھنی گلابی گلابی تھی اور وہ صنوبر کے چھوٹے درختوں کی طرف اور خودرو بید کے نیچے اُچھل کود کر رہا تھا۔

وہ اسی جگہ تھی کہ اسے یہ بات سمجھ میں آئی کہ قسمت نے اس کا ساتھ دیا ہے مگر وہ اس قدر گھبرا گئی کہ اسے یاد ہی نہ رہا کہ اُسے ایسے موقع پر کیا کرنا چاہیے۔ وہ پہلے

زیرلب شکاریوں والی دُعا پڑھے یا خرگوش کا پیچھا کرے کہ اتنے میں خرگوش کو خطرہ کا پتہ چل گیا۔ اس نے اپنی کنوتیوں کو سمیٹا، فضا کو سونگھا اور یکبارگی دوڑنے لگا۔ وہ بھی تھوڑی دیر کے لیے ٹھٹکی۔ اس نے شکاریوں کی دعا آدھے پر ہی چھوڑ دی اور بغیر کسی توقف کے اس کے پیچھے دوڑ پڑی...

اُونچی آواز میں بولی: ''وہی، خرگوش! تو نے دیکھا! آج قسمت میرے ساتھ ہے''۔

پھر اسے خیال آیا کہ زور سے اُسے نہیں بولنا چاہیے تاکہ وہ یہ سوچے کہ میں تھک گئی اور یہاں سے چلی گئی اور اس طرح وہ شاید جلدی سے باہر آ جائے۔

اور بولی: ''خرگوش! میں تھک گئی ہوں۔ تو بھی تھک گئی ہوگی۔ ہم لوگ بہت دوڑے ہیں۔ دونوں تھک گئے ہیں مگر تو مجھ سے زیادہ۔ کم از کم مجھے یہ تو پتہ ہے کہ میں کس کے پیچھے ہوں۔ میں نے اپنے پاؤں کو یوں ہی نہیں تھکایا ہے لیکن تجھے نہیں پتہ ہے کہ تو کدھر سے جائے گی۔ یونہی دائیں بائیں مُڑی اور پھر اپنی پرانی جگہ پر واپس چلی گئی۔ صنوبر کی طرف گئی اور پھر مڑی اور بے کار اپنے کو تھکا لیا۔ اگر میں تیری جگہ پر ہوتی تو شروع ہی سے ایک راستہ پکڑتی اور آخر تک پہنچ جاتی۔

اس نے پھر سوچا اگر میں خرگوش کی جگہ ہوتی تو ضرور وہی کرتی جو اس وقت وہ خرگوش کر رہی ہے۔ کوئی دوسرا چارہ نہیں تھا۔ اُس نے سوچا، دادا کہتے ہیں کہ تم خرگوش ہم آدمیوں سے زیادہ ہوشیار ہو لیکن ہر وقت ایسا نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ ہم انسانوں کی طاقت زیادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تم لوگ پھنس جاتے ہو۔ مثلاً اگر میں تمھاری جگہ ہوتی تو جب تم درختوں کے چاروں طرف ہوا میں اُچھل کود مچا رہی تھی تو میں اوقیانوس کی طرف دوڑ جاتی اور اتنا جلدی اپنا راستہ نہیں بدلتی۔ مادہ خرگوش! تم جانتی ہو ایک بات میں تم کو بتاؤں جو میں نے اپنے دادا سے سیکھی ہے کہ بارہ سنگھوں، بیلوں اور ہم

انسانوں کو ہوا میں دوڑنا بہت مشکل ہے لیکن خرگوشوں اور لومڑیوں کے لیے ایسا نہیں۔ خرگوشوں کو اگر عقل ہوتی تو وہ ہوا کے دوش پر اوقیانوس کے اُس پار تک دوڑ جاتے۔ تمھیں بھی یہ بات بھول گئی کہ تم ہوا کے ساتھ ساتھ دوڑو۔ اگر اسی طرح آگے بڑھتی رہتی تو یقیناً مجھے پیچھے چھوڑ دیتی۔ سچ تو یہ ہے کہ اب مجھ میں سکت نہیں تھی، لیکن تم نے یک بیک کچھ سوچا اور پچھم کی طرف مڑ گئیں اور پھر اوقیانوس کی طرف پیٹھ کر لی اور پھر اِس طرف مڑ گئیں اور اس طرح تم خود بلاوجہ گرفتار ہو گئیں اور اب اس بل میں چھپ کر یہ سوچ رہی ہو کہ خطرہ ٹل گیا ہے۔ اب باہر نکلو، خرگوش باہر نکلو!

تو م نے اپنے آپ کو سنبھالا، اسے نیند آ رہی تھی اور وہ یہ ساری باتیں نیم بیداری میں سوچ رہی تھی۔ موسم کی ناگہانی ٹھنڈک نے اسے جگا دیا تھا۔ ہوا کے ساتھ ساتھ ہلکی ہلکی برف بھی گرنے لگی تھی۔ اس کا بدن اکڑ رہا تھا۔ اس نے خود کو ہلایا ڈلایا تا کہ اس کے سُن ہوتے ہوئے جسم کی اکڑن دُور ہو۔ وہ سوچنے لگی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اونگھنے میں خرگوش اسے دھوکا دے گئی ہو۔ دوبارہ اس نے خرگوش کے چھوٹے چھوٹے پاؤں کے نشانوں کو جو گڈھے کے اِردگرد دِکھائی دے رہے تھے بغور دیکھا۔ ہلکی ہلکی گرتی ہوئی برف، پاؤں کے نشان کو ڈھکتی جا رہی تھی لیکن اس نے اپنی اسکیمو کی قوتِ شامہ سے برف کے نیچے خرگوش کے وجود کا احساس کیا۔ اسے اپنی آنکھوں سے زیادہ اپنی قوّتِ شامہ پر اعتماد تھا اور اسی احساس نے اس کو ہوشیار کر دیا تھا: ''تو م! آمادہ ہو جاؤ۔ خرگوش آہستہ آہستہ کھسکتے ہوئے آگے کو آ رہی ہے''۔ تو م خرگوش کی رہ رہ کر آتی ہوئی مہک سے سمجھ گئی اور اس نے اپنے آپ کو پوری طرح آمادہ کر لیا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ لڑکی نے دیکھا کہ بل کے کنارے کی برف پر چشم زدن میں سفید خرگوش کے کان دِکھائی دیئے۔ اس کے بعد اس کی گلابی تھوتھنی اور پھر دو شہد کے قطرہ جیسی کانپتی ہوئی آنکھیں...

تو م خود بھی نہیں سمجھ پائی کہ کس طرح جال کا بند کھینچے کہ خرگوش آرام سے اس جال میں پھنس جائے۔ تو م دھیرے سے اپنی گھات والی جگہ سے کھسکی۔ خرگوش نے پہلے تو کئی بار جال پر پنجہ مارا اور پھر شکار ہو گئی اور بہت جلد ساکت ہو گئی۔ تو م نے خرگوش کو اُوپر اُٹھایا۔ اسے اپنے چہرہ کے برابر لائی اور بولی: ''سلام دختر! میں تو م ہوں، تمھارا نام کیا ہے؟''

خرگوش نے ڈوبی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ اس کا گلابی تھوتھنا تیز تیز کپکپانے اور دل شدّت سے دھڑکنے لگا۔

''خرگوش! تم ڈر گئی ہو یا تم کو سردی لگ رہی ہے؟ پھر کانپ کیوں رہی ہو؟''

تو م نے خرگوش کی پیٹھ سہلائی۔ خرگوش نے اپنے کان جھکا لیے اور آنکھ بند کر لی۔ اور خود کو چھوڑ دیا کہ چھوٹی لڑکی اسے سہلاتی رہے اور پھر تو م نے اسے چوم لیا۔ مادہ خرگوش ابھی بھی کانپ رہی تھی۔

''ابھی میں تجھے تھیلے میں ڈالتی ہوں، تو جلدی سے گرم ہو جائے گی۔ جتنا دوڑی وہی کافی ہے۔ اب آرام کا وقت آ گیا''۔

خرگوش کو آرام سے ایک مقدس طلسم کی طرح تھیلے میں ڈالا اور سوچنے لگی اگر کوئی دوسرا موقع ہوتا تو آدھی رات تک ناچتی گاتی اور تالیاں بجاتی رہتی۔ اگر کوئی دوسرا موقع ہوتا تو وہ یہیں برف پر کھڑی ہو کر آوازیں نکالتی کہ اس سفید بیابان کے تمام بھیڑیے آواز کو سنتے اور گاؤں کا ہر اسکیمو اور سبھی کتّے جان جاتے کہ تو م نے ایک سفید خرگوش کا شکار کیا ہے۔ مگر اب ان باتوں کا وقت نہیں تھا۔ اس کا دادا انتظار کر رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ اندھیرا ہو جائے خود کو مٹھ تک پہنچانا ہے۔ اگر ان کے دل و دماغ کام کرتے تو دادا کے ساتھ ایک چھوٹا موٹا اسکیموئی جشن منایا جاتا اگر چہ گاؤں کی ڈھول پاس میں نہیں تھی۔ اور نہ ہی جشن کے جلتے ہوئے شعلے اور نہ اسکیموئی لڑکیاں تھیں جو ناچیں اور

خوشیاں منائیں، مگر دادا تو تھا...

برف باری لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی جارہی تھی اور اسے ڈھکے جارہی تھی جس نے اس کے ذہن کو جشن کی خوشی سے پھیر دیا۔ برف باری اتنی شدید ہوگئی کہ نظروں کے سامنے سفید پردہ سا حائل ہونے لگا مگر اسے معلوم تھا کہ اوقیانوس کے پیچھے کی طرف جانا ہے اور پھر راستہ کے خودرو بید کے نزدیک تک پہنچ کر بائیں طرف کو مڑنا ہے...

اس کے پیر ابھی گرم نہیں ہوئے تھے کہ دوبارہ وحشت ناک احساس اس کے ذہن میں آیا۔ وہ ٹھٹک گئی تا کہ وہ ہوا کی مدد سے اپنا راستہ پا جائے لیکن وہ ایسا نہیں کرسکی۔ بھاری برف باری میں صرف چند قدم ہی وہ دیکھ سکتی تھی۔ کئی بار وہ اپنے ہی اِردگرد گھومی۔ یہاں تک کہ وہ مغرب کی سمت بھی بھول گئی۔ وحشت اور نا اُمیدی نے اسے گھیر لیا۔ جہاں تھی وہیں بیٹھ گئی۔ برف کو سونگھا لیکن فضا میں اس گرتی ہوئی برف کے علاوہ کسی دوسری مہک کا احساس نہیں ہوا۔ نا اُمیدی میں برف پر ہاتھ مارا اور ایک تھکے ہوئے زخمی بھیڑیے کی طرح آواز نکالی۔

○

بوڑھے دادا نے اپنے بیتے دِنوں کو یاد کیا جب وہ صرف ایک شکاری چاقو اور ایک نیزہ (جسے اس نے خود ہی گھڑیال کی ہڈّی سے بنایا تھا) کے ساتھ چیختا ہوا بارہ سنگھوں کے گلہ کا پیچھا کرتا اور ان کے ساتھ ساتھ دوڑتا اور جب تک کہ سب سے زیادہ طاقتور اور سب سے زیادہ جوان بارہ سنگھے کو مار نہ گرائے اسے سکون نہیں ملتا تھا۔ وہ راستے جو بید کے درختوں اور قطبی چھوٹے صنوبروں تک لے جاتے تھے وہ انھیں شمالی ہواؤں سے بھی تیز طے کرلیتا تھا تا کہ دریائی شیروں کے شکاریوں کے گروہ سے پیچھے نہ رہ جائے۔ ایک دن وہ تھا کہ قطبی تنومند بھالو کی طرح اِنھیں پاؤں سے سمندر کی برف پر اُچھل کود

کر کے مچھلیوں کا شکار کرتا تھا۔ لیکن اب ان پاؤں میں اتنی جان نہیں تھی کہ وہ بغیر کانپے ہوئے اس کے جسم کا بوجھ اُٹھا سکے اور برف میں چھپے ہوئے اِن راستوں میں (جو اس کے لیے گویا قطب شمال کے آخری سرے تک پھیلا ہوا ہے) اس کی مدد کرے۔

سہ پہر ہوچکی تھی۔ اس کی پوری اُمید بس یہ تھی کہ غروب سے پہلے اپنی پوتی کو ڈھونڈ لے۔

جب تک موسم صاف اور کھلا ہوا تھا، برف نہیں گر رہی تھی، اتنی پریشانی نہیں تھی۔ اپنی سابقہ عادت کے مطابق ایک یا دو بار ہی اپنی مٹھ سے باہر آیا اور اس نے برفیلے بیابان کے مشرقی سرے کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھا اور مٹھ میں واپس مڑ گیا۔ پہلے اس کا دل اتنا پریشان نہ تھا لیکن جب کالے کالے بادل بڑے بڑے بھالو کی شکل میں اکٹھا ہونے لگے اور دھیرے دھیرے برف گرنے لگی تو اس کی پریشانی بھی بغیر کسی آواز کے اس کے سینہ پر برف کے موٹے موٹے دانوں کی طرح قلب کے چاروں طرف جمع ہونے لگی۔ پھر تو وہ بار بار مٹھ کے باہر آتا اور پوری کوشش کرتا کہ برف کے بھاری پردوں کے درمیان کسی بھی مبہم چیز کو جو بید اور صنوبر کے درختوں کے ٹیلے کے درمیان نظر آتی اُسے دیکھ لے اور ہر بار یہ سوچتا کہ اے کاش! وہ خود کو ان درختوں تک پہنچا سکے اور تو م کو ڈھونڈ لائے۔

ہوا کے ساتھ کسی بھیڑیے کی ہنکار جو خوشی کے موقع پر نکالتے ہیں وہ سنائی دی اور وہ اپنی جگہ پر خوف سے جم گیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کی پوتی بھیڑیوں کے جھنڈ میں پھنس گئی ہو۔ اس کے جسم کے روئیں کھڑے ہوگئے۔ اس نے کوشش کی کہ اپنے آپ کو تسلی دے۔ وہ زور زور سے بولنے لگا: ''وہمی ہوگیا ہوں... وہمی ہوگیا ہوں... اپنے آپ ہی بھیڑیے کی آواز سن رہا ہوں۔

یہ بات پہلے سے طے تھی کہ لڑکی شکار پر تنہا جائے گی۔ اس نے اپنے قدم تیزی سے اُٹھائے اور ہزار بار خود پر لعنت بھیجی کہ ایسا کیوں کیا۔ اب اسے بوڑھے کاہن کی

وہ تمام باتیں جو اسکیمو بوڑھوں کے لیے بدشگون ہوا کرتی تھیں، یاد آ گئیں۔ اب تو اسے خود بھی یقین آنے لگا تھا کہ شیطان نے اُس کے جسم میں گھر کرلیا ہے۔ اب اسے اپنی سانسوں اور اپنے افکار میں شیطان کا احساس ہونے لگا تھا۔ وہ تمام دعائیں جو اُسے یاد تھیں زیرِلب دہرائیں تا کہ شیطان کو اپنے سے دُور رکھ سکے۔ اُسے دوبارہ بھیڑیے کی وہی آواز سنائی دی۔ اس دفعہ اُسے یقین تھا کہ اس نے صحیح سنا ہے۔ یہ وہم نہیں ہے۔ یہاں تک کہ وہ اُن بھیڑیوں کی دُوری کا بھی اندازہ لگا سکتا تھا۔ وہ اپنے آپ سے بولا: ''مجھے دوڑنا چاہیے، مجھے بہت تیزی سے دوڑنا چاہیے''۔

اُس نے اپنے پورے ہوش و حواس کو یکجا کیا کہ گرتی ہوئی برف کی دبیز چادر کے درمیان سے صنوبر کے درختوں کی سیاہ پرچھائیوں کو یا اپنی پوتی کے سایہ کو جو اس کی طرف بڑھ رہا ہو دیکھ سکے۔

شکار کے دِنوں میں اُس نے اپنی قوتِ شامہ کو اتنا بڑھا لیا تھا کہ وہ خرگوش اور بارہ سنگھوں کی مہک سونگھ کر اُن کی گذرگاہوں کا پتہ لگا کر پیچھا کرتا تھا۔ آج وہ اسی قوت کو بروے کار لاکر اپنی پوتی کے گذرنے کا پتہ لگانا چاہتا تھا۔ وہ اپنی پوتی کی مہک پہچانتا تھا۔ زیادہ تر اپنی پوتی میں اسے اپنے بیٹے کی مہک آتی تھی۔ جب اسے اپنی گود میں بٹھاتا تو بارہ سنگھے کے گرم دودھ کی طرح مہکتی اور جب اس کے بالوں کو سونگھتا تو موش عنبر کی مہک آتی تھی۔

لیکن یہ مہک تو صرف سفید برہوت، برف اور ہوا کے سوا کسی اور چیز کی نہیں ہے، اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی ناک سن ہوگئی ہے اور قوتِ شامہ کمزور پڑ گئی ہے۔ اُف! ان آنکھوں سے جو اندھیرے میں دیکھ نہیں سکتیں، یہ ناک جو اپنی پوتی کی مہک نہیں پہچان سکتی اور کمزور اور لاغر پیر اب ان سے کوئی اُمید نہیں۔ اگر بھیڑیے اسے ڈھونڈتے ہوئے یہاں تک نہ پہنچ سکے تو سورج کے ڈوبتے ہی رات کی ٹھنڈک میں

قطبی شیطان ظاہر ہو جائیں گے۔ مجھے معلوم ہے جہاں سے بھی میں چلوں گا شیطان میرے پیچھے لگ جائیں گے۔ ایسے مشکل حالات میں کل تک باقی رہنا مشکل ہے۔ کل کا سورج طلوع ہونے سے قبل خون رگوں میں منجمد ہو جائے گا۔

برف میں مرنے کا جیسے ہی خیال آیا اسے فوراً تو م یاد آ گئی۔ ایسا نہ ہو کہ قطبی دیو لڑکپن کے گرم خون کو اس کی پوتی کی رگوں میں جمادیں۔

اپنے قدم اس نے تیز تیز بڑھائے۔ اس وقت جب وہ اپنے جھکے قد سے دوڑ رہا تھا تو وہ ایک بوڑھا اور لاغر بارہ سنگھا لگ رہا تھا۔

دوڑنے سے بدن میں تھوڑی گرمی آئی۔ دوبارہ خون پیر میں دوڑنے لگا۔ کئی بار اُونچی آواز میں پوتی کو پکارا مگر اس کی صدا کا جواب ہواؤں کی شائیں شائیں نے دیا۔

برف کے ایک چھوٹے تودے پر چڑھا اور اوپر گیا مگر ٹیلے سے اُترتے وقت وہ لڑھکا اور اس کا ایک پیر گڈھے میں چلا گیا۔ زیرلب قطبی چوہوں کو گالی دی۔ وہ چاہتا تھا کہ سر اُٹھائے اور اس مہک کو محسوس کرے۔ بڑے شوق سے اس نے ہوا کو سونگھا پھر وہی ہَوا اور برف کی مہک تھی۔ اپنی ناک کو گڈھے کی برف کے نزدیک لے گیا اور جانی پہچانی سی بارہ سنگھے کے گرم اور تازہ دودھ کی مہک محسوس کی۔ اشتیاق میں اپنی ناک برف میں گاڑ دی۔

''اُس کی مہک ہے... اس کی اپنی... میں جانتا ہوں۔ میں اس کی مہک پہچانتا ہوں۔ وہ یہیں تھی... یقیناً یہیں تھی۔ اسی گڈھے اور اسی برف میں۔ اسے یہیں کہیں ہونا چاہیے''۔

''او... تو م... ت... و... م... ت... م...''

دشت کی گھومتی ہوئی ہَوا نے اس کی آواز کو بیابان میں ایسا گھمایا گویا کسی ضعیف کا نالہ خود اسی کی طرف لوٹ گیا ہو۔

"نہیں اب نہیں ہوگا... مجھے بیٹھنا چاہیے۔ اے پیرمرد! زمین پر بیٹھو اور پوتی کے نقشِ قدم کو ڈھونڈو۔ اسی طرح جیسے جوانی میں ڈھونڈتے تھے۔ پسر خورشید! یاد کرو جب برف دیکھتے تھے تو کہتے تھے کہ کل یہاں سے خرگوش گذرا ہے۔ یہاں کوئی آواز سنی ہے اور پھر مڑ کر بھاگ گئی۔ یہاں پر اس نے جست لگائی، یہاں عجلت کی اور چلی گئی... پسر خورشید! یاد کرو کہ جب تم بیٹھے ہوئے برف کو تکتے اور کہتے تھے کہ یہ جوان خرگوش کے پیر کا نشان ہے اور وہ بوڑھے خرگوش کا... ابھی بھی پسر خورشید تم یہ کام کرسکتے ہو کہ اپنی ننھی پوتی کے نقشِ قدم کو تلاش کرو"۔

گھٹنوں کے بَل زمین پر بیٹھا، برف کو سونگھا اور آگے بڑھ گیا۔ گھٹنے اکڑ گئے تھے۔ اُف! اب یہ بوڑھا وہ پسر خورشید نہیں رہا۔ اس طرح بہت دُور تک نہیں چل سکا۔ اب تو میرے پاؤں جمے جارہے ہیں اور میں یہیں رہ جاؤں گا۔

فوراً ہی برف کے اس گہرے پردے کے پیچھے اسے صنوبر کے چھوٹے چھوٹے خاکستری درخت سایہ کی طرح نظر آئے۔

صنوبر کے درختوں کی طرف راستہ چلتے ہوئے ہَوا اس کو ستا رہی تھی۔ اب وہ اپنی پوتی کی مہک محسوس کرسکتا تھا۔ دوبارہ آواز لگائی: "تتوم... ت... و... م..." اور پھر کان لگایا۔ دشت میں زبردست سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اس نے کوشش کی کہ اپنی پوتی کی مہک قطبی گھاسوں اور برف سے ڈھکے صنوبر کی خوشبو کے درمیان پہچان سکے۔

اب اس نے صنوبر کے درختوں کے کنارے کنارے چکر لگایا تھا کہ برفیلے موسم کے اس اندھیرے میں صنوبر کے درختوں سے تھوڑی دُوری پر ایک سیاہ پرچھائیں محسوس کی۔ اس نے کھڑا ہونا چاہا مگر نہ ہوسکا۔ گھٹنے اکڑ گئے تھے، اور ڈھیلے نہیں ہورہے تھے۔ اسی طرح بیٹھ کر اپنے کو آگے گھسیٹا... برف کے درمیان وہ اپنی پوتی کی گندمی کھال کو پہچان سکتا تھا۔ ہانپتے ہوئے اپنے آپ کو وہاں پہنچا ہی دیا۔

برف نے لڑکی کے بدن کو ڈھک دیا تھا۔ اس نے برف جلدی جلدی ہٹائی۔ لڑکی کا سر اپنے زانو پر رکھا اور کئی بار اسے پکارا۔ اس کے دستانے اُتارے اور تیز تیز اس کے ہاتھوں اور چہرے کو مَلنے لگا۔ تو م نے آنکھیں کھولیں۔ اس کے ہونٹ ہلے اور پھر بند ہوگئے۔

"تو م تم زندہ ہو... تم زندہ ہو... تو م تم ابھی بچ سکتی ہو"۔ پہلا کام یہ کرنا ہے کہ کچھ آگ جلائی جائے۔ سوچنے لگا صنوبر کی گیلی لکڑیاں مشکل سے آگ پکڑتی ہیں۔ اُسے دیر نہیں کرنی چاہیے۔ اسے لے کر فوراً مٹھ میں پہنچنا چاہیے۔ لڑکی کو پیٹھ پر لادا اور چل پڑا۔ جب وہ گاؤں میں رہتا تھا اور بچی کو کود میں لیتا تھا اُس کے مقابلہ میں اب وہ بہت بھاری لگ رہی تھی۔

"ابھی میں اتنا بوڑھا نہیں ہوا ہوں کہ اپنی پوتی کو نہ اُٹھا سکوں"۔ یکبارگی اُس نے جوانی کا احساس کیا تاکہ وہ مٹھ تک بغیر رُکے دوڑ سکے۔

دوڑنا شروع کیا۔ یہ خود اس کے لیے بھی بہتر ہے۔ حرکت سے خون رگوں میں دوڑتا ہے۔

ہَوا سے اُس کے چہرے پر برف کی چوٹ پڑ رہی تھی۔ راستہ چلنا مشکل ہورہا تھا۔ شروع سے آخر تک جتنی دُعائیں اسے یاد تھیں سب پڑھ ڈالیں۔ شیطانوں پر بلند آواز سے لعنت بھیجی تاکہ اس کی پوتی کا پیچھا چھوڑ دیں۔ قطبی دیوؤں کو برا بھلا کہا تاکہ اس کے راستے سے ہٹ جائیں۔ ساتھ ہی ہزارہا اپنے پیروں کو گالی دی جن میں چلنے کی طاقت نہیں تھی اور سینہ کو جسے سانس لینا بھاری تھا۔

اب سورج ڈوب چکا تھا۔ اس بوڑھے کی سانس رُک رہی تھی۔ رات کی ہَوا میں سردی کی جلن شدید تر ہوتی جارہی تھی۔ اس کی انگلیوں کے سرے گویا برف ہوگئے تھے۔ ہاتھ اکڑ گئے اور ناک کا سرا تو جیسے جم ہی گیا تھا۔

اچانک اس کا پیر کانپا۔ جسم سنبھل نہ سکا اور منہ کے بَل گر پڑا۔ پوتی کو دیکھا تو اس کی ناک کی نوک پر پیلا دھبّہ نظر آیا۔ وہ اس نشان کا مطلب سمجھ گیا۔ لیکن وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ چند پیلے دھبوں کی وجہ سے وہ امید کی ڈور ہاتھ سے چھوڑ دے۔

"نہیں، یہ سب صرف اس وجہ سے ہے کہ میں بوڑھا ہوگیا ہوں۔ دماغ ٹھیک سے سوچتا نہیں، آنکھیں ٹھیک سے دیکھتیں نہیں۔ یہ سب تو ہے لیکن اگر چلنے میں دیر ہوئی تو برف جما دے گی... چاہیے کہ کسی طرح آگ کا انتظام کروں... آگ!"

مضحکہ خیز ایک تلخ ہنسی اُبھری۔ اس برف اور سردی میں اس کی جیب میں صرف ایک چھوٹی سی دیا سلائی کی ڈبیہ۔

اپنی آنکھوں کو ناامیدی سے تیرایا۔ اس کی نظر لڑکی کے جسم پر پہنی ہوئی لومڑی کی کھال پر پڑی۔ اسے پتہ تھا کہ لومڑی کے روئیں بہت تیز آگ پکڑتے ہیں۔ فوراً اسے اُتارا اور اپنے روپہلے لبادے کو اسے اُڑھا دیا۔ اپنے بے جان ہاتھوں سے ماچس کی ڈبیہ جیب سے نکالی اور اپنے شکاری چاقو کی مدد سے اس کے کئی ٹکڑے کیے اور ماچس سے جلایا۔ بال تیزی سے جلنے لگے۔ دوبارہ اس نے اس کے دستانے اُتارے، اس کے ہاتھوں کو آگ پر رگڑنے لگا۔ دوسرا ٹکڑا بھی آگ میں ڈالا۔ اس بار اس نے اس کے جوتے بھی اُتارے اور اس کے پیروں کو ملنے لگا۔ اپنے ہاتھوں کو گرم کیا اور اس طرح اس کے پیر کو گرم کیا۔ لڑکی کی ناک اور چہرے کو تیز تیز رگڑا۔ لڑکی نے آنکھیں کھولیں اور پھر بند کرلیں۔

دوبارہ کھال سے ایک ٹکڑا کاٹا اور آگ بھڑکائی۔ ارے اس طرح یہاں بیٹھنا نہیں چاہیے بلکہ چلنا چاہیے۔ ایسے تو لومڑی کی کھال جلدی ہی ختم ہوجائے گی۔ برف زدگی کے اثرات دوبارہ نظر آنے لگے۔ پھر سے اُٹھا، اسی جوانی کے غرور کے ساتھ لڑکی کو پیٹھ پر لادا اور اُس مٹھ کی طرف چل پڑا جو زیادہ دُور نہ تھی، جس میں گھڑیال کی چربی کا

چراغ جل رہا تھا اور ان کا منتظر تھا۔

پیر مرد اپنے کو دھوکا دے رہا تھا۔ اسے پتہ تھا کہ مٹھ تک پہنچنے میں آدھے دن سے زیادہ وقت درکار ہے۔ لیکن اپنے دل میں اس بات پر خوشی محسوس کررہا تھا کہ مٹھ نزدیک ہے۔ اتنا نزدیک کہ اگر بدن سیدھا ہوتا تو چند لمبے ڈگ بھرتا اور وہاں تک پہنچ جاتا۔

کھڑے ہونے کی کوشش کی، اپنے ہاتھوں کو برف پر رکھا کہ وہ سیدھا ہوسکے مگر اس کے ہاتھ بے حس تھے۔ زمین کے اس فاصلے کا اندازہ نہ کرسکے۔ ہاتھوں کی ہڈّیوں میں وحشت ناک درد ہوا اور زمین پر قلابازی کھا گیا۔ آگ بھی بجھ گئی۔ چاہا کہ تھوڑی سی کھال کاٹے لیکن جیسے ہاتھ میں اُنگلیاں ہی نہ ہوں۔ چاقو اُٹھانا چاہا تو گویا اس کے ہاتھ اور انگلیوں کے درمیان کوئی رشتہ ہی نہ ہو۔ پیروں کی مدد لی۔ کھال کو پیر سے آگے کیا، اور دھیرے دھیرے جو کچھ بچا تھا اسے آگ میں ڈھکیل دیا۔ فوراً ہی آرام دہ نارنجی شعلہ بھڑکا۔ لبادے کے بغیر کانپتے ہوئے جسم کو راحت ملی اور بوڑھے کو نیند آنے لگی۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اگر وہ سوگیا تو زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہ سکتا۔ مگر نیند اس کا پیچھا نہیں چھوڑ رہی تھی۔ اس کا جی چاہا کہ سوجائے۔ اُسی وقت بھیڑیے کی صدا سنی۔ بہت ہی نزدیک کے فاصلہ پر بھیڑیوں کے ہونکارنے کی آوازیں سنائی دیں۔ شاید اُن کا غول انھیں دونوں کی طرف آرہا تھا۔ پھر وہ آوازیں دُور ہوگئیں اور رفتہ رفتہ دُور سے دُورتر ہوتی گئیں۔ یہاں تک کہ یہ آوازیں اسکیموئی بے قرار کتّوں کی آہستہ بھونک میں تبدیل ہوگئیں۔ سوچا کیا فرق پڑتا ہے۔ موت تو موت ہی ہے، کیا وحشت ناک اور کیا آرام دہ۔ جب موت برحق ہے تو پھر کیسے مَرے اور کس جانور کا لقمہ بنے کوئی فرق نہیں۔

اپنی پوتی کی بغل میں لیٹ گیا تاکہ اپنے بدن کی گرمی سے کچھ دیر تک پوتی کو زندہ رکھ سکے۔ اپنے برف زدہ ہاتھوں سے بہ ہزار دقت اسے اپنی بغل میں کھینچا۔ ٹھیک

اسی طرح جیسے مرغی اپنے بچوں کو پروں کے نیچے لے لیتی ہے۔ سمٹی ہوئی لڑکی کو اپنی کود میں کھینچا اور اپنی بہترین یادوں کی ہلکی ہلکی دُھند میں گم ہوگیا اور پھر دُنیا و مافیہا سے بے خبر کردینے والی نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

وہ محسوس کررہا تھا کہ قطبی سمندر کی برف پر تیرتے ہوئے برف کے ایک تودہ سے دوسرے تودہ پر اُڑ رہا ہے۔ موسم بہار کا سورج بنفشئی نور کے ساتھ چمک رہا ہے۔ کف آلود لہریں اور گلیشیر کے بڑے بڑے ٹکڑے اور ان پر تیرتی ہوئی بنفشئی شعاعیں آنکھوں کو خیرہ کررہی ہے۔

اس کے بعد اس نے دیکھا کہ ایک لومڑی کے بدن میں آگ لگی ہوئی ہے۔ نارنجی شعلے بھڑک رہے ہیں اور وہ صنوبر کے درختوں کے درمیان بھاگ رہی ہے۔ اس نے دیکھا کہ وہ خود ایک بچہ ہے اور ایک سفید خرگوش کا پیچھا کررہا ہے۔ خود وہ اسکیموئی گانا گارہا ہے جسے برسوں پہلے بھول چکا تھا۔ بوڑھے نے لڑکی کو اپنی آغوش میں بھینچ لیا اور اس کے کانوں میں اپنے برف زدہ ہونٹوں سے ہذیانی انداز میں گانے لگا:

"میں جارہا ہوں، میں جارہا ہوں
صنوبر کے اُونچے درختوں کے اُوپر
یہاں کے درختوں کو چھوڑوں میں پیچھے
اور اُوپر سے جھیلوں کا کرلوں نظارہ
ہوں ساتھی میرے تیز رفتار بادل
جو جھیلوں کی جانب روانہ ہوئے ہیں
کہ اے کاش اُڑتا میں کوّوں کی مانند
مگر بال و شہپر نہیں پاس میرے
نہیں ہیں قدم میرے بطخ کے جیسے

جوانوں کی خواہش ہوا کی طرح ہے
جہاں بھی سنا اور جس سے سنا
بہت دُور، بے انتہا
اور وہ طول امل"

بڑی مشکل سے آنکھیں کھولیں، برفیلی ہواؤں کی سوزش اپنے چہرے پر محسوس کی۔ پھر اسے ایسا لگا جیسے سنہری چڑیوں کے بازوؤں پر بیٹھا ہوا بچپن کی نیلی پرسکون نغموں والی جھیل کی طرف جارہا ہے۔ اس کے بعد اس نے برف والی گاڑی دیکھی جس پر وہ خود بیٹھا ہے۔ پھر دیکھا کہ اسے اس کا لڑکا کھینچ رہا ہے۔ عدم یقین سے اس نے اپنی آنکھوں کو گھمایا، اس کی پوتی اسی طرح اس کی بغل میں اسی گاڑی پر سوار ہے۔ اس کے بعد اس نے گاؤں کی مٹھ کے برفیلے ٹیلوں کو اور ان کی نارنجی چوٹیوں کو پہچان لیا... پھر آنکھیں بند کرلیں اور اس کے ذہن میں پھر وہی پرانا نغمہ گونجنے لگا اور وہ اپنی پوتی کی بغل میں سوگیا:

چلا جارہا ہوں، چلا جارہا ہوں
صنوبر کے اُونچے درختوں کے اوپر
کہ میں کرلوں نظارہ اس جھیل کا...

○○

میرے بابا اور سنیما کے شعبدے

''میرے بابا اور سنیما کے شعبدے'' کوئی کہانی نہیں ہے، مگر ایک کہانی ہے جس کے چار حصے ہیں۔ ''ارسکین کالدول'' کے قصّہ کی طرح، اس پورے قصّے میں مَیں ہوں، میرے بابا، میری ممی اور چند دوسرے لوگ جن کی زیادہ اہمیت نہیں ہے۔

اہم ہے تو بابا جان کا فلمی عشق۔ وہ تمام فلمی دھوکے فریب جو انھوں نے فلموں میں دیکھے تھے اپنی ذہانت سے ان سب پر اپنی زندگی میں تجربہ کیا ہے، وہ بھی کس کی مدد سے؟ میری مدد سے! یہی! میں نے کہا اور یہی کہوں گا!

پہلا حصّہ

بابا جان پیسہ اکٹھا کرنے کی فکر میں

میرے بابا جان خود فریبِ زمانہ ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ بابا جان جنھیں میں پہچانتا ہوں اگر بے کار نہ ہوتے اور ان کے ہاتھ میں پیسہ ہوتا تو یقیناً ایک بہت اچھے سائنس داں اور حسابی ہوتے، کسی نہ کسی کارآمد چیز کے موجد ہوتے، لیکن اس کے برعکس میری ماں انھیں ایک بے مصرف انسان سمجھتی ہیں۔ ان کے پیشِ نظر وہ ہر کام بگاڑ دیں گے، پیسہ برباد کریں گے اور غصّہ دلائیں گے۔

اسی لیے وہ اپنی چاروں آنکھیں بابا پر لگائے رکھتی ہیں۔ اگرچہ بابا کے اندر ہزار طرح کی صلاحیت ہے لیکن سامان برباد کرنے میں بھی ماہر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ماں کبھی بابا جان کی کارگزاری سے غافل نہیں ہوئیں۔ ان کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ انھوں نے مجھے تاکید کر رکھی تھی کہ جب میں سائیکل کی گھنٹی تین بار اور اسی کے ساتھ ایک بلبل نما سیٹی بجاؤں تو ہر کام چھوڑ کر میرے پاس آنا اور یہ سمجھ جانا کہ بابا نے کوئی نئی بات سوچی ہے۔ اگر دیر سے آئے تو پھر میرے دماغ سے بات نکل جائے گی اور دوسرے کاموں میں لگ جاؤں گا۔

یہ سوچ ہی رہا تھا کہ بابا کی سائیکل کی تین بار ٹن...ٹن...ٹن اور ایک لمبی بلبل جیسی آواز سنائی دی۔ میں نے قلم پھینکا اور کود پڑا۔ میری ماں باورچی خانہ میں کھانا پکا رہی تھیں وہیں سے پکاریں: ''مسعود! کہاں؟ اگر تمھارے بابا جان ہیں تو ان سے کہو کہ اوپر آئیں کچھ کام ہے مجھے۔ طرح طرح کے ہوائی منصوبے بغیر سوچے سمجھے منصوبے''۔

میں نے کہا: ''ٹھیک ہے ماں'' گلی میں دوڑ گیا۔ چہرے سے ظاہر تھا کہ بابا جان نے کوئی نیا اور بہت عجلت والا پلان بنایا ہے۔ اسی طرح سائیکل پر بیٹھے ہوئے بولے: ''آ گئے؟'' میں جاننا چاہتا ہوں کہ تم اس عمر کو پہنچ گئے، کیا تم کو معلوم ہے کہ سنیما کیا ہے؟''

میں نے کہا نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ اکھاڑے وغیرہ کی طرح کوئی چیز ہے جسے سب لوگ پیسہ دے کر دیکھتے ہیں۔

بولے: ''فضول باتیں نہ کرو بیٹا! کسی کے سامنے نہ کہنا، آبرو چلی جائے گی۔ لوگ یہ کہیں گے کہ باپ کی بے توجہی ہے کہ آج تک سنیما بھی نہیں جانتا''۔

میں نے کہا: ''ٹھیک ہے، کسی سے نہیں کہوں گا''۔

بولے: ''ابھی تجھے بتاتا ہوں کہ سنیما کیا ہے... تمھاری گلک میں کتنا ہے''۔

میں نے پوچھا: ''میری گلک کا پیسہ کس لیے چاہیے؟''

بولے: ''شہر کے ہال میں فلم لگی ہے۔ چاہتا ہوں وہاں چلوں''۔

میں نے کہا: ''ماں اجازت نہیں دیں گی''۔

بولے: ''ان سب کاموں میں ماں کا کیا مطلب؟ اپنا پیسہ ہے اپنے باپ کو قرض دے رہے ہو۔ تم کو بھی تجربہ ہوگا۔ بعد میں تم کو واپس کردوں گا''۔

بابا جان سائیکل سے نیچے اُترے کچھ سوچا اور بولے: ''پریشان نہ ہو۔ فیصلہ مجھ پر چھوڑو... بولو میں دیکھوں بیٹا کہ تمھاری گلک میں کتنا ہے؟''

میں نے کہا: ''میرے خیال میں بیس تومان ہوگا''۔

بولے: ''بیس تومان؟'' سائیکل کی گدی پر ہاتھ ایسے مارا کہ بس گرہی جائے۔ ''ٹکٹ تو ۵۱ تومان کا ہے۔ پانچ تومان میں آدمی آجیل (بھنے ہوئے مغزیات) سینڈوچ وغیرہ کھائے گا تو پھر تمھارے لیے کیا بچے گا بیٹا''۔

میں نے کہا: ''پھر ٹھیک ہے جایئے ماں سے پیسے لے لیجیے''۔

انھوں نے کہا: ''فضول باتیں نہ کرو۔ تم سے سودا کررہے ہیں، پیسہ تمھارا اور کام میرا۔ تم کو پتہ نہیں ہے کہ سنیما کیا ہے؟ اسے کیسے دیکھتے ہیں۔ میں تو تمھاری خاطر جارہا ہوں۔ جاکر وہاں اندھیرے میں دو گھنٹہ ساکت بیٹھا پردہ کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہوں گا۔ اپنے کو زحمت میں ڈالوں گا پھر آکر سب 'الف' سے 'ی' تک تم کو بتاؤں گا۔ اگر ٹھیک ہے تو معاملہ طے!''

بابا جان نے بہت پیار سے مجھے چوما اور بولے: ''ٹھیک ہے دوڑ کر جاؤ اور گلک لاؤ، ماں کو کانوں کان خبر نہ ہو!''

دوڑتا ہوا کمرے میں گیا، چپکے سے الماری میں سے اپنی گلک اُٹھائی اور دبے پاؤں گلی میں آیا۔ بابا جان نے جب میرے ہاتھ میں گلک دیکھی تو ان کا چہرہ پھول کی

طرح کھل اٹھا۔ میرے ہاتھ سے گلک چھین لی اور وہیں دریچے کے پتھر پر پٹک دیا۔ بیچاری کے ہزار ٹکڑے ہوگئے اور سکّے گلی میں بکھر گئے۔ ہم دونوں سکّے چننے لگے۔ بابا جان سکّہ چنتے جارہے تھے اور زور زور سے گن رہے تھے۔ بارہ تک ہی گنا تھا کہ دروازہ کھلا۔ ماں کی صورت ہاتھوں میں چادر لیے ظاہر ہوئی۔ ''حشمت میری سمجھ میں نہیں آتا، ذرا میری نظر جھپکی اور تم بچے کو دھوکہ دینے لگے۔ جو کچھ تم نے لیا ہے دو''۔

بابا جان نے بغیر چون و چرا کے سب ماں کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

ماں نے دروازہ بند کیا اور اندر چلی گئیں۔ بابا نے غصّہ سے دو مرتبہ سائیکل کی گھنٹی بجائی اور بولے: ''وہ سوچتی ہیں کہ میں نے ان فلموں سے ہزار طرح کے دھوکے فریب سیکھ رکھے ہیں اور بغیر کسی زحمت کے پیسہ حاصل کرلوں گا اور فلم دیکھنے چلا جاؤں گا اگر تم اپنے بابا کے ساتھ ہو تو بیٹا پھر یہ معاملہ طے!''

دوسرا حصّہ

میرے بابا شیشہ کاٹنے والے بن گئے

بابا جان نے حشمت لوہار کو دو سلاخیں دیں کہ وہ اُسے سائیکل کے کیریئر سے جڑ دے، عموجان نے اسٹور میں تین نئے شیشے رکھے تھے، بابا نے اسے کیریئر کی انھیں سلاخوں پر باندھا تھا کہ اتنے میں مجھے دیکھ لیا۔ بولے: ''کھڑے کیوں ہو؟ کیا تم نہیں چاہتے کہ ہم لوگ اپنا کام شروع کریں''۔

میں نے پوچھا: ''کتنا پیسہ میرا اور کتنا آپ کا''۔

بولے: ''اوپر لے چلو دیکھتے ہیں۔ ابھی تمھاری ماں حاضر ہوجائیں گی''۔

سائیکل پر اُچھل کر بیٹھ گیا اور بولا: ''میرا حصّہ کب دیں گے''۔

بولے: ''وہی پہلے والی بات تم کو فلم دکھانے لے جاؤں گا''۔

میں نے کہا: ''آپ نے تو کہا تھا ہر شیشہ پر ۲۰ تومان ملے گا۔تین شیشہ ہے تو ۶۰ تومان ہوئے''۔

وہ بولے: ''ہمارے حساب سے آدھا آدھا''۔

میں نے کہا: ''ٹھیک قبول''۔

انھوں نے کہا: ''اب جاؤ پتھر پھینکنے کی پریکٹس بھی کرو گے یا نہیں''۔

انھوں نے کہا: ''سو بار تم سے کہا کہ ہر کام محنت مانگتا ہے۔ پتھر مارنے کو ہلکا مت سمجھو''۔

میں نے کہا: ''بابا جان! اگر میں آپ کا بیٹا ہوں تو مجھے معلوم ہے کہ پتھر کیسے پھینکوں''۔

بولے: ''شاباش! اچھا لگا کہ تو ماں کو نہیں پڑا ہے۔ تجھ میں میری والی ہشیاری ہے''۔

دو چار گلیاں پار کی تھیں کہ بابا جان نے سائیکل روکی اور کہا: ''ٹھیک ہے میں اس جگہ کھڑا ہوں، تم جاؤ پلان کے مطابق اپنا کام پورا کرو''۔

بابا کی چال یہ تھی کہ میں جاؤں اور تین گھروں کی کھڑکیاں توڑ دوں پھر بابا وہاں ''شیشہ والا، شیشہ والا'' آواز لگاتے ہوئے پہنچیں اور ٹوٹی ہوئی کھڑکی والوں سے شیشہ لگا کر پیسے بنالیں۔

میں نے کہا: ''بابا! اگر میرا پلان کامیاب نہیں ہوا تو؟''

انھوں نے کہا: ''بھولا بچہ! اپنے باپ کو معمولی آدمی سمجھتا ہے۔ میری چالیں کبھی رد نہیں ہوتیں۔ میں نے خود فلم میں دیکھا ہے کہ ایک آوارہ موالی نے اس ترکیب سے بہت پیسے جمع کیے۔ اب زیادہ باتیں نہ کرو جاؤ۔ چل پڑو!''

دو ڈھیلے میں نے اپنی جیب سے نکالے اور بغل والی گلی میں جس شیشہ کو بابا نے بتایا تھا اچھے سے نشانہ لگایا اور پوری طاقت سے کھڑکی کی طرف پھینکا۔ اور اپنے کان پر ہاتھ رکھا۔ شیشہ ٹوٹنے کی آواز سنتے ہی بھاگ کھڑا ہوا۔

ہم لوگوں کے درمیان طے تھا کہ میں وہیں، بغل والی گلی میں اس وقت تک منتظر رہوں جب تک کہ بابا شیشہ وغیرہ لگا کر پیسہ وصول کر کے میرے پاس واپس نہ آجائیں تاکہ وقت ضائع کیے بغیر بعد والے مکان کے شیشہ پر پہنچ جائیں۔

تھوڑی دیر انتظار کیا۔ میں نے دیکھا کچھ خیر خبر نہیں۔ پہلی آواز میں نے بابا کی ہی سنی، ہانک لگا رہے تھے: ''آ... شیشہ کا ٹنے والا... اچھے شیشہ والا۔ فرانسیسی، جرمنی اور اٹلی کے شیشے لگانے والا''۔ لیکن وہاں کوئی خبر نہیں۔ گلی میں آہستہ سے داخل ہوا۔ جھانک کر دیکھا بابا جان اسی گھر کے سامنے سائیکل کا پہیہ اوپر کو اٹھائے ہوئے دوسری منزل کے سامنے آواز لگا رہے ہیں ''شیشہ کا ٹنے والا''۔ میں آہستہ آہستہ آگے بڑھا یہاں تک کہ انھوں نے مجھے دیکھ لیا، اشارہ سے مجھے بلایا۔

میں ان کے پاس پہنچا، بولے: ''جاؤ گھنٹی بجاؤ۔ لگتا ہے کہ کوئی ہے نہیں۔ اگر ہوئے اور انھوں نے میرا گلا پکڑ لیا تو کیا ہوگا۔ ہم لوگ ان کی گردن پکڑ لیں گے اندھیر نگری نہیں ہے''۔

جب دیکھا کہ میں ان کی نہیں سن رہا ہوں تو خود ہی چل پڑے اور جا کر اس گھر کی گھنٹی بجائی۔ منہ لٹکا کر بولے کہ کچھ خبر نہیں۔ چانس کی بات ہے۔ چلو دوسری گلی میں چلتے ہیں۔ اس گلی میں تو کوا بھی پَر نہیں مارتا۔

اگلی گلی کے لیے یہ طے پایا کہ میں اکیلے جا کر گھنٹی بجاؤں۔ اگر اندر سے آواز آئے تو شیشہ توڑوں ورنہ بقول بابا فالتو ڈھیلے کیوں برباد کیے جائیں اور وقت بھی بچے گا۔ اس طرح ہم لوگ نائٹ شو فلم بھی دیکھ لیں گے۔

میں ایک ایسے گھر کو کھٹکھٹانے ہی والا تھا جس کا دروازہ لکڑی کا تھا۔ بابا جان بہت حسابی تھے بولے: ''یہ بھوکے ننگوں کا گھر ہے۔ یہ شیشہ کاٹنے والوں کو پیسہ نہیں دیں گے۔ بغل والے مکان کو دیکھو جو سنگ مرمر کا بنا ہوا ہے۔ تو نے کیا دنیا دیکھی ہے؟ تینوں شیشہ ہی گنوادوں''۔

میں نے گھنٹی بجائی۔ ایک بھاری آواز والے مرد نے کہا: ''کون ہے؟'' سچ، میں اس کی آواز سے ڈر گیا۔ گھبراہٹ میں تینوں ڈھیلا اکٹھا ان کی کھڑکی پر دے مارا اور خود بھاگ گیا۔ چند منٹ کے بعد شور غوغا شروع ہوا۔

بابا جان نے سکھایا تھا کہ اگر شور شغب سنائی دے تو وہاں پر نظر نہ آنا کسی کی بھی کھڑکی کا کوئی شیشہ یوں ہی توڑ دے گا تو چیخ پکار تو مچے گی ہی۔ آہستہ آہستہ شور ختم ہوا... میں دبے پاؤں سے گلی میں پہنچا۔ میں نے دیکھا میرے بابا نہیں ہیں مگر ان کی سائیکل اسی دیوار سے لگی کھڑی ہے۔ میں مطمئن ہوگیا کہ ہم لوگ دھوکے دھڑی میں کامیاب ہوگئے اور بابا اپنے دھندے پر لگ گئے۔ میں اطمینان سے ایک چبوترے پر بیٹھ کر ان کا انتظار کرنے لگا۔ پانچ منٹ بھی نہیں گزرا تھا کہ دیکھا بابا جان چلے آرہے ہیں۔ ایک بھی شیشہ کیریئر پر نہیں تھا۔ میں نے کہا: ''میرا اندازہ صحیح نکلا اب آپ کو اپنے بیٹے پر ناز ہے کہ نہیں؟''

بابا جان بہت ہی خستہ کوفتہ نظر آرہے تھے۔ بولے: ''ہاں بس شامت تھی، تینوں مفت میں لگا کر آرہا ہوں۔ تم نے پولیس چوکی کے افسر کے گھر پر مارا تھا''۔

میں مبہوت ہوگیا، بولا: ''ٹھیک ہے مگر اس کو کیسے پتہ چلا کہ تمھارے بیٹے نے یہ کام کیا ہے۔ شاید کسی دوسرے کے لڑکے نے یہ کیا ہو؟''

وہ بولے: ''اتفاق سے اس نے بھی وہ فلم دیکھی تھی فوراً ہی مجھے پکڑلیا''۔

میں نے کہا: ''بابا جان اب ہم لوگ کیا کام کریں۔ یعنی فلم کی اُمید چھوڑ دیں؟''

بولے: ''سنیما کی فکر؟ آؤ سائیکل پر بیٹھو کوئی بے ضرر دھوکہ تلاش کریں''۔

تیسرا حصّہ

بابا جان سائیکل کرائے پر دیتے ہیں

بابا جان اور عمو جان کے درمیان یہ طے پایا کہ بابا ان کا فریج بنانے میں ان کی مدد کریں گے۔ میں نے کہا: ''بابا جان آپ کی شہرت کتنی زیادہ ہوگئی ہے کہ عمو جان کو بھی خبر ہوگئی''۔

بابا جان نے کہا: ''جس وقت سے میری شہرت تمھاری ماں کے کان میں پہنچے گی اسی وقت سے حساب کتاب شروع ہوجائے گا۔ تم گھر جاؤ دیکھو تمھاری ماں کام کاج کررہی ہوں گی، جاکر ان کی مدد کرو۔ جب میں آؤں تو میرے آگے پیچھے مت گھومنا۔ میں چاہتا ہوں کہ میرا ذہن آزاد رہے۔ کچھ نئی بات سوچ سکوں''۔

میں نے کہا: ''اتنا لمبا راستہ پیدل جاؤں! کم از کم سڑک تک تو مجھے چھوڑ دیجیے، باقی میں پیدل چلا جاؤں گا''۔

بولے: ''صرف سڑک تک۔ یہ سائیکل بھی میری اور تمھاری طرح جان رکھتی ہے۔ اس سے بھی زیادہ کام نہیں لے سکتے۔ رِم پھینک دیتا ہے''۔

میں اس پر سوار ہوگیا اور خوشی میں ایک گھنٹی بجائی۔ بابا بولے: ''فضول کیوں گھنٹی بجارہا ہے؟ سارا پیسہ اسی گھنٹی میں خرچ ہوگیا اور تم یوں ہی بجائے جارہے ہو''۔

میں نے کہا: ''گھنٹی سستی ہے۔ آقا اسمال (اسماعیل) کی سائیکل میں گھنٹی ہی گھنٹی ہے۔ کرایہ بھی سستا ہے''۔

بابا کچھ نہیں بولے۔ لیکن یکبارگی جیسے ان کے ذہن میں بجلی سی کوندی، ایسی بریک لگائی کہ عنقریب تھا کہ میں گر جاؤں۔

میں نے کہا: ''بابا کیا بات ہے میں گر پڑوں!''

بولے: ''چپ رہو نیچے اُترو، سوچنے دو۔ ایک بہت اچھی ترکیب دماغ میں آئی ہے۔ اس میں کوئی دردسر بھی نہیں ہے۔ پیسہ ہی پیسہ ہے۔ ایک گھنٹہ کام کرلیں بس پانچوں انگلی گھی میں۔ سوبار سنیما جاسکتے ہیں۔ سینڈوچ اور کدو کا بیج اُڑا سکتے ہیں''۔

''کون سی تجویز ہے بابا جان؟''

بولے: ''اس میں دھوکہ فریب نہیں ہے۔ صحیح سلامت کام ہے۔ بہت پہلے ایک فلم میں دیکھا تھا۔ مجھے دیکھو میں اس فلم کو بھول ہی گیا تھا۔ چلو کہیں ایسی جگہ چلیں جہاں بچوں کو سائیکل سواری کا شوق ہو''۔

میری ڈیوٹی یہ تھی کہ میں بابا کی سائیکل کا پروپیگنڈا کروں اور بچوں کو بابا کے پاس لاؤں کہ وہ کرایہ پر سائیکل لیں۔ قیمت بابا نے طے کرلی تھی۔ گلی کا ایک چکر ایک سواری ایک تومان، ڈبل سواری، گلی کا ایک چکر دو تومان، گھنٹی دو قرن۔ اگر کوئی خود گلی میں آمد و رفت دونوں کرے گا تو دو تومان۔

میں نے کہا: ''بابا جان افسوس ہے کہ یہ بات اب تک میرے دماغ میں نہیں آئی، ورنہ اب تک اسی پیسہ میں موٹر خرید لیتے''۔

انھوں نے کہا: ''مجھ سے ایک نصیحت سن لو۔ کسی بھی اہم کام کو کرنے میں دیر نہیں ہوتی بڑے بڑے کروڑپتیوں نے اسی طرح کام کیا ہے''۔

میں نے خوب اشتہار کیا۔ ایک گھنٹہ بھی نہیں گزرا کہ بارہ تومان حاصل ہوگئے صرف گھنٹی بجانے میں لڑکے بحث کررہے تھے۔ کہہ رہے تھے مہنگی ہے۔ کہہ رہے تھے کہ دو قران میں دو گھنٹی، مگر بابا نہیں مانے بولے کہ تہران کے حساب سے تین قران سستی ہے۔

دو چھوٹے بچے ابھی انتظار میں تھے کہ ایک جوان کالی چمڑے کی جیکٹ پہنے ہوئے آیا اور بولا: ''کرایہ سستا کرو تین چکر لگاؤں گا''۔ مجھے نہیں معلوم میں کیوں اس کی شکل

سے ہی ڈر گیا۔ بابا سے میں نے چپکے سے کہا: ''چھوڑیئے اس کو مت دیجیے سائیکل توڑ پھوڑ دے گا''۔

بابا بھی تذبذب میں تھے کہ پتہ نہیں کرایہ بھی دے گا کہ نہیں پھر دھیرے دھیرے حساب کتاب لگایا اور بولے: ''ٹھیک ہے۔ پانچ تومان دے دو، تین چکر، تین گھنٹی، مگر دیکھنا دھیان سے کہیں ٹکر نہ لگا دینا۔ خراب نہ کردینا''۔

لڑکے نے مان لیا۔ پانچ تومان بابا کے ہاتھ پر رکھا سائیکل پر تیزی سے سوار ہوا۔ ابھی چند ہی میٹر چلا تھا کہ زور سے گھنٹی بجائی۔

میں نے کہا: ''دیکھا بابا! اتنی ہی دیر میں بیس گھنٹی بجادی''۔

بابا جان نے کہا: ''بے مقصد!''

میں نے کہا: ''صرف تین گھنٹی۔ اندھیر نگری نہیں ہے جتنی زیادہ گھنٹی بجائیں گے ہم لوگ ان سے پیسہ لے لیں گے''۔

لڑکا گلی کے سرے پر جب پہنچا ہم لوگوں کی طرف دیکھا، ہاتھ ہلایا اور تیزی سے سڑک پر مڑ گیا۔ میں ڈر گیا، بولا: ''بابا جان سائیکل کہاں لے گیا؟''

بابا جان نے کہا: ''سڑک پر جانے کی بات تو طے نہیں تھی۔ کچھ مت بولو لوٹنے دو دو تومان اور لوں گا''۔

کچھ دیر تو ہم لوگوں نے صبر کیا، دیکھتے رہے مگر کوئی خبر نہ ملی، بچوں میں سے ایک بولا: ''چور لگتا تھا گویا سائیکل لے گیا''۔

بابا جان بولے: ''چور! وہ بھی میری سائیکل... اس کی حلق سے نکال لوں گا۔ چل بیٹا بھاگ اس کا پیچھا کریں''۔ گلی کے آخر تک ایک سانس میں دوڑے سڑک پر نہ اس کالی جیکٹ والے کا کوئی نشان تھا اور نہ ہی بابا کی سائیکل کا۔

میں نے پوچھا: ''بابا اب کیا کریں؟''

"کیا کریں! چلتے ہیں ڈھونڈھتے ہیں کرنا ہی کیا ہے چلو دھکے کھائیں ڈھونڈیں"۔

میں نے چوراہے پر کھڑی پولیس کی طرف اشارہ کیا اور کہا: "کیا مناسب نہیں ہے؟ چلئے پولیس سے کہتے ہیں"۔

بابا نے کہا: "پولیس سے کہوں، ارے چلو خود ہی ڈھونڈتے ہیں۔ یوں ہی نہیں ہے، ظہر تک ہم لوگ سڑک پر گھومتے رہے۔ سائیکل سوار کو دیکھتے رہے۔ کوئی بھی کالی جیکٹ والا گزرتا تو اس کے پیچھے بھاگتے۔ کوئی بھی سائیکل نظر آتی خواہ دُکان پر کھڑی یا پارک میں اسے اچھی طرح دیکھتے مگر کچھ پتہ نہ چلنا تھا نہ چلا۔ آخر کار ہم لوگ ایک سنسان سڑک پر پہنچے۔ ایک سائیکل ایک گھر کے سامنے کھڑی تھی۔ بابا نے سائیکل دیکھی، مڑے مجھے دیکھا اور بولے: "اچھا بیٹا تم گھر جاؤ۔ اس طرح کھڑے ہو کر مجھے نہ دیکھو، جب تک تم گھر پہنچو گے میں سائیکل ڈھونڈھ کر لے آؤں گا"۔

میں نے پوچھا: "کیسے؟"

بولے: "تمھیں اس سے کیا مطلب"۔

میں نے کہا: "آخر مجھے بھی پتہ چلے"۔

بولے: "آخر واخر کچھ نہیں بیٹے، بس آ گئی، یہ لو ٹکٹ اور دوڑ کر پہنچ جاؤ"۔

میں دوڑ کر گیا اور بس میں چڑھ گیا اور کھڑکی کے پاس بیٹھ گیا۔ میں نے دیکھا کہ بابا دھیرے دھیرے اس سائیکل کے پاس گئے جو ایک گھر کے سامنے کھڑی تھی۔ سائیکل پر سوار ہوئے اور سڑک کی طرف چل پڑے۔ ابھی ٹھیک سے بھاگنے نہیں پائے تھے کہ ایک قوی ہیکل آدمی دُکان میں سے باہر نکلا۔ دیکھا کہ سائیکل ندارد۔ بابا کے پیچھے بھاگا، کیریئر پکڑلیا۔ اس کے بعد میں کچھ نہیں دیکھ پایا اس لیے کہ بس ادھر سے گذر چکی تھی۔ میں سیٹ سے اُٹھا، ڈرائیور سے کہا کہ ڈرائیور صاحب!... ڈرائیور صاحب! روک دیجیے، مجھے اُترنا ہے"۔

بولا: "اُترنا ہے تو چڑھے کیوں؟"

میں نے کہا: "غلط بس میں سوار ہو گیا ہوں، خدا کے لیے...!"

بس سے اُترا اور اس پہلی سڑک پر پہنچا۔ بابا نے سائیکل سڑک پر چھوڑ دی اور مجھے دیکھتے ہی میری طرف دوڑ پڑے۔ میں نے پوچھا: "بابا جان کیا ہوا؟"

اسی طرح دوڑ رہے تھے اور بولے: "چلو چلیں ہوا مخالف ہے۔ کسی دوسرے کی سائیکل میں نے غلطی سے اُٹھالی۔ بس آ جاؤ"۔

جب ہم لوگ سانس لینے کے لیے رُکے تو بابا جان عرق عرق ہو رہے تھے۔ بولے: "غروب سے قبل سائیکل ڈھونڈ لاؤں گا۔ تم مطمئن رہو بیٹا۔ تمھارا باپ شلجم نہیں ہے کہ ڈیڑھ بالشت کا بچہ ہاتھ میں لے کر چبا جائے۔ اس حساب سے تو سنیما کا کام تمام۔ تمام کیوں؟ آج سے ہی، اسی وقت سے سائیکل ڈھونڈوں گا اور ہم لوگ سنیما جائیں گے۔ صرف تھوڑی دیر کسی پارک میں بیٹھ جاؤں اور پھر کوئی نئی ترکیب سوچوں"۔

چوتھا حصّہ

بیلچہ اور آخری راہِ حل

بابا کی سائیکل مل گئی تھی۔ لوگ لاکر ہمارے گھر کے پیچھے چھوڑ گئے تھے، یعنی میں کمرے میں بیٹھا ایک کتاب "جزیرۂ اسرار آمیز" پڑھ رہا تھا کہ بابا کی سائیکل کی گھنٹی بجی۔ پہلے میرا ذہن نہیں گیا لیکن بعد میں خیال آیا۔ پھر تو اسپرنگ کی طرح اُچھلتا ہوا سیڑھیوں کی طرف دوڑا۔ بابا تہہ خانے میں تھے۔ ماں کی نظریں دور ہوئیں کہ بس وہ فوراً اپنے اٹھکر بٹھکر میں پھنس جاتے، چاہتے تھے کہ جب تک ماں بازار سے واپس نہیں آتیں، وقت کا فائدہ اُٹھائیں اور جو بنانا چاہتے ہیں اپنی مشہور ایجاد کو مکمل کرلیں۔

میں نے کہا: ''بابا جان! بیٹھے کیا ہیں سائیکل مل گئی؟''

بابا جان اپنا اسی طرح کاٹھ کباڑ پھیلاتے ہوئے بولے: ''فالتو مت بکو۔ اس چور کو میں نے دیکھا کہ ہماری سائیکل کی گھنٹی تک بیچ دی''۔

میں نے کہا: ''نہیں گھنٹی بج رہی تھی''۔

''بابا جان بولے: ''چھوڑو کام کرنے دو۔ ابھی تمھاری ماں چادر لیے حاضر ہوجائیں گی''۔

میں صحن سے ہوتا ہوا گلی میں دوڑتا ہوا پہنچا تو دیکھا کہ بابا جان کی سائیکل صحیح سلامت دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی مجھ ہی کو آنکھ مار رہی ہے۔

بولا: ''گھنٹی بجانی چاہیے تا کہ انھیں یقین آجائے اور وہ تہہ خانے سے اُوپر آئیں کیونکہ وہ اپنی گھنٹی کی آواز پہچانتے ہیں''۔ تین بار گھنٹی بجائی۔ انھیں کچھ خبر نہیں۔ سائیکل اُٹھائی اور لے کر صحن میں آیا کہ اسی اثنا دیکھا کہ ایک بیلچہ اور ایک چھوٹے دستے کی کلہاڑی صحن میں گری اور پھر بابا اپنے ہاتھ میں تین چار موم بتّی لیے اوپر آرہے تھے۔ آیئے دیکھیے اپنی سائیکل۔

بابا نے سائیکل دیکھی۔ کچھ تعجب سے دیکھا پھر گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔ پھر بولے: ''میں نے تم سے ہزار بار کہا کہ چور کتنے ہی بدکار ہوں لیکن ان کی جرأت نہیں کہ تمھارے بابا جان کی سائیکل کو ٹیڑھی آنکھ سے دیکھ سکیں۔ اب بھیڑ بکری کے میمنے کی طرح کھڑے منہ نہ تکو۔ اپنے آگے پیچھے نظر ڈالو۔ سائیکل گلی میں لے جاؤ۔ میں بھی یہ سب لے کر آؤں۔ ہمیں جلدی سے اپنے کام پر چلنا چاہیے۔ آج سنیما کی آخری رات ہے۔ اگر دیر کی تو فلم ہاتھ سے گئی''۔

باوجود اس کے کہ مجھے پتہ تھا کہ بابا جان کا کام ہمیشہ سوچ سمجھ کر ہوتا ہے، پھر بھی مجھے اس بیلچہ اور کلہاڑی کی بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

میں نے پوچھا: ''یہ بیلچہ اور کلہاڑی لے کر سنیما جائیں گے؟''

بابا جان نے کہا: ''تم کتنے احمق ہو بیٹا۔ افسوس کہ اتنی بڑی بڑی روٹیاں تم کو کھلائیں یعنی اتنے ناز سے پالا''۔

بابا جان نے بیلچہ اور کلہاڑی اُٹھائی اور سائیکل کے کیریئر پر رکھا اور بولے: ''تمھارا قصور نہیں ہے اس لیے کہ تم نے فلمیں دیکھی نہیں ہیں کہ کچھ عقل آجاتی۔ تمھارا تو بس یہی کام ہے کہ اسکول گئے یا تو سبق پڑھنے میں وقت برباد ہوا یا بیٹھ کر ماں کی نصیحت سنی''۔

میں نے کہا: ''بیلچہ اور کلہاڑی کا کام کیا ہے۔ اگر سنیما گھر کے افسروں کا سر پھوڑنا ہے تو میں اس میں نہیں ہوں۔ میری گنتی نہ کیجیے گا''۔

بولے: ''فضول باتیں نہ کرو بیٹا''۔

سنیما کے سامنے ہنگامہ تھا۔ میں نے کہا: ''بابا جان چلیں دیر ہوجائے گی''۔

بولے: ''آواز نہ نکلے۔ میرے ذہن کو یکجا رہنے دو۔ سب سے پہلے ہمیں چاہیے کہ کوئی قاعدہ کا ویرانہ ڈھونڈیں''۔

میں نے کہا: ''یعنی مٹّی نرم ہونی چاہیے۔ دو گھنٹہ نقب لگائیں پھر سنیما گھر تک اندر پہنچ جائیں گے۔ اب تم کو معلوم ہوگیا نہ؟''

اپنے دل میں میں نے بابا جان کی اس عقل و ہوشیاری پر شاباشی دی اور جانے انجانے میں مجھے ان پر رشک بھی آیا کہ ''بابا جان آپ کی چالیں تو قیامت ہیں، آخر یہ پلان کس فلم سے چرایا ہے؟''

بولے: ''ہزاروں فلم میں ہے۔ زیادہ تر قیدی جب فرار ہوتے ہیں تو زمین میں سرنگ ہی کھودتے ہیں۔ اب تم کو پتہ چلا کہ مسئلہ کیا ہے بچے!''

بدقسمتی سے کتنا ہی اِدھر اُدھر گھومے مگر کوئی کھنڈر کوئی ویرانہ نہ ملا۔ میں نے کہا: ''اب ہم لوگ کیا کریں بابا جان؟''

بابا جان نے کہا: ''اس طرف دیکھتے ہیں کوئی جان پہچان کا ملتا ہے یا نہیں''۔

میں نے کہا: ''اسی گلی کے پیچھے میرے ایک دوست کا گھر ہے، چلئے وہیں چلتے ہیں''۔

بابا بولے: ''ایک سے کچھ نہیں ہوتا۔ پہلے یہ تو دیکھیں کہ ان کے صحن میں باغیچہ وغیرہ ہے کہ نہیں''۔

میں نے کہا: ''ہے میں نے خود دیکھا ہے''۔

بابا کچھ دور کھڑے رہے اور میں نے دستک دی۔ میرے دوست فریبرز نے دروازہ کھولا۔ ہم لوگوں میں یہ طے تھا کہ میں بابا کا تعارف کراؤں۔ پھر ہم تینوں صحن میں جائیں گے۔ میں دوست کو باتوں میں لگالوں گا اور بابا سرنگ بنانے کے لیے باغیچہ تلاش کریں گے۔ میرے دوست نے کہا: ''جب تک بابا جان تمھارے باغ کی سیر کریں چلو ہم لوگ چھت پر چلیں۔ وہاں سے سنیما کا صحن دکھائی دیتا ہے''۔

میرے دوست کی چھت سے سنیما کے ٹوائلٹ تک جانے کا راستہ تھا۔ میں نے فریبرز سے پوچھا: ''کیا تم نے آج تک کوئی فلم دیکھی؟''

بولا: ''ہاں کیوں نہیں؟ دو دفعہ تو یہیں سے نیچے گئے۔ کوئی پوچھنے والا نہیں ہے! چلنا چاہتے ہو تو چلو ابھی چلیں نیچے''۔

میں نے کہا: ''میں تو ہوں مگر بابا کا کیا ہوگا؟''

اس نے کہا: ''کچھ نہیں، ہم ان سے بھی کہتے ہیں کہ چلیں''۔

وہیں سے میں نے پکارا: ''بابا جان! بابا جان! نقب کی ضرورت نہیں ہے۔ اوپر آیئے یہاں سے سنیما کو راستہ جاتا ہے''۔

بابا جان نے پہلے تو سنا بھی نہیں۔ کدال چلانے میں مشغول تھے۔ جب میں نے دوبارہ کہا تو کمر پر ہاتھ رکھتے ہوئے سر اُٹھایا، مجھے دیکھا اور بولے: ''بکواس بند کرو بچے!

اگر کام اتنا آسان ہوتا تو ساری خلقت اسی چھت سے سنیما کے احاطہ میں پہنچ جاتی''۔

میں نے کہا: ''بابا جان! میں اور فریبرز تو چلے، اگر آپ چاہتے ہیں تو آیئے، خدا حافظ!''

میں ٹوائلٹ کی چھت پر گیا۔ بابا جان نے جب دیکھا کہ یہ تو سچ میں جارہے ہیں تو بولے: ''صبر کرو میں بھی آرہا ہوں۔ اگر جھوٹ ہوا تو میں تمھیں بتا ہی دوں گا۔ تمھیں یاد رہے کہ...''

بابا جان کی باقی باتیں میں نے نہیں سنیں اور دروازے کے اُوپر سے صحن میں کودا اور فریبرز کے پیچھے بھاگا۔

فریبرز مجھے ایک تاریک ہال میں لے گیا۔ جھانک کر دیکھا تو نظر آیا کہ بابا جان ٹوائلٹ کی چھت پر بیٹھ لیے ہوئے ہم لوگوں کو ڈھونڈ رہے ہیں۔ میں چلایا: ''بابا جان! میں یہاں ہوں''۔ اتنے میں دیکھا ایک سنیما ہال کا افسر صحن میں آیا۔ میں تو کنارے ہٹ گیا، لیکن بابا بیچارے بدقسمتی کا شکار ہوگئے۔ جیسے ہی بیٹھ لے کر کودے وہ ان کے سر پر آدھمکا۔ فریبرز نے مجھے اپنی طرف کھینچا اور کہا: ''آؤ کرسی خالی ہے، کھڑے کیوں ہو؟''

کچھ لوگوں نے ڈانٹا: ''بچو چپ رہو، بولو نہیں''۔

یہ سب خواب کی طرح لگ رہا تھا۔ ایک بڑا سا پردہ تھا، جس پر عام آدمیوں کے قد سے لمبے لوگ نظر آرہے تھے۔ فلم میں کچھ پولیس والے گاڑی سے دو نقاب پوشوں کا پیچھا کررہے تھے۔

میں نے کہا: ''فریبرز بابا جان نہیں آئے، خدا کرے کسی مصیبت میں نہ پھنس گئے ہوں''۔

فریبرز نے کہا: ''ڈرو نہیں۔ وہ اوپر سے ڈراتے ہیں کہ کوئی بغیر ٹکٹ کے نہ آئے''۔

مجھے اطمینان ہوا۔فریبرز نے کہا: ''کاش! جینچ ساتھ میں ہوتا۔جینچ کھینچنے کی آواز سن رہے ہو۔ کچھ لوگ چیخے 'روشنی... روشنی' کچھ لوگ لڑ رہے ہیں''۔

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ روشنی، روشنی کیا ہے؟ لیکن بیلچہ ہاتھ میں لیے ہوئے اس چور کو دیکھ کر میں مبہوت ہوگیا تھا،جس کی شکل صورت بابا جان سے...

میں نے کہا: ''فریبرز! یہ چور بابا جان سے مشابہ نہیں ہے؟''

''کیوں نہیں، گویا وہی ہیں۔ہوا مخالف ہوگئی ہے۔چلو چلتے ہیں''۔

ہال کے چراغ روشن ہوگئے۔وہاں اسی پردہ کے سامنے جہاں فلم دکھائی جارہی تھی بابا جان احمق کی طرح کھڑے لوگوں کو دیکھ رہے تھے۔بھیڑ میں جب مجھ کو دیکھا، چہرہ پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ یقیناً وہ دل ہی دل میں کہہ رہے تھے یہ بھی سینما دیکھا بیٹا! اب تو اپنے بابا جان کی عقل اوران کی صلاحیت کے قائل ہوگئے!

○○